قد اور سائے

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

قداورسائے

ڈاکٹرمحمدالیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قد اور سائے

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

○ نام کتاب	:	قداورسائے
○ مصنف	:	ڈاکٹرمحمدالیاس الاعظمی
○ ناشر	:	مصنف
○ قیمت	:	۱۸۱؍روپئے
○ صفحات	:	۲۹۶
○ مطبع	:	اصیلہ پرنٹرس، دہلی
○ کمپوزنگ	:	عفت جہاں
○ سن اشاعت	:	نومبر۲۰۱۹ء

’’یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
شائع شدہ مواد سے اردوکونسل کامتفق ہوناضروری نہیں ہے۔‘‘

ملنے کے پتے

۱۔مکتبہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ۲۷۶۰۰۱(یوپی)
۲۔مکتبہ جامعہ لمیٹڈاردوبازارجامع مسجد دہلی۔۶

QAD AUR SAYE
Dr Muhammad Iyas Azmi
Page 296 Rs: 181/-
azmi408@gmail.com
Mob : +919838573645

ISBN:

○○

گرامی قدر

حکیم وسیم احمد اعظمی

(سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سی، آر، یو، ایم، نئی دہلی)

کی نذر

جن کا دل مثل آئینہ صاف وشفاف

اور

جن کی محبت شک وشبہ سے بالاتر

○○○

ترتیب

• حصہ اول : مضامین

• حصہ دوم : تقدیم،تقریظ،دیباچے

دیباچہ

''قداور سائے'' میری مختلف النوع تحریروں کا پانچواں مجموعہ ہے۔ دو حصوں پر مشتمل اس مجموعہ کے پہلے حصہ میں علمی و ادبی شخصیات پر مضامین و مقالات شامل ہیں جبکہ دوسرے حصہ میں ان تقدیم وتقریظ اور دیباچوں کو یکجا کیا گیا ہے جو ملک و بیرون ملک کے ممتاز اہل علم و دانش اور ادباء وشعراء کی کتابوں پر وقتاً فوقتاً لکھے گئے تھے۔ ان کی جمع وتدوین واشاعت کا بنیادی مقصد اپنی منتشر تحریروں کو یکجا کرنا اور اپنے قارئین کو چند اہم شخصیات اور چند اچھی کتابوں سے متعارف کرانا ہے۔

پہلے حصہ میں کل ۱۵ر شخصیات پر ۱۶ر علمی، ادبی، تحقیقی اور تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ اسی حصہ میں چند ارباب کمال اور اصحاب شعروادب کی ''وفیات'' بھی شامل ہیں۔ حصہ مضامین و مقالات میں بعض شخصیات پر مستقل مطالعات شامل ہیں، جبکہ بعض شخصیات کا محض موضوعی یعنی کسی ایک پہلو سے ان کی شخصیت یا ان کے افکار کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے ذکر سے ہوا ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ضلع اعظم گڑھ کے ویسلی اسکول میں ۱۱ر جولائی ۱۸۷۴ء کو کوکب الہند سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] تشریف لائے تھے اور روسائے اعظم گڑھ کے ایک جلسے سے خطاب کیا تھا۔ برسوں کی تلاش وتفحص سے وہ خطبہ جو سرسید نے باشندگان اعظم گڑھ کے سامنے دیا تھا وہ ہاتھ آ گیا۔ چنانچہ اسے بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ یہ خطبہ کئی لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے سرسید کے نظریہ تعلیم کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ یہی نہیں اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرسید نے مشرقی اضلاع پر کس قدر محنت کی تھی اور انہیں کس قسم کے معاملات ومسائل کا سامنا رہا۔

علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہؒ وکیل [م: ۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء] کے عہد میں مولوی نذیر احمد [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] اور سر سید احمد خاں نے اعظم گڑھ میں تعلیمی بیداری کا آغاز کیا۔ مولوی نذیر احمد ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر تعینات رہے۔ یہاں انھوں نے کئی علمی و ادبی کارنامے انجام دئے۔ ان کا مشہور و مقبول ناول ''توبۃ النصوح'' یہیں اعظم گڑھ کی فضاؤں میں سپرد قلم ہوا۔ انہیں نے سر سید کو اعظم گڑھ بلایا، جلسہ کا انتظام کیا اور ایک بڑی رقم کالج کی نذر کی۔ شیخ حبیب اللہ وکیل اور ان کے برادر نسبتی شیخ محمد سلیم پھریہانے بھی اس موقع پر ایم اے او کالج علی گڑھ کا مالی تعاون کیا۔

دوسرے مضمون میں اعظم گڑھ کے ممتاز اردو ادیب، شاعر اور نقاد مرزا احسان احمد [۱۸۹۵-۱۹۷۱ء] کے نام معاصر ادیبوں کے غیر مدون خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے جو انھوں نے اپنی ادبی سرگذشت ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' میں نقل کئے ہیں۔ یہ خود نوشت ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت سے ابتک ان مکاتیب کے ذکر اور مطالعہ و تجزیہ سے ہمارا ادبی منظر نامہ خالی ہے۔ حالانکہ ان مکتوب نگاروں میں اردو کے چند اساطین شعر و ادب شامل ہیں۔ ان میں تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ، رشید احمد صدیقی مولانا تاجور نجیب آبادی، منشی دیا نرائن نگم، ایم اسلم، اشرف صبوحی، سر تیج بہادر سپرو، جلیل قدوائی، پورن سنگھ ہنر اور ڈاکٹر ابن فرید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ گو مرزا احسان احمد کو وہ شہرت و مقبولیت نہیں ملی جس کے وہ حقدار تھے، تاہم تاریخ ادب اردو میں یہ بات سنہرے حرفوں میں لکھی جاتی رہے گی کہ جگر و اصغر کے اولین شعری مجموعے (''داغ جگر'' اور ''نشاط روح'') انہیں مرزا احسان احمد نے مرتب کر کے شائع کئے اور پہلی بار حلقہ ادب سے ان کو متعارف اور ان کے کلام سے روشناس کرایا۔

استاذ مرحوم مولانا مجیب اللہ ندویؒ بانی مدیر ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ پر اس مجموعہ میں دو مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون تاثراتی ہے اور دوسرے میں ان کی فقہی کاوشوں کا ذکر مولانا سید محمد متین ہاشمی مرحوم سابق ڈائرکٹر دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کے حوالہ سے ہے۔ ایک اور تاثراتی مضمون مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] سابق ناظم دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے اپنی بیس سالہ رفاقت اور اس کے نشیب و فراز کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس میں ان کی

یادیں اور راقم پر ان کے علمی و ادبی احسانات کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس حوالہ سے ایک بات قابل ہے کہ یہ ہیچمدان ان یادوں کے قلم بند کرنے میں بار بار اشک بار رہا ہے۔

ایک اور مضمون میں جون پور کے ایک ممتاز بزرگ مولانا شاہ عبدالحلیم جونپوریؒ کی مذہبی خدمات اور ان سے اپنی ایک ملاقات کا احوال ہے۔ انجمن ترقی اردو کے سابق سکریٹری جنرل ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی، مولانا حکیم عبدالمجید اصلاحی اور ڈاکٹر جمیل جالبی پر وفیاتی مضامین شامل ہیں۔ ان اہل علم اور ارباب شعر و ادب سے میرے ذاتی مراسم و تعلقات تھے۔ مولانا حکیم عبدالمجید اصلاحی، حکیم محمد ایوب اور پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی نے علم و ادب کی گوناگوں خدمات انجام دیں، ان کی شخصیت اور خدمات کا ذکر پہلی بار کیا جا رہا ہے۔ غرض کتاب کا پہلا حصہ تذکرہ و سوانح، تحقیق و تنقید، شعر و ادب اور طب و صحت کی چند ممتاز اور نامور شخصیات کی خدمات اور ان کے تعارف و تجزیہ پر مشتمل ہے۔ ان شخصیات کے حوالہ سے متعدد نئی اور قابل ذکر معلومات ان مضامین و مقالات میں آ گئی ہیں۔ اس حصہ میں کئی ایسی اہم شخصیات بھی شامل ہیں جن کی کاوشوں کا ذکر پہلی بار کیا جا رہا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ ''قد اور سائے'' ہمارے ادبی سرمایہ میں ایک قیمتی اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

دوسرے حصہ میں ملک و بیرون ملک کے بعض اہل قلم کی کتابوں پر اس ناچیز، کم مایہ کے قلم سے جو تقدیم، تقریظ اور دیباچے لکھے گئے انہیں یکجا کیا گیا ہے۔ اس حصہ میں میں نے اہمیت کے پیش نظر اپنی بعض مرتبہ کتب کے دیباچے بھی شامل کر دئے ہیں۔ دو تبصراتی مضامین بھی شامل ہیں۔ اس طرح اس میں مختلف علمی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، شعری اور سیرت نبوی پر لکھی جانے والی ۳۱ کتابوں کے دیباچے شامل ہیں۔ یہ دیباچے مختلف نوعیّتوں کے ہیں۔ مختصر بھی ہیں اور مفصل بھی۔ تعارفی بھی ہیں اور تجزیاتی بھی۔ ان میں نئے اہل قلم بھی شامل ہیں اور کہنہ مشق ادیب و شاعر اور نقاد بھی۔ غرض اس حصہ میں بھی بڑا تنوع اور طرفگی ہے۔ اور کم از کم ان کے مفید اور معلوماتی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

موضوعات کے اعتبار سے بھی ان میں تنوع اور طرفگی پائی جاتی ہے۔ علم و فن اور شعر و ادب کے مستقل ذکر کے ساتھ بعض جزوی اور فروعی تفصیلات، نیز سوانحی حالات و واقعات بھی

اس میں آ گئے ہیں ۔اعظم گڑھ کے کئی اہل علم اور ادباء وشعراء کے متعلق شامل مضامین ومقالات سے اعظم گڑھ کے ماضی وحال کے ادبی منظرنامے کی بھی ایک جھلک سامنے آتی جاتی ہے۔اسی طرح وفیاتی مضامین میں شخصیات کے بنیادی خدوخال اور کوائف زندگی کے ساتھ راقم سے ربط و تعلق کی کسی قدر رداستان بھی نوک قلم پر آ گئی ہے۔اس میں مرحومین کے بعض نادر خطوط بھی نقل کئے گئے ہیں۔غرض اس مجموعہ مقالات کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی سطر سطر سے معلومات ملیں گی۔جس میں معمولی معلومات کے ساتھ بعض غیر معمولی باتیں بھی کتاب کا حصہ ہوگئی ہیں۔

دونوں حصوں پر بیک نظر ڈالی جائے تو یہ مجموعہ مضامین ومقالات دین ومذہب،علم وتحقیق اور شعر وادب کا ایک خوب صورت گلدستہ معلوم ہوگا۔اس گلدستے کی اشاعت میں راقم کو کسی قدر تردد تھا،مگر جب ان مضامین کا یکجا مطالعہ کیا اور ایک لڑی میں پروکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان متنوع تحریروں کی افادیت کسی نوع سے کم نہیں۔بعض علم دوست احباب نے بھی اس کی تائید کی۔اس کتاب کی جمع وترتیب واشاعت ہمارے ایک قدر رداں اور فاضل دوست جناب حکیم وسیم احمد اعظمی صاحب سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سی،آر،یو،ایم،نئی دہلی کی توجہ اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے۔میں ان کا خاص طور پر ممنون اور شکر گذار ہوں۔

''قد اور سائے'' میرے علمی وادبی،تنقیدی اور وفیاتی مضامین کا چوتھا مجموعہ ہے۔اس سے قبل تین مجموعے''عظمت کے نشاں''[مطبوعہ:۲۰۰۵ء]،''مطالعات ومشاہدات''[مطبوعہ:۲۰۰۹ء]اور''عکس واثر''[مطبوعہ۲۰۱۴ء]شائع ہو چکے ہیں اور اللہ تعالی نے انہیں بڑی مقبولیت بخشی۔رسائل وجرائد میں بڑے حوصلہ افزاء تبصرے نکلے۔پہلے مجموعہ''عظمت کے نشاں'' کو اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو نے اپنے انعام سے نوازا۔اس کے ابتک دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اب بھی اس کے قدر رداں نکل آتے ہیں۔اسی طرح دوسرے مجموعہ مضامین''مطالعات و مشاہدات'' کا پہلا ایڈیشن بھی عرصہ سے ختم ہے۔''عکس واثر'' کا پہلا ایڈیشن تو محض چند ماہ میں نکل گیا،مگر بار بار کے تقاضے کے باوجود اس کی دوبارہ اشاعت کی ابتک کوئی صورت نہ بن سکی۔ امید ہے اس نئے مجموعہ مضامین''قد اور سائے'' کی بھی گذشتہ مجموعوں کی طرح پذیرائی ہوگی۔ان شاءاللہ۔

میری علمی اور تصنیفی زندگی کا آغاز فن تجوید کی ایک نصابی کتاب ''اسہل التجوید''[طبع اول: ۱۹۸۶ء] سے ہوا تھا۔ پھر اس سے متعلق دو اور کتابیں ''تذکرۃ القراء'' اور ''قرائے عظام اور ان کی علمی و دینی خدمات'' شائع ہوئیں۔ حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ سے عقیدت کی بنا پر ''کتابیات مجیب'' تیار کی۔ پھر ان کے وفیاتی مضامین کا مجموعہ ''کاروان رفتگاں'' اور سفرناموں کا مجموعہ ''اسفار مجیب'' بھی مرتب کیا، جسے مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ نے شائع کیا۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد حضرۃ الاستاذ مرحوم کی زندگی ہی میں مرتب کر کے شائع کرا چکا تھا۔ میری یہ کوششیں اور کاوشیں علامہ شبلی سے متعلق میری تصنیفات وتحقیقات کے غلغلے میں پس پشت چلی گئیں۔ حالانکہ یہ مجھے کم عزیز نہیں ہیں۔ امید ہے میری ان کوششوں اور کاوشوں سے صرف نظر نہیں کیا جائے گا اور ان سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

''قد اور سائے'' ارباب ذوق کے سامنے میری تینتالیسویں پیش کش ہے۔ اس موقع پر میں اپنے مالک حقیقی اللہ رب العزت کے سامنے سربسجود، سراپا سپاس اور نہایت شکر گذار ہوں کہ اس نے میری تمام تر کم علمی، کم مائیگی اور بے بضاعتی کے باوجود اس علمی وادبی کام کی توفیق اور سعادت بخشی۔

اس کتاب کا انتساب خطہ اعظم گڑھ کے ایک ممتاز فرزند جناب حکیم وسیم احمد اعظمی صاحب کے نام ہے جو طب وصحت کے میدان میں یدطولی تو رکھتے ہی ہیں، شعروادب کے بھی بڑے اداشناس ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور متعدد گراں مایہ طبی کتابوں کے مصنف ہیں اور اب بھی تصنیف وتالیف میں سرگرم عمل ہیں اور کئی اہم کتابیں زیر تصنیف وتکمیل ہیں۔ جناب حکیم وسیم احمد اعظمی صاحب میرے علمی وادبی کاموں بالخصوص سلسلۂ ''شبلی شناسی'' کے مداح بھی ہیں اور ناقد بھی۔ ایسے صاحب علم ونظر کے نام اس کتاب کا انتساب کرتے ہوئے دل خوشی و مسرت کے جذبات سے سرشار ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی بے لوث محبت اور شفقت کو قائم ودائم رکھے۔

جن نفوس قدسیہ کی دعائیں میرے علمی سفر میں چراغ راہ رہی ہیں اور جن کی بدولت تردد اور تفکرات دنیا سے بےخبر اور بے نیاز رہتا تھا، انہوں نے اب کسی اور دیس بستیاں بسالی ہیں۔ البتہ

گرامی قدر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور محسن مکرم ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی کی شفیق ذات گرامی کا سایہ شفقت قائم ہے۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ان کی شفقتوں کا سلسلہ دراز کرے اور تادیر قائم رکھے۔

اس خوشی کے موقع پر میں اپنے ان تمام احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے کسی نوع سے میرا تعاون کیا۔ خاص طور سے برادر مکرم ڈاکٹر عطا خورشید اسسٹنٹ لائبریرین مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، ڈاکٹر مسعود حسن صاحب خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ اور جاوید میاں صاحب مالک اصیلہ پرنٹرس دہلی کی بے پناہ محبتوں کو فراموش کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی ان احباب کو ان کے اخلاص اور فراواں جذبہ محبت کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور انہیں دین و دنیا میں سرخ رو کرے۔ کتاب کا بڑا حصہ میری بیٹی عفت جہاں نے کمپوز کیا ہے۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے ڈیڑھ سو سال قدیم بوسیدہ صفحات اور کانٹے کے ٹیڑھے میڑھے حروف اسی نے محنت اور دیدہ ریزی سے لکھے ہیں۔ میں اس کے روشن مستقبل کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہو رہی ہے اس کے لئے میں کونسل کے ارباب حل وعقد کا بھی دل کی گہرائیوں سے شکر گذار ہوں۔

محمد الیاس الاعظمی

۲۰ر نومبر ۲۰۱۹ء ادبی دائرہ اعظم گڑھ

حصہ اول : مضامین

[۱]

سرسید احمد خاں کا مسلمانانِ اعظم گڑھ سے خطاب

(سرسید کی ایک نادر تقریر)

سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] نے ۱۸۷۵ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام سے پہلے ملک کے مختلف مقامات کا دورہ کیا اور اپنی تعلیمی تحریک کے اغراض و مقاصد واضح کئے اور قوم سے تعاون کی درخواست کی۔ اس سلسلہ میں اتر پردیش کے مشرقی اضلاع کا بھی انہوں نے دروہ کیا تھا۔ گورکھپور کے بعد وہ اعظم گڑھ پہنچے اور ۱۱ر جولائی ۱۸۷۴ء کو مشن اسکول (ویسلی انٹر کالج شہر اعظم گڑھ) میں باشندگان اعظم گڑھ کے ایک منتخب جلسہ سے خطاب کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] اس وقت اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر بندوبست تھے، انہیں نے اس جلسہ کا انتظام کیا تھا۔ جلسے کی صدارت راجہ سلامت خاں نے کی۔ ڈپٹی نذیر احمد نائب صدر تھے۔ جلسہ کا آغاز صدر کے تمہیدی کلمات سے ہوا۔ بعد ازاں نائب صدر ڈپٹی نذیر احمد نے جلسہ کے مقاصد کی مختصراً وضاحت کی اور پھر کوکب الہند خان بہادر سرسید احمد خاں کو خطاب کے لئے مدعو کیا۔

اس جلسہ میں اعظم گڑھ کے باشندگان جس میں رؤسا اور شرفاء شریک ہوئے۔ اس میں ان اشخاص کا جنہوں نے چندہ دیا تھا ان کے نام محفوظ رہ گئے ہیں۔ ان کے اسمائے گرامی یہاں درج کئے جاتے ہیں تا کہ ہمارے عہد کے باشندگان اعظم گڑھ کو یہ معلوم ہو سکے کہ ان کے کن آباء واجداد نے تحریک علی گڑھ کے بالکل ابتدائی دور میں حصہ لیا تھا اور سرسید کی آواز پر لبیک کہا تھا۔ ان کے نام اور چندہ کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ منشی محمد اکرام صاحب رئیس محمد آباد وکیل سرکار (۵۰۰ر روپیہ) ۲۔ مولوی نذیر احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر (۴۰۰ر روپیہ) ۳۔ منشی محمد خلیل صاحب تحصیلدار نظام آباد (۲۰۰ر

روپیہ)۴۔شیخ توجہ حسین صاحب وکیل (۱۲۵/روپیہ)۵۔شیخ حبیب اللہ صاحب ۔ واسطے امور دینی کے(۱۲۵/روپیہ)۶۔مولوی سید محمد صاحب وکیل ۔ برائے خرید جائداد(۱۰۰/روپیہ)۷۔ حاجی محمد ہدایت اللہ صاحب (۱۰۰/روپیہ)۸۔شاہ محمد اسداللہ صاحب وکیل (۵۰/روپیہ)۹۔ راجہ سلامت خاں صاحب (۵۰/ روپیہ)۱۰۔مولوی محمد امداد اللہ خاں صاحب انسپکٹر(۵۰/ روپیہ)۱۱۔منشی غلام حسین خاں صاحب پیش کار کلکٹری (۲۵/روپیہ)۱۲۔منشی محمد رمضان خاں صاحب (۲۵/روپیہ) ۱۳۔بابو لال بہادر خاں صاحب رئیس سدھاری (۲۵/روپیہ)۱۴۔منشی عبدالرحمٰن خاں صاحب محافظ دفتر بندوبست (۲۰/روپیہ)۱۵۔منشی چھیدے لال صاحب سررشتہ دار کلکٹری (۲۰/روپیہ)۱۶۔منشی الٰہی بخش صاحب محافظ دفتر (۲۵/روپیہ)۱۷۔منشی طالع یار خاں صاحب (۱۰/روپیہ)۱۸۔منشی رام پرشاد صاحب سررشتہ دار فوجداری (۱۰/روپیہ)۱۹۔شیخ محمد سلیم صاحب(۱۰/روپیہ)۲۰۔شیخ باب اللہ صاحب انگریزی نویس(۵/روپیہ)۲۱۔منشی علی حسین خاں صاحب گوداور چنگی (۵/روپیہ)۲۲۔محمد شیر خاں صاحب (۵/روپیہ)۲۳۔منشی گوہر علی صاحب محرر رجسٹری (۵/روپیہ)۲۴۔منشی حفیظ اللہ صاحب وکیل (۵/روپیہ)

اس فہرست میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ اور ماموں شیخ محمد سلیم پھریہا کا نام بھی شامل ہے۔ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس جلسہ میں شریک ہونے اور چندہ دینے والوں میں مسلمانوں کے ساتھ اعظم گڑھ کے بعض ہندو بزرگوں کے نام بھی درج ہیں۔

سرسید احمد خاں کی یہ تقریر بے حد اہمیت کی حامل ہے۔اس میں انہوں نے تحریک علی گڑھ اور مدرسۃ العلوم کے قیام کے اغراض ،اسباب اور مقاصد کی تفصیل کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ معترضین اور مخالفین کے اعتراضات کے جوابات دئے ہیں اوران کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔سرسید کے خطبات بڑے پراثر ہوتے تھے ،انہیں مؤثر تقریروں میں سے ایک یہ تقریر بھی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ سرسید نے قوم کے سامنے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ قومی ہمدردی کے وہ تمام جلوے جو سرسید کی ذات میں مستور تھے وہ سب اس میں آ گئے ہیں:

تقریر سرسید احمد خاں

صدر انجمن ونائب صدر انجمن وتمام رئیسان اعظم گڑھ!

اول میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ مسافر کی درخواست کو قبول فرمایا اور اس وقت اپنے اوقات گراں بہا خارج کر کے یہاں جمع ہوئے لیکن میں اس بات کی تمنا رکھتا ہوں کہ آپ سب صاحب اس بات پر غور کریں کہ میں نے آپ کو یہ تکلیف کیوں دی اور یہاں آپ سب صاحبوں کا جمع ہونا کس غرض سے ہے۔ اگر یہ جمع ہونا اور یہاں تکلیف کرنا اس لئے ہے کہ کچھ اپنی قوم کی بھلائی اور ہمدردی اور خیر خواہی کے واسطے کوشش کریں تو شاید اس تکلیف سے زیادہ کوئی چیز راحت بخش نہ ہوگی، نہ صرف ہمارے لئے بلکہ آئندہ نسلوں اور نسلوں کی نسلوں کے واسطے۔

اس ضلع میں اکثر مسلمان رئیس ہیں اور ایک نہایت ہی خوش کرنے والی بات یہ ہے کہ خاص اس ضلع میں اور اس کے قریب گورکھپور و غازی پور جون پور میں اکثر ذی علم اور نامی آدمی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ یہ اضلاع معدن علم وفضل تھے۔ یہاں کثرت سے ایسے گھرانے تھے جن کی شہرت تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھی، ہر ایک خاندان میں ایک سے ایک اولوالعزم تھا اور ہر ایک کو اپنے علم وفضل کا دعوی ہوتا تھا، جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کے خوبصورت چہروں سے یہ امید ہوتی تھی کہ یہ اپنے باپوں سے بھی زیادہ نام آور ہوں گے، لیکن آج وہی ضلع اعظم گڑھ اور وہی ضلع گورکھپور اور غازی پور و جون پور ہے ہر ایک خاندان کا شخص اور ہر ایک متنفس اپنے باپ دادا کی لیاقت اور عزت اور شہرت کا خیال کرے اور پھر خود اپنی حالت پر غور کرے کہ کیسی جہالت اور تاریکی میں مبتلا ہے، لیکن اس قدر خیال کر لی بس نہیں ہے بلکہ اتنا اور بھی ان کو سوچنا چاہئے کہ اس وقت جو لوگ اچھے خاندانوں کے ہیں اور جن میں اس وقت کچھ علم دکھلائی دیتا ہے ان کو کچھ نہ کچھ ذریعہ اس علم کے حاصل کرنے کا ملا، ان کے باپ دادا اور مورث اکثر صاحب علم تھے، کچھ ایسے بھی تھے جو گو خود علم نہ رکھتے تھے مگر علم کی قدر کرتے تھے اور اپنی اولاد کو تعلیم دینے کی آرزو رکھتے تھے۔ بڈھے اور قریب المرگ جو اپنی نیکی اور علم سے ممتاز

تھے ان کے اخیر وقت کی نصیحتوں اور ترغیبوں کا لوگوں میں کچھ اثر تھا، مگر باوجود ان سب ذریعوں کے ان خاندانوں کی تعلیم کا ایسا ابتر حال ہو گیا جیسا آپ دیکھتے ہیں۔ اب غور کرو آئندہ زمانہ کا اور سوچو کہ جو ذریعہ تمہاری تعلیم کا تمہارے مورث چھوڑ مرے تھے وہ تمہاری اولاد کے لئے بھی باقی نہیں ہے جو لوگ اچھے گھرانوں کے ہیں اور کسی قدر مقدور اور دولت بھی رکھتے ہیں وہ مجھ کو بتلائیں کہ کیا طریقہ ہے ان کے ہاتھ میں اپنی اولاد کو نیک اخلاق اور عمدہ تعلیم دینے کا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی شخص کے پاس اب ایسا ذریعہ نہیں ہے۔ بعض جو فضل الٰہی سے دولت مند ہیں وہ شاید یہ خیال کرتے ہوں گے کہ ہم ذی مقدور ہیں، کسی ملاں یا مولوی کو نوکر رکھ کر اپنی اولاد کی تعلیم کر لیں گے، لیکن جس نے اولاد کی تعلیم کو نہیں معاف کیجئے اپنی قوم کی تعلیم کی کچھ بھی قدر جانی ہوگی وہ کبھی اس رائے کو تسلیم نہ کرے گا۔ اولاد کی تعلیم و تربیت ہرگز دولت کے زور سے نہیں ہو سکتی۔ ایک بڑے سے بڑے راجہ اور بڑے سے بڑے نواب کو فرض کر لو، مگر یہ ہرگز ممکن نہیں۔ نہ وہ اس طرح سے اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کر سکے، ہم پوچھتے ہیں کہ اس وقت ایک شخص نہایت ذی علم بھی ہے اور تجربہ بھی اس کا اچھا ہے، خیال بھی اس کے اچھے ہیں، مثلاً میں اس وقت صاف کہتا ہوں کہ مولوی نذیر احمد صاحب جو تمام علوم سے واقف ہیں اولاد کی تعلیم اور اس کی پرورش کے طریقہ کو بھی خوب جانتے ہیں۔ اولاد کی عمدہ تربیت کی قدر بھی ان کو خوب معلوم ہے اور انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں جس کی خدا عمر دراز کرے کافی طرز سے توجہ کی بھی ہے لیکن اولاد کی تعلیم صرف کتابیں پڑھا دینے سے تو نہیں ہوتی اور اب مولوی صاحب ہی مجھ کو بتلا دیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا اس کے سوا وہ اور کیا کر سکتے ہیں اور کہاں تک وہ نفروں کی صحبت سے اپنے گھر پر اپنے لڑکے کو بچا سکتے ہیں۔ آخر وہ کہیں باہر کو جاوے گا، اس وقت ضرور ایک خدمت گار اس کے ساتھ ہوگا، مگر کیا وہ ایسا شخص ہوگا جس کے الفاظ اور عادتیں لڑکوں کی طبیعت میں نیک اخلاق پیدا کر سکیں۔ آخر

لڑکوں کو تفریح طبع بھی ضروری ہے، جس میں پھر ان کو ماماؤں اور سائیسوں اور خدمت گاروں اور ان کے لونڈوں سے کام پڑتا ہوگا۔ بولنا چالنا بات چیت جو کچھ ہے سب انہیں نامہذب نفروں سے ہے، لڑکے جب بازاروں میں گذرتے ہیں اور وہاں دیکھتے ہیں کہ کمین قوم کے لڑکوں میں کوئی جھگڑا ہو رہا ہے تو اچھے اچھے خاندانوں کے لڑکے بھی اس کا تماشہ دیکھنے کو ٹھہر جاتے ہیں اور تماشہ کیا ہوتا ہے سوائے گالیوں اور وحشیانہ بدالفاظ کے جس کو لڑکے بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ بتلایئے کہ کیا تعبیر ہے ان سب خرابیوں سے اپنے بچوں کے بچانے کی۔ علم نہایت عمدہ چیز ہے اور انسان کے لئے بڑی ترقیوں کا ذریعہ ہے، لیکن اس کی خوبی اس وقت ہے جبکہ اس کے ساتھ تربیت بھی عمدہ ہو۔ اگر تربیت نہیں ہے تو علم سے کچھ فائدہ نہیں۔ اگر تربیت ہے اور علم نہیں تو بھی آدمی اپنی ترقی نہیں کر سکتا۔ ان دونوں چیزوں کا ایسا ساتھ ہے کہ اگر ایک نہیں تو دوسری بھی نہیں کے برابر ہوتی ہے۔

علاوہ اس کے جس پر سب اہل ہند نہایت کم غور کرتے ہیں، وہ ایک اور چیز ہے اور تعجب نہیں کہ اس کے بیان کرتے وقت مجھ کو دیوانہ بتلاویں اور وہ لڑکوں کی تندرستی اور صحت جسمانی ہے۔ قوا کو طاقت ور ان کے دماغ قوی رکھنا، خراب خیالوں کو اس سے نکالنا، ان کی طبیعت کو تر و تازہ رکھنا، یہی اصل جڑ ہے جس سے آئندہ عمر میں انسان کا دل و دماغ نہایت قوی رہتا ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ترقی اور باریک سے باریک خیال جو انسان پیدا کرتا ہے، وہ سب اس ابتدائی احتیاط کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اب بتلاؤ کہ کس کے لڑکے اس طریقہ سے پرورش پاتے ہیں۔ ان کو بجز اپنے گھر میں پڑے رہنے کے اور کچھ کام نہیں ہوتا۔ ورزش کا عمدہ طریقہ ان کے لئے کوئی نہیں ہے۔ تفریح طبع کا کوئی عمدہ موقع ان کو نہیں ملتا جس سے بدن تندرست رہے، عقل بڑھے اور بالفرض اگر کسی خاص دولت مند نے اسباب میں کوشش بھی کی کہ وہ اپنے لڑکے کو اپنے گھر پر نہایت احتیاط سے تیار کرے اور اس

کی تربیت اور صحت جسمانی کے لئے ہر قسم کا اہتمام کرے۔ اگرچہ یہ بالکل ممکن نہیں ہے لیکن ہمارا پھر یہ سوال ہے کہ کسی خاص شخص کی ایسی کوشش سے ہماری قوم کو کیا فائدہ ملے گا۔ ہم نہایت خوش ہوں اگر ہماری کل قوم اسی طرح اپنی اولاد کو تعلیم کر سکے، لیکن یہ امکان سے باہر ہے۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ ہماری قوم کی قوم ذلت سے نکلے اور پھر اپنی پہلی سی ناموری حاصل کرے اور یہ نہیں ہوسکتا جب تک کل قوم کی عام تعلیم و تربیت درست نہ ہو اور یوں ایک دو شخص فرض کرلو کہ ان کی تعلیم بھی اچھی ہو اور تربیت بھی اچھی ہو مگر ان سے قومی عزت نہیں ہوسکتی بلکہ جب تک عام قوم کی تعلیم و تربیت درست نہ ہوگی ان ایک دو آدمیوں کو بھی نہایت غیرت اور شرم کا مقام ہوگا جب کبھی کوئی ذکر آوے گا تو ان کی نسبت بھی یہی کہا جاوے گا کہ یہ بھی اسی قوم کے ہیں، تو حقیقت میں انہوں نے بھی باوجود اپنی عمدہ تعلیم و تربیت کے کوئی قومی عزت حاصل نہیں کی اور نہ کوئی اس طرح کی عزت حاصل کرسکتا ہے جب تک کہ تمام قوم درجہ بدرجہ ترقی نہ کرے۔

ہم پوچھتے ہیں کہ ہماری قوم میں اب کوئی ایسا ذریعہ باقی ہے جس سے ہم امید کرسکیں کہ ہماری قوم تعلیم وتربیت میں ترقی کرسکے گی۔ جواب یہ ہوگا کہ نہیں تمام ہندوستان میں جس قدر مدارس مسلمانوں کے باقی تھے اور بعض بزرگوں کے نام سے ان کا کام چلتا تھا، جتنی خانقاہیں ان متبرک انسانوں کے نام سے قایم تھیں، جن کے نام کا اب تک بھی لوگ ادب کرتے ہیں، وہ اب سب برباد ہوگئیں، ایک باقی نہیں۔ شاہ عبدالعزیز جو دہلی کے ایک نامی بڑے نامی علماء میں سے تھے، ان کے خاندان میں اب تو کوئی بھی باقی نہیں ہے، لیکن جب باقی تھے تو ان میں بھی سوائے ایک دو کے اور کوئی پڑھا لکھا نہ تھا۔ میں نے اپنی آنکھ سے ان کے کتب خانہ کو دیکھا ہے جو بالکل مٹی کا ایک ڈھیر تھا۔ میں نے ماماؤں اور چھوکروں کو ان کتابوں کو بیچتے ہوئے دیکھا ہے اور ان کے خاندان میں کوئی اتنا نہ ہوا جو کتابوں کو بھی بچا سکتا، یہ تمام ان کی عمدہ کمائی اس طرح پر برباد ہوئی۔

حضرت شاہ غلام علی صاحب کی خانقاہ دہلی میں ایک عمدہ اور قابل یادگار خانقاہ تھی۔ وہ تمام ہندوستان کی سجدہ گاہ بلکہ ملائک کی بھی سجدہ گاہ تھی، مگر اب دیکھو کہ بالکل بے چراغ ہے۔ تمام خانقاہ میں ایک متنفس بھی پڑھنے یا پڑھانے والا اب نہیں ہے۔ غرض تمام ہندوستان میں جو بڑے بڑے ذریعے مسلمانوں کی تعلیم کے خیال کئے جاتے تھے ان کا اب یہ حال ہے۔

اس کے علاوہ بہت بڑا ذریعہ تعلیم کا گورنمنٹ کے کالج ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کی تعلیم پر بہت توجہ کی اور حقیقت میں جس قدر ہماری تعلیم پر ہندوستان میں گورنمنٹ نے توجہ کی شاید دنیا میں کوئی ایسی سلطنت نہیں ہے جس نے اپنی رعایا کی تعلیم کا ایسا اہتمام کیا ہو، لیکن میرا سوال یہ ہے کہ وہ سلسلہ اور وہ طریقہ تعلیم ہم مسلمانوں کی حالت اور ان کی تمام ضرورتوں کے لئے بھی کافی ہے یا نہیں؟ اگر ہے بھی تو میں پوچھتا ہوں کہ تمام ہندوستان کے کالجوں میں کے مسلمان پڑھتے ہیں۔ اگر ان کالجوں میں ان کی تعداد نہایت قلیل ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی اغراض کے لئے وہ کالج کافی نہیں ہیں اور میں اس تعداد کے دریافت کرنے کے واسطے شمال ومغربی اضلاع پر بس نہ کروں گا، بمبئی کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ وہاں کے کالجوں میں ۱۸ر طالب علموں میں ایک طالب علم مسلمان ہے۔ اور اسکولوں میں ۱۳۱ر میں سے ایک ہے۔ اب خیال کیجئے گا کہ یہ ہونا نہ ہونے کے برابر ہے۔ جب سو میں تین مسلمان ہوں اور وہ بھی غالباً کسی رئیس اور نامی خاندان کے نہیں تو نہایت صاف دلیل ہے کہ ہماری تمام اغراض کے لئے گورنمنٹ کے اسکول و کالج کافی نہیں ہیں۔ میرے اس بیان سے یہ منشاء نہیں ہے کہ کوئی الزام گورنمنٹ پر لگایا جاوے، گورنمنٹ پر یہ فرض ہے کہ تمام احکام اور تجویزیں جو وہ صادر کرے وہ اصول گورنمنٹ کے منشاء کے مطابق ہوں۔

ہمارے اغراض میں سے ایک مذہبی تعلیم ہے۔ اس لئے کہ اگر کسی تعلیم

میں مذہبی تعلیم شامل نہ ہو تو حقیقت میں وہ تعلیم ایک جسم بے جان کی مانند ہوتی ہے اور شاید گورنمنٹ کے کالجوں سے زیادہ تر مسلمانوں کو فائدہ نہیں ہوتا اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ گورنمنٹ کالجوں میں لڑکوں کو مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اور مذہبی تعلیم کسی طرح انگریزی کالجوں میں نہیں ہوسکتی، بلکہ گورنمنٹ حقیقت میں ایسا کر نہیں سکتی۔ اس کے کالجوں میں ہندو، مسلمان، عیسائی سب قسم کے لوگ تعلیم پاتے ہیں اور ان سب کا درجہ مساوی ہے۔ پس گورنمنٹ پر یہ فرض ہے کہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے اور وہ اسی طرح ہوسکتا تھا کہ گورنمنٹ مذہبی تعلیم سے دست کش ہو۔ چنانچہ نہایت تعریف اور بے انتہا توصیف کے قابل ہے ہمارے گورنمنٹ کی یہ کارروائی نہ کہ جس طرح اس نے اپنے کالجوں میں اوروں کے مذہبی تعلیم کو داخل نہیں کیا، اسی طرح اس نے اپنے مذہب کو بھی علاحدہ رکھا۔

غرض اس میں کسی کو کلام نہیں ہوسکتا کہ گورنمنٹ کا مذہبی تعلیم سے دست کش ہونا بالکل بجا تھا، لیکن کلام اس میں ہے کہ آیا گورنمنٹ کے کالج اور اسکول ہمارے اغراض کے لئے بھی کافی ہیں یا نہیں؟ اور جیسا ہم نے اوپر ثابت کیا ہے ہم کو یقین ہے کہ وہ کافی نہیں ہے اور جب تک کسی کالج میں دنیاوی اور مذہبی دونوں قسم کی تعلیم نہ ہو اس وقت تک وہ مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہوسکتا۔ انہیں حالات کے لحاظ سے ہم نے ایک ایسے کالج کی بنیاد ڈالنی چاہی ہے جس میں مسلمانوں کو علوم دنیاوی کے ساتھ ان کی مذہبی تعلیم بھی دی جاوے اور ہر قسم کی تعلیم کا مناسب اہتمام کیا جاوے یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان یہ چاہے کہ میرا لڑکا مذہبی علوم میں نہایت اعلیٰ درجہ کی استعداد حاصل کرے تو اس کو مدرسہ میں یہ موقع ملے، اگر کوئی مسلمان یہ چاہتا ہے کہ میرے لڑکے کو ایسی تعلیم دی جاوے جس سے وہ سرکاری نوکری کے قابل ہو اور اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے اس کو مل سکیں، یہاں تک کہ سول سروس پاس کرنے کا موقع بھی اس کو ملے تو یہ سب اغراض اس کالج سے حاصل ہوں۔ اگر کوئی شخص زمینداری کے کاروبار کے متعلق یا تجارت کے

اصول کی تعلیم چاہے تو اس کو بھی موقع ملے۔ حاصل یہ کہ جب تک ہم ایسا ایک کالج نہ بناویں جس سے مسلمانوں کے تمام اغراض حاصل ہوں تو تک کوئی تدبیر مفید نہ ہوگی۔ ہر شخص کی ایک غرض اور ایک مدعا ہوتا ہے۔ غرضیں مختلف، ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں۔ پس ہم کو ضرور ہے کہ سب باتوں کا انتظام ایک جگہ کریں۔

اب آپ صاحب ذرا اس بات پر غور کریں کہ یہ ایک ایسا عظیم الشان کام ہے کہ جب تک تمام قوم مددگار نہ ہو اس وقت تک اس کا سرانجام نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک دو کی بات ہو تو خیر اس کو ایک بھگتے، جب قوم کی بات ہے تو کل قوم کو مدد کرنا چاہئے۔ ابھی اعظم گڑھ میں اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ تمام شہر کو کھانا پکا کر دیوے، دیکھئے کیسی دشواریاں پیش آتی ہیں، حالانکہ تمام شہر والے جب مصروف ہوتے ہیں تو ہر روز سب کو پکا پکایا کھانا مل جاتا ہے اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا اسی طرح جو کام ایک قومی کام ہے جب تک سب اس میں مدد دیں گے تب تک اس کا سرانجام نہ ہوگا اور اگر قوم نے مدد نہ کی اور چند آدمیوں کی کوشش تنہا کارگر نہ ہوئی تو یاد رکھو! سب ڈوبیں گے اور سب کے واسطے ذلت اور خرابی کے دن آرہے ہیں۔

میری عمر اب آخر ہونے آئی اور اب بہت زیادہ مجھ کو اپنی زندگی کی توقع نہیں ہے۔ اگرچہ اور کسی کو بھی نہیں ہے لیکن میں اپنی عمر کا بہت حصہ ختم کر چکا ہوں ہماری قوم کے معزز آدمی آج کی میری یہ بات یاد رکھیں جو میں اس وقت کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم کو اس خراب خستہ حالت سے نکال سکتے ہیں، لیکن اگر اس وقت ہماری قوم متوجہ نہ ہوئی تو خوب یاد رکھنا چاہئے کہ چند روز بعد سب لوگ چاہیں گے کہ کچھ کریں مگر کچھ کر نہ سکیں گے۔

اگر کوئی نہایت دیندار ہے تو سوچے کہ جس وقت مسلمانوں کی ذلت و نکبت اس درجہ پر پہنچ جاوے گی جو اس وقت ایک گھسیارہ اور چمار کی حالت ہے تو کیا عزت ہوگی اسلام کی۔ اسلام کوئی مٹی کی مورت نہیں ہے جس کو دیکھ کر لوگ اسلام کی خوبی سے واقف ہوں۔ اسلام اس کے پیروؤں کی صورتوں اور ان کے

اخلاق اوران کے مزاجوں اوران کی حالت سے پہچانا جاتا ہے،جس وقت خدا نخواستہ یہ نکبت جو مجھ کو دکھلائی دیتی ہے ہماری قوم پرحاوی ہوجاوے تو اس وقت اسلام کے نہایت عمدہ طرفداروں کی کیا حالت ہوگی۔نہایت افسوس ہے کہ ہم اس آنے والی آفت کے روکنے کے لئے اس وقت کچھ تدبیر نہ کریں جس کی خرابی بتدریج اب تک ہم دیکھتے آتے ہیں اور جس کی مثال پرآئندہ کی حالت کونہایت اچھی طرح سے قیاس کر سکتے ہیں۔کیا افسوس ہے ہم پرکہ آج ہم اپنے گھر میں آرام سے سوویں اور جو آفت ہماری اولاد اور ہماری قوم پرآتی ہوئی دکھلائی دیتی ہے اس کی کچھ فکر نہ کریں۔

یہ کام جس کا میں نے ذکر کیا صرف قوم ہی کی مدد پر منحصر ہے اور ایک نہایت عظیم الشان کام ہے۔ہارون رشید جو ایک بہت بڑا نامور بادشاہ گذرا،یا اس نے یہ ارادہ کیا تھا یا مجھ ایک فقیر نے ہی یہ ارادہ کیا ہے۔اس نے اپنے بے شمار خزانہ اور روپیہ پر بھروسہ کیا اور جہاں تک ممکن تھا اس نے اس کوخرچ کیا،مگر یہ کام پورا نہ ہوا۔میں ایک مفلس ہوں لیکن اپنی قوم پر بھروسہ کرتا ہوں اور اگر میری قوم میری مدد کرے تو جو کام ہارون رشید نے کیا تھا اس سے سوحصہ زیادہ کر سکتے ہیں اور ہماری اولاد اس کو اس سے بھی زیادہ ترقی دے سکتی ہے۔

میں ابھی گورکھپور سے آتا ہوں۔وہاں خاص ایک یہ خیال لوگوں کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ اگر علی گڑھ میں کالج قایم ہوا تو اس سے گورکھپور کو کیا فائدہ ہوگا؟اس لئے انہوں نے خیال کیا تھا کہ اگر گورکھپور میں یہ کالج قائم ہوتو زیادہ مفید ہوگا،لیکن انہوں نے مطلق غور نہ کیا،ان ضرورتوں پر اور مشکلات پر جو قوم میں علم پھیلانے کے لئے ضروری ہیں۔نہ اس خرچ کا کچھ خیال کیا جو ایسے کاموں میں ہونا چاہیئے۔کیا اسی طرح اعظم گڑھ،علی گڑھ،گورکھپور اور اور ضلعوں کے لوگ یہ چاہیں کہ ہر ایک ضلع میں وہ ایسا کالج قائم کریں تو کیا وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

اس ضلع اور اکثر اضلاع میں اس وقت دو قسم کے مدارس موجود ہیں۔

ایک گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا مشنریوں کی طرف سے۔ ہم پوچھتے ہیں آپ لوگ اگر کوشش بھی کریں تو کیا کوئی ایسا اسکول یا کالج اپنے ضلع میں قائم کرسکیں گے جیسا گورنمنٹ اسکول یا جیسا مشنری اسکول۔ کبھی نہیں۔ گورنمنٹ اسکول کا خرچ بارہ سو یا ہزار آٹھ سو روپیہ ماہواری کے قریب ہوتا ہے، کیا آپ اس ضلع سے آٹھ سو روپیہ ماہواری کا چندہ کرلیں گے جو برابر وصول بھی ہوتا رہے گا اور کبھی کوئی اس میں عذر نہ کرے گا اور تمام عمر آپ کا اسکول اسی چندہ کے روپیہ سے جاری رہ سکے گا۔ کبھی نہیں، ممکن نہیں۔ گورنمنٹ پڑھانے کی چیزیں مہیا کرتی ہے جن میں اکثر چیزیں ولایت سے آتی ہیں۔ روز بروز نئی کتابیں چھپ کر مدرسوں میں چلی آتی ہیں، کیا اعظم گڑھ میں کوئی ان سب مراتب کو پورا کرلے گا۔

اس وقت فرض کرو کہ آپ ایک اسکول قائم کر بھی لیں لیکن اب بتلایئے کہ اس میں کون سی کتابیں پڑھائی جاویں گی، آیا وہی کتابیں جو اگلے زمانہ میں پڑھائی جاتی تھیں۔ مذہبی کتابوں میں ہم کو عذر نہیں ہے، بے شک وہی پڑھائی جاویں، لیکن اور علوم کی نسبت بتلایئے کہ ان میں آیا اسی پرانی منطق وفلسفہ کی تعلیم ہوگی۔ وہ علوم اب کسی کام کے بھی نہیں رہے اور صرف ایک بات کی بات رہ گئی ہے۔ جس زمانہ میں وہ علوم بہ کار آمد تھے اس وقت میں تھے، مگر اب بتلاؤ کہ ایک مولوی صاحب جو نہایت عمدہ فلسفی اور منطقی بن گئے، ان کو دنیا کا کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ بھلا اگر دنیا کی مفید تعلیم سے بھی مسلمانوں کو غرض نہ ہو، نہ سہی، حالانکہ یہ غلط ہے مگر خیر یہی بتلاؤ کہ اس مدرسہ سے دینی ترقی کیا ہوگی؟ میں پوچھتا ہوں کہ کیا وہ مدرسہ ایسا ہوگا جس میں بڑے بڑے لائق محدث اور اصولی پیدا ہوسکیں گے۔ کبھی نہیں، کیا کوئی ضلع اس لائق ہوسکتا ہے کہ جو اپنے ضلع کے تمام لوگوں کے لئے کافی اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا بندوبست کرسکے۔ کبھی نہیں۔ ضرور ہے کہ اگر ہم آسمان پر چڑھنا چاہیں تو اس کے لئے پہلے سیڑھیاں بناویں۔ یہہ ہم قبول کرتے ہیں کہ ابتدائی مدرسہ ہر ضلع میں ہونا مناسب ہے، لیکن ان کی جڑ قائم ہونی چاہئے، کبھی

کوئی شاخ سرسبز نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کی جڑ مضبوط نہ ہو۔ اول ہم کو ایک بڑا خزانہ میٹھے پانی کا جمع کرنا چاہئے۔ اس میں سے پھر جس قدر نہروں کی ضرورت ہو نکالنی چاہئیں، لیکن بغیر اس خزانہ کے قائم کئے ایسی نہریں کیونکر نکل سکیں گی۔ کیا سوکھے تالاب میں سے تم نہریں نکالو گے۔

چندروز ہوئے کمیٹی نے ایک تجویز مشہور کی جس میں ان تمام علوم وفنون کی تصریح مندرج ہوئی ہے جو ہماری قوم کو پڑھائے جاویں گے، اس میں ہر قسم کی تعلیم قرار پائی ہے۔ ایک دنیاوی علوم کی، دوسری مذہبی علوم کی۔ دنیاوی علوم میں دو قسم کی تعلیم ہے، ایک قسم کی کل تعلیم انگریزی زبان میں ہوگی اور دوسری قسم میں اردو زبان میں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنے بیٹے کو جس شاخ میں داخل کرنا چاہے داخل کرے اور یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ دسویں برس سے اگر تعلیم شروع ہو تو بیسویں برس بالکل فراغت ہو جاوے گی۔ اگر کسی کی خواہش سول سروس پاس کرنے کی ہو تو وہ اسی وقت امتحان دے سکے گا۔ پہلا امتحان وہ بیس برس کی عمر میں دے سکے گا، اگر اس میں کامیاب نہ ہو تو پھر دوسرا امتحان اکیسویں برس دے گا۔ اگر اس پر بھی کامیاب نہ ہو تو وہ قسمت کی بات ہے اور مجبوری ہے۔ علاوہ اس کے گورنمنٹ نے ایک سرکلر اس حکم سے جاری کیا ہے کہ جو بڑے بڑے معزز خاندان نوکری پیشہ ہیں ان کو چاہئے کہ پچیس برس کی عمر سے پہلے اپنی اولاد کو سرکاری نوکریوں کے سلسلہ میں داخل کر دیں، ہم نے جو بیس برس کی عمر کا اندازہ تعلیم سے فراغت حاصل کرنے کا کیا ہے۔ اس کا منشاء یہ بھی ہے کہ اس تعلیم سے فراغت حاصل کر کے تین چار برس تک ان صیغوں اور محکموں کے قوانین اور ضوابط سیکھیں جن میں نوکری تلاش کرنا چاہتا ہے اور اطمینان سے نوکری حاصل کرنے کا بندوبست کرے۔

دوسرا درجہ ایسا مقرر کیا گیا ہے جس سے ہماری عام قوم کو فائدہ پہنچے۔ اس درجہ میں انگریزی کا لٹریچر جس کو ادب کہتے ہیں اس قدر سکھایا جاوے گا جس

سے عدالت کی کارروائی کا حرج نہ ہو۔ باقی تمام علوم وفنون اردو زبان میں پڑھائے جاویں گے، تاکہ ہماری قوم میں سے کوئی شخص ان علوم سے محروم نہ رہے اوراس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جب تمام علوم کی کتابیں ہماری زبان میں ہوجاویں تو شاید ہم بڈھوں کو بھی ان سے فائدہ حاصل ہواور آخر یہ ایک عام ذریعہ قوم میں علوم وفنون پھیلانے کا ہوگا۔

ہمارے ملک کے بعض انگریزی داں صاحبوں نے جو انگریزی کے زیادہ شایق ہیں، اردو میں عام علوم وفنون کی تعلیم پر اعتراض کیا ہے، لیکن میں ایک قول فیصل کہے دیتا ہوں کہ جب ہم نے یونانی علموں میں ترقی کی تو اس کا ذریعہ کیا تھا، یہی تھا کہ جو زبان ابراہیم کی نسل کی تھی اس میں ہم نے ان علوم کا ترجمہ کیا۔ ان ترجموں کے ذریعہ ہماری قوم میں ان علوم وفنون نے یہاں تک ترقی پائی کہ اب تک بھی اس کا اثر بڑی سرگرمی کے ساتھ ہماری قوم میں موجود ہے۔ پس اسی طرح اگر ان علوم وفنون کا جو آج ترقی یافتہ قوموں کی ترقی کا ذریعہ ہیں اردو زبان میں ترجمہ ہو جو بے شبہہ ایک شاخ ہے ہمارے بڑے باپ ابراہیم کی تو پھر وہی نتیجہ حاصل ہوگا۔

اس سے زیادہ میں اپنے قول کی تائید میں ایک صاف مثال بیان کرتا ہوں۔ اس وقت جو انگریزوں کی قوم کو اپنے علم وفضل اوراپنی صناعی اور لیاقت پر بڑا فخر ہے، ان سے پوچھو کہ اگر وہ تمام علوم وفنون جن پر آج تم کو فخر ہے اگر انگریزی زبان میں نہ ہوتے تو کیا کبھی اس نتیجہ کے حاصل ہونے کی امید ہوسکتی تھی، کبھی نہیں۔

اب چلو فرانس میں، جرمن میں اور ان سے پوچھو کہ اگر تمہارے ہی ملک کی زبان میں تمام علوم موجود نہ ہوتے تو کیا تم یہ ترقی کر سکتے تھے جو آج تم کو حاصل ہے۔ جواب ملے گا کہ کبھی نہیں۔ رشیا یعنی روس کی زبان میں علوم وفنون کی ترقی بہت کم ہوئی، اس وقت اس زبان میں صرف چودہ سو کتابیں مختلف علوم کی

ہیں، جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ وہ یورپ میں بہ نسبت اور قوموں کے تمام چیزوں میں اور علم و فضل میں پست ہیں۔ غرض یہ ہے کہ تمام قوموں کے پچھلے حال پر اور موجودہ حالت پر غور کرنے سے بہت بڑا عمدہ نتیجہ نکل آتا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس قوم نے غیر علموں کو غیر قوموں کے علموں کو اپنی زبان کے ذریعہ حاصل کیا، اس نے ترقی پائی اور جس قوم نے اس میں جتنی کوتاہی کی اسی قدر اس کی ترقی میں کمی ہوئی۔ خدا کے فضل سے مسلمانوں کے لڑکے نہایت ذہین ہوتے ہیں۔ ان کا دل ان کا دماغ بہت اچھا ہوتا ہے۔ جب ان کو مختلف قسم کے علموں پر آسانی سے دست رس ہوگی تو امید ہے کہ وہ ان علموں میں اور بہت زیادہ ترقی اور باریکیاں دکھلائیں گے۔ یہی وجہ ہے جو دوسرے درجہ میں ہر ایک قسم کے علوم و فنون جدید کا اپنی زبان کے ذریعہ سے پڑھانا تجویز کیا گیا ہے۔

تیسرا درجہ ہے تعلیم مذہبی کا اس میں کوئی چیز، کوئی شرط، کسی قسم کا انتخاب کتب مذہبی ہرگز کمیٹی خزینۃ البضاعۃ سے متعلق نہیں ہے جیسا لوگوں نے مشہور کر رکھا ہے اور جو لوگ یہ بیان کرتے پھرتے ہیں کہ مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم کے واسطے کتب مذہبی کا کچھ انتخاب ہوگا، کچھ کچھ مطالب کتابوں کے کم کئے جاویں گے، کچھ جدید مسائل زیادہ کئے جائیں گے، یہ بالکل جھوٹ اور بالکل اتہام ہے اور حقیقت میں ایسے لوگ جو ایسی بے اصل خبریں مشہور کرتے ہیں، اپنی قوم کے، اپنے مذہب کے دشمن ہیں۔ کمیٹی خزینۃ البضاعۃ میں بجز اس ایک فقرہ کے مذہبی تعلیم کی نسبت کبھی کچھ نہیں کہا گیا، نہ اصول و فقہ حدیث تفسیر پڑھائی جاوے گی۔ سنیوں کو مطابق مذہب اہل سنت و جماعت کے اور شیعوں کو مطابق مذہب شیعہ اثنا عشریہ کے اور اسی واسطے مذہبی تعلیم مدرسۃ العلوم میں سنیوں کے واسطے جدا قرار دی گئی ہے اور شیعوں کے واسطے جدا۔

حال ہی میں گورکھپور میں ایک مباحثہ ہوا۔ جو لوگ مدرسۃ العلوم کے مخالف تھے انہوں نے کہا کہ ہاں تم یہ بات کہتے تو ہو کہ مذہبی تعلیم میں کچھ کمی بیشی

نہ ہوگی، لیکن اگر تم آئندہ اس سے پھر جاؤ تو اس وقت کا کیا علاج ہے۔ ہم نے کہا کہ بابا اگر تم چاہتے ہوتو ہم ایک اقرار نامہ لکھ کر رجسٹری کرادیں، اگر اس پر بھی اطمینان نہ ہوتو پینل کوڈ کے بموجب جو سزا اس انحراف کے واسطے ہوسکتی ہو اس کے لئے ہم حاضر ہیں، لیکن اس میں ہمارا کچھ اختیار نہیں کہ تمہارے دل کا خطرہ کبھی موقوف ہی نہ ہو۔ اس وقت کمیٹی کے چونسٹھ ممبر ہیں۔ یہ مولوی منشی محمد اکرام صاحب بیٹھے ہیں یہ بھی ممبر ہیں، ان سے پوچھو کہ کیوں صاحب کیا تم بھی ایسے ہی رائے دیدو گے۔ منشی محمد خلیل صاحب اور مولوی نذیر احمد صاحب موجود ہیں جو اب کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے ممبر ہونے والے ہیں ان سے پوچھئے کہ اگر میں کافر ہوں تو کیا یہ میرے کفر کا ساتھ دیں گے۔ پھر اور بھی جس قدر ممبر ہیں سب مسلمان ہی ہیں۔ مولوی وحید حسین صاحب مولوی سید فرید الدین احمد صاحب، مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب، مولوی محمد امانت اللہ صاحب جو جناب مولوی محمد فصیح صاحب کے بیٹے ہیں کیا یہ سب کے سب اور ان کے ساتھ اور تمام مسلمان ممبر ایسے بے ایمان ہو جاویں گے۔ ہاں اگر ان میں سے کوئی بھی اعتبار کے لائق نہیں ہے تو ہم مجبور ہیں۔ اگر ہمارے ہاتھ میں خدا ہوتا تو ہم اس کی ضمانت بھی کرا سکتے تھے، مگر لاچاری ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ میں نہیں۔ جب بہت پوچھا گیا کہ پھر آخر اس کی کوئی راہ بھی ہے جو آپ کی طمانیت ہو، اس وقت انہوں نے یہ فرمایا جو ہمیشہ سے ہم کو مدنظر رہا ہے اور جو ہمیشہ بیان کیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی کوئی کمیٹی علیٰحدہ ہو، اس کے ممبر علیٰحدہ ہوں اور وہ ایسے لوگ ہوں جن کو مسلمان عموماً نہایت عمدہ و نیک جانتے ہوں۔ ہم نے کہا تو اس کو مہربانی سے لکھ دیجئے، انہوں نے نہایت نیکی اور مہربانی اور فیاضی سے یہ مضمون ایک کاغذ پر ہم کو لکھ بھیجا جو ممبر وہاں موجود تھے انہوں نے منظور کیا، جو وہاں موجود نہ تھے ان کو میں نے خط لکھے، جس قدر جواب میرے پاس آچکے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سب ممبروں نے بھی اس کو دل سے پسند کیا اور یقیناً تمام ممبر کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے بغیر

کسی استفتاء کے اس کو منظور کرتے ہیں۔ انہوں نے برابر یہ جواب دیا ہے کہ ہمیشہ سے کمیٹی کا یہی ارادہ تھا اور ہمیشہ اس کا شمار بھی ہوتا رہا ہے، کسی شخص کو اس بات کا وہم اور گمان بھی نہیں ہوا کہ مذہبی تعلیم میں کبھی کچھ تبدیلی اور فتور واقع ہوگا۔

شاید ان لوگوں کو میری شامت اعمال کا خیال ہوا۔ میں نہایت گنہ گار سہی، میرے اعمال میرے افعال سب برے سہی۔ میرے لئے کفر کے الحاد کے ارتداد کے فتویٰ لکھو اور مشتہر کرو مجھ کو کچھ شکایت نہیں، لیکن یہ بتلاؤ کہ مدرسہ سے اس کو کیا تعلق ہے، اس وقت کمیٹی خزنۃ البضاعۃ کے چونسٹھ ممبر ہیں کیا، میرے پاس کوئی جادو ہے، کیا ان کے اوپر میرا کچھ زور ہے کہ جو میں کہوں وہ بھی کہنے لگیں جو میں کروں وہ بھی کرنے لگیں گے۔ پوچھو منشی محمد اکرام سے کیا جو میں کہوں گا اور جو میں کروں گا وہی یہ بھی کہنے اور کرنے لگیں گے اور اپنے مذہب کی کچھ پروا نہ کریں گے۔

علاوہ اس کے ایک اور بات بھی غور کرنے کی ہے، یعنی اگر میں برا ہوں تو کیا تم اپنی قوم کو میرے لئے تباہ ہونے دینا پسند کرو گے۔ میں نہایت خوش ہوں کہ میری قوم کا کوئی نیک خواہش کھڑا ہو اور اس سب کام کو انجام دے۔ میں آج ہی علیحدہ ہوتا ہوں۔ مگر میں یہ نہیں دیکھ سکتا اور اس کو گوارا نہیں کر سکتا کہ نہ آپ ہی ایک کام کریں نہ مجھ کو ہی کرنے دیں اور اپنی قوم کو مرنے دیں اور ڈوبنے دیں، لیکن اب نہایت شکر کا مقام ہے کہ جو لوگ پہلے ایک وقت میں مدرسۃ العلوم کے مخالف تھے اب وہ متفق ہیں بلکہ معاون ہیں اور امید ہے کہ اب کوئی شبہہ لوگوں کو باقی نہیں رہا ہے اور اب انشاءاللہ جلد یہ سب آپس کا اختلاف دور ہوا جاتا ہے۔

اب مجھے اپنی تقریر کو مختصر کرنا چاہئے، اس وقت تک ایک لاکھ ستر ہزار روپیہ کے قریب مدرسۃ العلوم کے واسطے چندہ ہو چکا ہے، جس میں سے لاکھ روپیہ کے قریب وصول بھی ہو گیا ہے، باقی بھی بتدریج وصول ہوتا جاتا ہے۔ جنہوں نے چندہ دیا ہے ان میں سے اکثروں نے اپنے مقدور اور ہمت سے زیادہ چندہ دیا ہے

اور گو میں یہ نہ بھی کہہ سکوں کہ اپنی ہمت سے زیادہ چندہ دیا، لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ سب کا سب چندہ یکمشت وصول ہو جاتا، جو رقم انہوں نے چندہ میں لکھی ہے، وہ بہ اقساط ماہواری یا سہ ماہی وصول ہوتی جاتی ہے اور ایک سال یا ڈیڑھ سال یا دو سال میں وہ سب قسطیں وصول ہو جاویں گی۔ ہماری درخواست مسلمانوں سے یہ ہے کہ وہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس قدر اس کی ہمت ہو اس قدر چندہ دے۔ اگر کوئی ہماری فہرست چندہ کی دیکھے تو نہایت تعجب کرے گا کہ ایک صفحہ پر ایک ایک شخص سے چالیس ہزار اور دس ہزار پانچ ہزار، ہزار پانچ سو درج ہیں، لیکن دوسرے صفحہ پر پیسہ پیسہ اور دو دو پیسے بھی لکھے ہیں۔ کنجڑوں سے جولاہوں سے مانگنے میں ہم کو شرم نہیں آئی، ہم نے ایک ایک پیسہ اور ایک ایک پائی تک بھی جو لوگوں نے اپنی مرضی اور دلی مہربانی سے دیا نہایت شکر گذاری اور احسان مندی کے ساتھ لیا۔ نہایت تعریف کے قابل ہے وہ شخص جو یہ سن کر کہ میری قوم ایک کام کے واسطے دس لاکھ روپیہ جمع کرنا چاہتی ہے اپنے ٹوکرہ پر سے اٹھا اور ہاتھ بڑھا کر ایک پیسہ دیا یقیناً وہ جانتا تھا کہ میرے ایسے ایک پیسہ سے دس لاکھ روپیہ کا جمع ہونا بہت دشوار ہے، لیکن اس نے اس بات کا خیال کیا کہ جس کام میں میری قوم کوشش کر رہی ہے میں بھی شامل ہو جاؤں۔ اس نے وہ پیسہ دے کر اپنے دل کو خوش کیا۔ بے شک ہزاروں اور سیکڑوں کی رقمیں جو اکثر چندہ میں وصول ہوتی ہیں اس ایک پیسہ سے بہت بڑی ہیں، لیکن میرے نزدیک وہ ایک پیسہ جو سچی ہمدردی کے ساتھ دیا گیا ان ہزاروں اور سیکڑوں کی رقم سے کچھ کم قدر کے قابل نہیں۔

چندہ جو وصول کیا گیا ہے اس میں سے جس چندہ دینے والے نے کوئی قید، کوئی شرط نہیں لگائی اس کی بابت کمیٹی کو اختیار ہے چاہے جائداد خرید کرے، چاہے پرامیسری نوٹ لیوے۔ اس کے محاصل پر بھی کمیٹی کو اختیار ہے کہ خواہ تعلیم دنیاوی میں لگاوے، خواہ تعلیم مذہبی میں۔ لیکن جو لوگ یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ ان کے روپیہ سے پرامیسری نوٹ نہ خرید کئے جاویں، ان کا روپیہ ان نوٹوں کی

خریداری میں صرف نہیں کیا جاتا۔ وہ روپیہ ویسے ہی امانت رکھا جاتا ہے اور اس سے جائداد ہی خریدی جاوے گی۔ اور اس کی آمدنی مدرسے کے کاروبار میں صرف ہوگی۔ علاوہ اس کے چندہ دینے والوں کو یہ بھی اختیار ہے کہ اپنے چندہ کو کسی کام کے لئے خاص کر دیں، مثلاً جو لوگ اس شرط سے چندہ دیتے ہیں کہ ہمارے روپیہ کی آمدنی خاص دنیاوی علوم کی تعلیم میں صرف کی جاوے، وہ اسی غرض کے واسطے صرف ہوگی اور اس کا حساب جداگانہ رہے گا۔ اسی طرح مذہبی تعلیم کی مد جدا ہے، جنہوں نے مذہبی تعلیم کے لئے چندہ دیا ہے وہ اسی کام کے واسطے جمع ہوا ہے اور اس کی آمدنی اسی میں صرف ہوگی۔ پھر اس میں بھی دو مدیں ہیں۔ ایک اہل سنت و جماعت کی تعلیم مذہبی کی، دوسری مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی تعلیم مذہبی کی اور جو روپیہ جس مد کے متعلق آیا ہے وہ اسی میں جمع ہوا ہے۔ اسی طرح اور بھی دو کام ہیں ایک تعمیر مدرسۃ العلوم کی، دوسرے دو مسجدوں کی تعمیر ایک سنیوں کے لئے دوسری شیعوں کے لئے۔ بعض نے مدرسۃ العلوم کی تعمیر کے لئے جدا چندہ دیا ہے، وہ جدا جمع ہے۔ مسجدوں کی تعمیر کا چندہ جدا جمع ہوگا۔ جناب عالی نواب صاحب بہادر والی رام پور دام اقبالہم نے علاوہ اپنے پانچ ہزار چندہ کے سابق کے دس ہزار روپیہ مدرسہ کی تعمیر کے واسطے مرحمت فرمایا ہے۔ اس کے علاوہ جس دن مدرسہ کی بنیاد رکھنے کا دن ہوگا اس دن بحضور ویسرائے نواب گورنر جنرل بہادر کو بلایا جاوے گا۔ ان اخراجات کا تخمینہ پانچ ہزار ہے، وہ بھی جناب نواب صاحب ممدوح دام اقبالہم نے علیحدہ منظور فرمایا ہے۔

اب میں تمام رئیسوں سے جو اس وقت موجود ہیں یا موجود نہیں ہیں یہ التماس کرتا ہوں کہ اگر یہ سب باتیں جو میں نے بیان کیں آپ کے نزدیک بھی صحیح ہوں تو آپ سب صاحب بھی خالصۃً للہ اپنی قوم کی بھلائی میں شریک ہوں اور جس کو جو مقدور ہو وہ چندہ دے۔

(اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ، ۲۱ / اگست ۱۸۷۴ء ص ۵۳۰-۵۳۶)

[۲]

مرزا احسان احمد کے نام
معاصرین کے خطوط

مرزا احسان احمد [۱۸۹۶-۱۹۷۲ء] اپنے عہد کے ممتاز ادیب، انشا پرداز، شاعر اور نقاد تھے۔ وہ تاحیات اردو شعر و ادب کی خدمت میں سرگرم عمل رہے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے ''پیام کیف'' اور ''پیام زندگی'' علی الترتیب ۱۹۴۰ء اور ۱۹۸۶ء میں بعد از مرگ شائع ہوئے۔ وہ مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] کے بڑے عقیدت کیش تھے۔ ان کی وفات پر ایک طویل مرثیہ کہا تھا جو ۱۹۳۴ء میں ''سرشک اخلاص'' کے نام سے معارف پریس اعظم گڑھ سے رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔ یہ مرثیہ علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کو بے حد پسند تھا۔ اس کا عنوان بھی انھیں کا منتخب کیا ہوا ہے۔

مرزا صاحب نے متعدد ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین و مقالات لکھے، جو ملک کے موقر علمی و ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کا ایک مجموعہ ''مقالات احسان'' کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ انہوں نے علامہ اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۸۶-۱۹۵۵ء] کی یاد میں ایک مختصر سا رسالہ ''یاد سہیل'' کے نام سے لکھا تھا جو ۱۹۵۷ء میں کتابی صورت میں چھپا۔ نثر میں ان کی ایک اور یادگار ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' بھی ہے، جو اصلاً ان کی ادبی سرگذشت پر مشتمل ہے اور جوان وفات سے ایک سال قبل شائع ہوئی۔

مرزا صاحب ۱۸۹۶ء میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں مسلم پٹی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ پھر شبلی نیشنل اسکول میں داخل ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۱۴ء میں ایف. اے پاس کر کے ایم اے او کالج علی گڑھ گئے اور وہاں قانون کی اعلی تعلیم حاصلی کی۔ علی گڑھ سے

انہوں نے بی اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ علی گڑھ میں ڈاکٹر ذاکر حسین [۱۸۹۷-۱۹۶۹ء]، رشید احمد صدیقی [۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] اور اقبال احمد خاں سہیل ان کے خاص احباب میں تھے۔ ۱۹۱۸ء میں تحصیل علم کے بعد اعظم گڑھ واپس آئے اور پھر پوری زندگی اعظم گڑھ میں وکالت کی نذر کردی۔ ۱۹۶۵ء میں وکالت ترک کر کے عزلت نشیں ہوگئے اور بقیہ زندگی یادالٰہی اور شعروادب کے لئے وقف کردی تھی۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۲ء کو شہر اعظم گڑھ میں وفات پائی اور مسلمانوں کے عام قبرستان ''غازی دلیل خاں'' میں مدفون ہوئے۔

مرزا صاحب کے کمالات شعروادب کی داد مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]، شاہ معین الدین احمد ندوی [۱۹۰۳-۱۹۷۴ء]، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی وغیرہ نے دی ہے۔ ان کے مداحوں اور معترفین کا بھی ایک بڑا حلقہ تھا، جس میں تاریخ ادب اردو کے مصنف رام بابو سکسینہ [۱۸۹۶-۱۹۵۷ء]، پورن سنگھ ہنر، ایم اسلم، اشرف صبوحی، جلیل قدوائی، سید احتشام حسین، ثاقب کان پوری وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مرزا صاحب کے شعر وشاعری اور نظریہ شعروادب پر متعدد مضامین ومقالات لکھے گئے ہیں۔ ان میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد [۱۹۲۹-۲۰۱۶ء] اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی [۱۹۳۷ء-۲۰۰۸ء] کے مقالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے نہ صرف ان کی بلند ادبی وفکری جہات و خدمات سامنے آتی ہیں بلکہ شاعرانہ عظمت وبلند پائیگی اور تنقیدی بصیرت کے جلوے بھی نمایاں ہوتے ہے۔

مرزا صاحب کی شاعری بلند رتبہ ہے۔ اس میں اگرچہ قدیم رنگ سخن غالب ہے، تاہم جدت وندرت کے عناصر بھی کم نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کی شاعری میں بڑی سبک خرامی ہے اور ان کی زندگی ہی کی طرح ان کی شاعری بھی بڑی نفیس، سلیس اور شگفتہ ہے۔ ان کے یہاں سستی جذباتیت اور وقتی ہوش ربا خیالات کی بالادستی نہیں بلکہ سنجیدگی کی ایک سطح ہے جو بہرحال قائم رہتی ہے۔

مرزا صاحب ادیب، نقاد اور شاعر کی حیثیت سے اپنے عہد کی ایک مسلمہ شخصیت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں ادبی دنیا میں انھیں بڑا اعتبار اور وقار حاصل رہا۔ ان کی تخلیقات

اپنے عہد کے بلند پایہ اور موٴقر رسائل وجرائد کی زینت بنیں اور نہ صرف پسند کی گئیں بلکہ موضوع بحث بنیں اور اپنے اثرات مرتب کئے۔ ان کا دائرہ اثر بھی بہت وسیع تھا۔ ان کے معترضین اور معترفین میں بڑے بلند رتبہ ادباء وشعرا کے نام شامل نظر آتے ہیں۔ علاقائی اعتبار سے نظر ڈالی تو کلکتہ سے کراچی تک ان کے مداحوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ جیسے دورافتادہ شہر میں بیٹھ کر ایک شخص نے غیر علمی یعنی وکالت کے پیشہ سے وابستگی کے باوجود کیسے ایسی ادبی بساط بچھائی کہ اس کے دامن میں بڑے بڑے ادباء وشعرا اور نقاد سمٹ آئے اور وہ ان کا مرجع ومرکز بن گئے۔

مرزا صاحب کے ادبی وتنقیدی مقالات کی فہرست پر ایک اجمالی نظر ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس میں معاصر ادب اور ادبی وتنقیدی رویوں کا بڑے پیمانہ پر ذکر ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا ادبی اور شعری ذوق تو پختہ تھا ہی تنقیدی شعور بھی رچا اور نکھرا ہوا تھا۔ لکھنوی مذاق ادب کے معائب پر انھوں نے جو نقد کیا اور جس کے جواب میں اثر لکھنوی [١٨٨٥-١٩٦٧ء] میدان میں آئے اور جوابی مضامین لکھے جو ان کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''چھان بین'' میں شامل ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین سے بھی مرزا صاحب کے گہرے مطالعہ شعروادب کے ساتھ اصول تنقید وتحقیق پر کمال دست رس کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب ستر سال بعد اب صاف محسوس ہوتا ہے کہ مرزا صاحب دبستان لکھنؤ کے سلسلے میں اپنے موقف میں حق بجانب تھے۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ بعد کے اہل علم نے ان کے اس ادبی رویہ کو ادبی جہاد سے تعبیر کیا ہے۔

مرزا صاحب اگرچہ فراموش کردیئے گئے اور گوشہ گمنامی ان کا مقدر ٹھہرا، تاہم ادبی دنیا نے ان کے بعض ایسے اہم ادبی کارناموں سے بھی صرف نظر کیا جسے اب ادبی المیوں میں شمار کیا جائے گا۔ مثلاً جگر واصغر کی شخصیت اور ان کے اولین مجموعہ ہائے کلام ''داغ جگر'' اور ''نشاط روح'' کی ترتیب واشاعت مرزا صاحب کے بڑے کارنامے ہیں۔ انھیں نے اولاً ان خوب صورت مجموعہ ہائے کلام کو مرتب کر کے اپنے گراں قدر مقدموں کے ساتھ شائع کیا اور انہیں اہالیان دلی و لکھنؤ کے سامنے خوان ادب کے طور پر پیش کیا۔ ان دو بہترین سوغاتوں کو پیش کرنے والے ادیب کو پس پشت ڈالنا یقینی طور پر ایک المیہ ہے اور ہماری ذہنی پستی کا ایک نمونہ بھی۔ یہی نہیں اردو

کے ممتاز ادیب اور افسانہ نگار ایم اسلم کا پہلا بھرپور تعارف و تجزیہ بھی انھیں کے قلم سے نکلا اور یہی وجہ ہے کہ ایم اسلم ہمیشہ ممنون احسان رہے۔

مرزا صاحب کے مجموعہ مقالات کا ایک اہم تحقیقی اور تنقیدی حصہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] وفراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] اور اقبال سہیل کے علم و تحقیق اور شعروادب پر خامہ فرسائی بھی ہے۔ یہ تحریریں ان کے بلند مرتبہ ادبی مذاق کی شاہد ہیں۔ خاص طور پر انھوں نے علامہ شبلی کی جس محققانہ روش اور کارناموں کا ذکر کیا ہے، اس کا بعد میں علی العموم ذکر ہوا۔ اس کی اولیت کا شرف بہر حال مرزا صاحب کو حاصل ہے۔ علامہ فراہی کی فارسی شاعری پر جیسا مبسوط اور جامع مقالہ انھوں نے قلم بند کیا ہے آج تک اس کے برابر بھی نہیں لکھا جا سکا۔

مرزا صاحب کو آخری دور میں خود کو نظر انداز کرنے کا غالباً احساس ہو گیا تھا، چنانچہ انھوں نے ایک کتاب ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' لکھ کر ادبی دنیا کو اپنی طرف غالباً متوجہ کرنا چاہا۔ اس کتاب میں انھوں نے معاصرین سے اپنے ربط و تعلق کی داستان ان کے خطوط اور ارباب سخن کی اعترافاتی تحریروں سے سنائی ہے۔ اس داستان کے سنانے میں وہ کس قدر کامیاب ہوئے یہ ایک الگ موضوع ہے، تاہم اس بہانہ سے متعدد ممتاز اہل قلم اور ادبا و شعرا سے ان کے ربط ضبط کی داستان سامنے آ جاتی ہے۔ یہی نہیں اس کوشش کے نتیجہ میں چند مشاہیر شعرا کے مکاتیب بھی محفوظ ہو گئے۔ یہ خطوط اس لحاظ سے بڑے اہم ہیں کہ ان میں متنوع ادبی و تنقیدی موضوعات زیر بحث آئے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس مجموعہ کے بیشتر خطوط سے ادبی دنیا ناواقف ہے۔ اس میں جن ادیبوں اور شاعروں کے خطوط شامل ہیں ان میں بعض کے مجموعہ مکاتیب بھی شائع ہوئے ہیں، جس میں مرزا صاحب کے نام کے خطوط شامل نہیں ہیں۔ افادیت کے پیش نظر یہاں بغیر کسی تعارف و تجزیہ کے مکتوب نگاروں کے نام اور ان کے خطوط کی تعداد کا اندراج کیا جاتا ہے تا کہ ان کے مطالعہ میں آسانی ہو اور یہ اندازہ کیا جا سکے کہ مرزا صاحب کی ادبی سرگذشت ''میں اور میری ادبی صلاحیت'' میں کس قدر اہم مکاتیب پوشیدہ ہیں۔ اس میں افادیت کے پیش نظر مکتوب نگاروں کی تصانیف کے نام بھی ضمناً لکھ دیئے گئے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر ابن فرید (تصانیف: میں ہم اور ادب، چہرہ پس چہرہ، ادب داد طلب

وغیرہ) ایک خط

۲۔ ابوالسیدین رضوی۔ ایڈیٹر رسالہ امتیاز کان پور۔ ایک خط

۳۔ ثاقب کان پوری (تصانیف: متاع درد، روح جاوداں، انتخاب سودا وغیرہ) ایک خط

۴۔ سید احتشام حسین (تصانیف: اردو کی کہانی، تنقیدی نظریات، تنقید اور عملی تنقید، روشنی کے دریچے، ساحل اور سمندر، عکس اور آئینے، اعتبار نظر وغیرہ) ایک خط

۵۔ ڈاکٹر احمر رفاعی، شعبہ اردو گورنمنٹ کالج حیدرآباد (تصانیف: جگر مرادآبادی کتابیات، جگر مرادآبادی احوال وآثار، طلوع اشک، داغ، جگر اور شعلہ طور کا تقابلی مطالعہ وغیرہ) ایک خط

ڈاکٹر احمر رفاعی صاحب کے نام مرزا صاحب کے آٹھ خطوط ان کی کتاب ''داغ جگر اور شعلہ طور کا تقابلی جائزہ'' میں بھی شامل ہیں۔ اسی طرح مرزا صاحب کے دس خطوط مرحوم عبداللطیف اعظمی نے اپنی کتاب ''مشاہیر کے خطوط'' میں شامل کئے ہیں۔ مرزا صاحب پر کام کرنے والوں کے لئے ان خطوط کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

۶۔ اشرف صبوحی (تصانیف: دلی کی چند عجیب ہستیاں، دلی کی شادی، جھروکے، بغداد کا جوہری، بن باسی دیوی وغیرہ) چار خطوط

۷۔ اقبال احمد، سکریٹری حلقہ ادب اردو مغل سرائے۔ ایک خط

۸۔ ایم اسلم (تصانیف: آشوب زمانہ، ساربان، ممتاز، بلیاں، خانقاہ، نمستے علیکم، حکایات عرب، شمسہ، وادی کشمیر کی، صیاد، نیناں، آشرم، نور ہدایت، خط تقدیر، خضر راہ، مہدی، پیمان وفا، شب غم وغیرہ) چودہ خطوط۔

۹۔ خواجہ بدرالسلام فروغی، کراچی (تصانیف: فروغ اردو میں کیا کیا رکاوٹیں درپیش ہیں) دو خط

۱۰۔ برہم ناتھ دت قاصر، امرت سر (تصانیف: جواہر پارے، میرا بھائی، برگ وبار، ڈال ڈال پات پات وغیرہ) چار خطوط

۱۱۔ میاں بشیر احمد، ایڈیٹر ہمایوں لاہور۔ پانچ خطوط

۱۲۔ بشیر احمد صدیقی، سابق پرنسپل شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ، کراچی۔ دو خط

۱۳۔ بیخود اشفاق حسین صدیقی۔ دو خط

۱۴۔ پورن سنگھ ہنر، ایڈیٹر چمن امرت سر (تصانیف: متاع درد، شاخ) آٹھ خط

۱۵۔ مولانا تاجور نجیب آبادی/ایڈیٹر مخزن لاہور (تصانیف: روح نظم، تصویر مناظر، روح انتخاب، مدائح ومراثی، پیام زندگی وغیرہ) دو خط

۱۶۔ تسکین میرٹھی (تصانیف: گل گونہ، متاع تسکین) تین خطوط

۱۷۔ سر تیج بہادر سپرو۔ دو خط

۱۸۔ جگموہن نرائن مشرا۔ ایک خط

۱۹۔ جلیل احمد قدوائی۔ (تصانیف: نوائے سینہ تاب، خاکستر پروانہ، انتخاب شعرائے بدنام، تنقیدیں اور خاکے، انتخاب حسرت، کلام غالب، نقش ونگار، خیابان مسعود، تذکرے اور تبصرے، شعرا و شعریات، چند اور اکابر چند اور معاصر وغیرہ) تین خطوط

۲۰۔ حسن عابد جعفری، بیرسٹر، ایڈیٹر شمع آگرہ۔ تین خطوط

۲۱۔ خواجہ منظور حسین (تصانیف: تحریک جد و جہد بطور موضوع سخن) دو خط

۲۲۔ دیا نرائن نگم، ایڈیٹر زمانہ کان پور۔ دو خط

۲۳۔ ڈاکٹر ذاکر حسین (صدر جمہوریہ ہند) ایک خط

۲۴۔ رام بابو سکسینہ (تصانیف: تاریخ ادب اردو، مرقع شعرا) ایک خط

۲۵۔ رام لال بھنڈ واری، ایڈیٹر ماہنامہ جاں نثار امرت سر۔ ایک خط

۲۶۔ رشید احمد صدیقی (تصانیف: مضامین رشید، خنداں، آشفتہ بیانی میری، گنجہائے گراں مایہ، علی گڑھ کی مسجد قرطبہ، غالب کی شخصیت اور شاعری وغیرہ) پانچ خطوط

۲۷۔ رشید احمد، فیض آباد۔ دو خط

۲۸۔ سردار خانم۔ ایک خط

۲۹۔ جسٹس سر شاہ سلیمان، سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ایک خط

۳۰۔ شوق مرادآبادی۔ایک خط

۳۱۔ شیوراج بہار امرت سری۔ایک خط

۳۲۔ سر شیخ عبدالقادر، بیرسٹر، ایڈیٹر مخزن لاہور۔ایک خط

۳۳۔ صبا مارہروی۔ایک خط

۳۴۔ عارف اسلام پوری۔ایڈیٹر فکر لطیف، مغل سرائے۔ایک خط

۳۵۔ فضل احمد کریم فضلی، کراچی (تصانیف: چشم غزال، نغمہ زندگی) ایک خط

۳۶۔ قمرالدین اعظمی، دربھنگہ۔ایک خط

۳۷۔ کبیر کوثر، ماہنامہ انیس ادب دہلی۔(تصانیف: دامن، افغانستان کے امور خارجہ) دو خط

۳۸۔ محمد احسن، رسالہ نئی روشنی لکھنؤ۔ایک خط

۳۹۔ محمد حامد حسرت، ایڈیٹر پیغام فیض آباد۔ایک خط

۴۰۔ محمد سعید خاں۔پرنسپل ہائر سکنڈری اسکول شاہ جہاں پور۔ایک خط

۴۱۔ محمد صابر ضبط، شعبۂ تاریخ وتمدن گورنمنٹ اسلامیہ کالج کلکتہ۔پانچ خطوط

۴۲۔ مرزا یاس عظیم آبادی۔اٹاوہ۔دو خط

۴۳۔ مسعود اختر جمال۔(تصانیف: کاروان آزادی، پیغمبر اسلام، لالہ شاداب) ایک خط

۴۴۔ سید مصطفیٰ حسین نیّر، انجمن آئینہ ادب کانپور۔ایک خط

۴۵۔ میناز بیری مارہروی (علیگ) ایک خط

۴۶۔ نجم رضوی، ایڈیٹر الحق کلکتہ۔ایک خط

۴۷۔ نصرت موہانی۔ایک خط

۴۸۔ نند کشور اخگر (پنجاب) دو خط

۴۹۔ نیاز احمد صدیقی۔ایک خط

۵۰۔ یحییٰ اعظمی۔دو خط

۵۱۔ حکیم یوسف حسن، ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور۔(تصانیف: دوشیزہ، صنف

نازک، پرواز خیال، شب غم) ایک خط

۵۲۔ نامعلوم۔ ایک خط

میزان = ۱۰۷۔خطوط

مذکورہ مکتوب نگاروں کے ناموں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ علم وادب کے کس قدر بڑے جید اور سر برآوردہ اشخاص تھے اور ان کے مکاتیب کی ہماری ادبی تاریخ میں کس درجہ اہمیت ہے۔ طوالت کے پیش نظر ان کے تعارف وتجزیہ سے گریز کیا گیا ہے۔ ان میں چند ایک کے سوا بیشتر ادباء صاحب تصنیف ہیں اور شعراء کے تو متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔

ان خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس میں مرزا احسان احمد کی ادبی وشعری اور تنقیدی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ان کی شخصیت کا بھی ذکر ہے۔ ان کے ادبی کارناموں کے معیار ووقار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہی نہیں یہ خطوط اپنے عہد کے ادبی وشعری رویوں کے ذکر پر بھی مشتمل ہیں۔ خاص طور پر دلی اور لکھنو کے مذاق شاعری وغیرہ پر بڑے دلچسپ تبصرے ہیں۔

اسی طرح بہت سے خطوط مرزا صاحب سے مضامین ومقالات کے حصول کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان سے مرزا صاحب کے مقالات کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ چند خطوط میں جگر و اصغر کے کلام کی اشاعت اور ان پر مرزا صاحب کے مبسوط دیباچوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ غرض ان خطوط میں بڑا تنوع ہے اور یہ خطوط ہماری ادبی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ یقین ہے اب مذکورہ مکتوب نگاروں کے مطالعہ میں ان کے ان خطوط کو بھی پیش نظر رکھا جائے گا۔

جگر، اصغر، دل شاہ جہاں پوری اور ایم اسلم وغیرہ پر مستقل کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ متعدد مقالات اور مضامین سپرد قلم کئے جا چکے ہیں، مگر افسوس دنیائے شعر وادب نے مرزا صاحب کے کارناموں کے ذکر سے آنکھیں موند لیں۔ یہ ہمارے ادبی المیوں میں سے ایک قابل ذکر المیہ ہے۔ دیر سے سہی اب امید ہے مرزا صاحب کے روشن اور تابناک کارناموں کا ذکر ومطالعہ کیا جائے گا۔

[۴]

حضرۃ الاستاذ
مولانا مجیب اللہ ندوی کی یاد میں

حضرت الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] نوراللہ مرقدہ کے زیر شفقت میری زندگی کے ۲۵-۲۶ سال گزرے۔ اس دوران ان کے علم و فضل، زہد و ورع، شرافت و مروت، سادگی و تواضع، تعلیم و تربیت، سیاست و سیادت اور علم و حلم کے بے شمار واقعات آنکھوں کے سامنے گزرے۔ انہیں ملت کے لیے روتا تڑپتا اور بے چین و مضطرب دیکھا۔ کچھ کرنے اور کچھ کرگزرنے کا مثالی جذبہ دیکھا، ریشم کی طرح نرم اور فولاد کی طرح گرم دیکھا۔ آج جب ان کی یاد آتی ہے تو ایک ایک بات اور ان کا ایک ایک انداز سامنے آجاتا ہے اور دل یہ کہتا ہے:

تذکرہ استاد مرحوم کا نہ چھیڑ اے دوست
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

حضرۃ الاستاذ کی ابتدائی تعلیم کا آغاز اعظم گڑھ میں ہوا۔ پھر انہیں حفظ قرآن کے لیے غازی پور کے ایک گاؤں میں رہنے والے حافظ صاحب کے حوالہ کر دیا گیا، حافظ صاحب قرآن حفظ کرانے کے ساتھ طلبہ سے اپنے گھر کا کام کاج بھی لیتے تھے۔ چنانچہ مولانا کو بھی ان کے گھر کا کام کاج کرنا پڑا، جس سے ان کے سر میں ایک نشان پڑ گیا تھا۔ وہ نشان مولانا ہم لوگوں کو کبھی کبھی دکھاتے اور کہتے کہ حفظ قرآن کی دولت اسی کی بدولت ملی۔ وہ یہ بھی کہتے کہ استاذ کا جو مقام و مرتبہ ہے اس کے لحاظ سے یہ مشقتیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ مولانا اکثر حافظ صاحب کو یاد کرتے اور اس زمانہ یعنی اپنے بچپن کے بعض واقعات سناتے اور ایک آہ سرد بھر کر کہتے: اب اس زمانہ میں یہ سب باتیں افسانہ معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا تعلیم و تربیت کے معاملہ میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔

اس کے اوراسباب میں ایک سبب یہ بھی تھا جو انہوں نے اپنے بچپن میں تحصیل علم کے دوران دیکھا اور خود برتا تھا۔

تحصیل علم میں انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، جیسا کہ ''نقوش زندگی'' میں خود انہوں نے لکھا ہے۔ حالانکہ وہ ایک اچھے گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور بڑے لاڈ پیار میں پلے تھے۔

حفظ قرآن کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے مظہر العلوم بنارس میں داخل کیے گئے، یہاں وہ کئی برس زیر تعلیم رہے۔ یہاں کے اساتذہ میں وہ مولانا کوثر ندوی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ان کا بار بار ذکر کرتے۔ انہیں کے صحبت میں وہ علامہ شبلی اور ان کی تصنیف موازنہ انیس و دبیر اور شعر العجم سے واقف ہوئے۔

بنارس سے وہ ندوہ لکھنو پہنچے، مگر ندوہ پہنچنے میں انہیں بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ چاہتے تھے کہ وہ طب پڑھیں اور طبابت کا مشغلہ اختیار کریں، مگر انہوں نے دینی تعلیم کو ترجیح دی اور والد کی مرضی کے خلاف انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں لکھنؤ پہنچے اور بعض صعوبتوں کے بعد بالآخر ندوہ میں داخل ہوئے اور تکمیل کی۔

ندوہ سے فراغت کے بعد معمار دارالمصنّفین علامہ سید سلیمان ندویؒ نے انہیں یہ لکھ کر دارالمصنّفین اعظم گڑھ بلالیا کہ ''دارالمصنّفین آجاؤ، تم مجھے قرآن سناؤ اور میں تمہیں قرآن پڑھاؤں گا۔'' چنانچہ ۱۹۴۴ء میں وہ دارالمصنّفین آگئے اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے انہیں رفیق (Fellow) منتخب کیا۔ سید صاحب ۱۹۴۶ء میں دارالمصنّفین سے بھوپال چلے گئے۔ اس طرح مولانا چند ہی سال خدمت سلیمان میں گزار سکے، مگر یہ چند سال شاید ان کی زندگی کے سب سے خوبصورت دن تھے۔ اس لیے کہ وہ اپنی مجالس میں اکثر سید صاحب اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے ایام کا ذکر بڑی حسرت سے کرتے تھے۔ اس موضوع پر کم از کم دو مضامین بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ جو ''خدمت سلیمانی میں چند سال'' کے نام سے ماہنامہ الرشاد میں شائع ہوئے ہیں۔ مولانا مرحوم دارالمصنّفین سے ۱۹۶۶ء تک وابستہ رہے۔ اس دوران انہوں نے دو بڑی اہم اور معرکۃ الآراء کتابیں اور چند اچھوتے موضوعات پر بڑی محنت و تحقیق سے ماہنامہ معارف میں مقالات لکھے۔ ''اہل کتاب صحابہؓ و تابعینؒ'' ان کی پہلی تصنیف ہے جو دارالمصنّفین سے ۱۹۵۲ء میں

شائع ہوئی، یہ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے بلکہ اہل علم کا خیال ہے کہ اس موضوع پر اب تک کسی اور زبان میں کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے ان صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کا تذکرہ لکھا ہے جو یہودی یا نصرانی تھے اور مشرف بہ اسلام ہوکر اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ اس کا طویل مقدمہ جس میں یہود و نصاریٰ کی مکمل تاریخ آ گئی ہے، خاصے کی چیز ہے اور بلاشبہ تحقیقات مجیبی میں شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اس کتاب کی تصنیف پر انہیں بڑے حوصلہ افزا کلمات لکھے۔ اس کا گراں قدر مقدمہ بھی انہیں کے قلم سے ہے۔

دوسری کتاب ''تبع تابعین'' حصہ اول ہے۔ یہ تبع تابعین کے ایمان افروز تذکرہ پر مشتمل ہے۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ چند اہم موضوعات پر تحقیقی مقالات معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوئے۔ مثلاً ''فتاویٰ عالمگیری اور اس کے مؤلفین''، ''سرمد اور ان کی رباعیاں''، ''اجتہاد اور تبدیلی احکام'' وغیرہ۔ یہ مقالات بعد میں مزید اضافوں کے ساتھ ہندو پاک سے کتابی صورت میں بھی شائع کیے گئے اور مقبول ہوئے۔

مقالہ ''اجتہاد اور تبدیلی احکام'' جس زمانہ میں معارف میں شائع ہوا مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے انہیں لکھا کہ آپ پورے ندوہ کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔ اس مقالہ کی انہوں نے بڑی تعریف وتحسین کی تھی۔ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے بھی اس کی داد دی۔ مولانا مرحوم جس زمانہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے تھے اکثر ان کا ذکر کرتے اور ان کے بلند ظرفی کے واقعات سناتے اور کہتے اب ان سے دنیا خالی ہوتی جارہی ہے اور جو چلا جاتا ہے اس کی جگہ پر نہیں ہوتی۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا مرحوم ماہنامہ معارف میں برسوں مطبوعات جدیدہ پر تنقید وتبصرہ بھی لکھتے رہے اور بے شمار کتابوں پر نقد وتبصرے لکھے۔ اگر ان کو جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے۔ بعض وفیات اور باب التقریظ والانتقاد بھی ان کے قلم سے نکلے ہیں۔ ان معرکۃ الآراء اور گراں مایہ تحریروں نے ملک و بیرون ملک ان کی شناخت ایک بڑے عالم ومصنف اور بڑے اہل قلم کی قائم کی اور اہل علم ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس دوران انہوں نے اعظم گڑھ شہر میں ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو آج ملک کے ممتاز دینی مدرسوں میں جامعۃ الرشاد کے نام سے

اپنی ایک علاحدہ شناخت رکھتا ہے۔ اس مدرسہ کے قیام کو لے کر بعضوں حاسدوں نے ایک مسئلہ کھڑا کر دیا۔ چنانچہ اس وقت کے دارالمصنّفین کے ارباب حل وعقد نے مولانا پر دباؤ ڈالا کہ وہ دارالمصنّفین کے لیے یکسو ہو جائیں، ورنہ ان کے خلاف کارروائی ہو گی۔ مولانا مرحوم خاموش رہے اور بالآخر ان کے خلاف کارروائی ہوئی اور انہیں دارالمصنّفین سے یک لخت علاحدہ کر دیا گیا، جس وقت انہیں علاحدہ کرنے کا فیصلہ ہوا وہ دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں لکھنے پڑھنے کے کاموں میں مصروف تھے۔ جب انہیں اطلاع دی گئی کہ اب آپ دارالمصنّفین کے رفیق نہیں رہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان پر کیا گزری ہوگی، جس ادارہ میں ان کا شباب گزرا تھا اور جس میں ان کا انتخاب سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کیا تھا، اس علاحدگی سے ان پر کیا بیتی ہوگی، مگر دریا ساکت تھا۔ ایسے مواقع پر اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں، مگر اللہ مغفرت کرے استاذ مرحوم کی وہ خاموشی سے اٹھے اور اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔ پھر پلٹ کر نہیں دیکھا کہ کیا ہوا؟ اور کیوں کر ہوا۔؟

ملک کے دینی وملی اداروں میں خاص طور پر مدارس میں اس طرح کے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں کہ کوئی شخص کسی ادارہ سے علاحدہ کیا گیا تو اس نے فوراً دوسرا ادارہ قائم کر لیا، یا پھر جوتیوں میں دال تقسیم ہوئی، مگر حضرت الاستاذ نے انتہائی شرافت کا نمونہ بن کر دکھایا بلکہ آخری سانس تک اس ادارہ کے ہمدرد و بہی خواہ رہے اور ہمیشہ اسے اپنا ہی ادارہ خیال کرتے رہے۔

۱۹۸۷ء میں دارالمصنّفین میں اس وقت کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] کے خلاف بعض اشخاص نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہاں تک کہ دارالمصنّفین کا اکاؤنٹ سیز کر دیا گیا۔ مولانا مرحوم کو جوں ہی اس واقعہ کی خبر ہوئی فوراً دارالمصنّفین پہنچے۔ صباح الدین صاحب سے اظہار ہمدردی کیا۔ یہ دراصل دارالمصنّفین سے اظہار ہمدردی تھی۔ اور پھر مرحوم وکیل احمد انصاری کو ان کے تعاون کے لئے متعین کیا، جنھوں نے سیز اکاؤنٹ کو کھلوانے میں بڑی مدد کی۔ اسی طرح ایک شخص نے مولانا سید سلیمان ندویؒ سمینار میں دارالمصنّفین پر بعض ناروا اعتراضات کیے تو ان سے مائیک لے لیا اور کہا کہ یہ باتیں میرے حاشیہ خیال میں نہیں آئیں اور یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے۔

استاذ گرامی کا دل قومی حمیت وغیرت کے جذبات سے لبریز تھا اور ایسا لبریز تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر چھلک جاتا تھا۔ لوگ انہیں جذباتی خیال کرتے تھے، مگر حقیقت یہ نہیں ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء کی قیامت دیکھی تھی۔ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے فسادات ان کے عہد میں اور ان کے سامنے ہوئے۔ جس میں مسلمانوں کی بے پناہ تباہی و بربادی ہوئی۔ یہ روز روز کی قیامتوں نے ان کا دل چھلنی کر دیا تھا۔ پھر دنیا کی بڑی بڑی تباہیاں بھی ان کے سامنے ہوئیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ ہولنا کی میں ان کا عہد شباب تھا۔ اس کی ہولنا کی اور پھر اخیر دور میں عراق و افغانستان کی تباہی، مسلمانان عالم کی بے حسی، سرد مہری، امریکہ کی ظالمانہ روش اور مسلم ممالک پر اس کی بمباری یہ تمام تکلیف دہ مناظر ان کی آنکھوں میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ذرا ذرا سی بے اعتدالی پر جذباتی بلکہ برہم ہو جاتے، لیکن وہ صرف جذباتی نہیں تھے بلکہ وہ قوم وملت کے لیے اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انہیں سنتِ یوسفی بھی ادا کرنی پڑی اور پس دیوار زنداں رہنا پڑا۔ ماہنامہ ''الرشاد'' کے رشحات میں انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر جو خون کے آنسو بہائے ہیں وہ درحقیقت ان کی حمیت کے مظاہر ہیں۔

دارالمصنّفین سے علاحدگی کے بعد وہ جامعۃ الرشاد کے لیے یکسو ہو گئے اور اپنی ساری توانائی اس مدرسہ میں لگا دی اور آہستہ آہستہ جامعۃ الرشاد میں سات آٹھ شعبے قائم ہو گئے۔ یوں تو ان کے قائم کردہ تمام شعبے اہم تھے، مگر اس میں سب سے اہم شعبہ حفظ تھا، جس سے بے شمار حفاظ نکلے۔ انہیں قرآن مجید سے بے انتہا شغف تھا۔ تلاوت کا ہمیشہ معمول رہا۔ فجر اور ظہر سے پہلے عموماً تلاوت کر کے نماز کے لیے جاتے تھے۔ قرآن مجید کی عظمت پر انہوں نے جو کتاب لکھی ہے وہ بے حد اہم کتاب ہے اور قرآن مجید سے ان کے جذباتی تعلق کا نتیجہ ہے۔

جامعۃ الرشاد کا دوسرا اہم شعبہ تصنیف و تالیف تھا، جسے پہلے انہوں نے دارالتالیف و الترجمہ کا نام دیا تھا، بعد میں اس نام کا ایک اور ادارہ نظر آیا تو اس کا نام بدل کر ندوۃ التالیف والترجمہ رکھ دیا۔ مولانا مرحوم کی تمام اہم اور تحقیقی کتابیں اسی کی بدولت ہر جگہ پھیلیں۔

مولانا مرحوم کی دو کتابیں دارالمصنّفین سے شائع ہوئیں۔ کئی کتابیں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور نے شائع کیں۔ اس میں ''اجتہاد اور تبدیلی احکام''، ''فتاویٰ عالمگیری اور اس کے

مؤلفین''، ''اسلامی قانون اجرت''، ''مسئلہ کفو'' اور ''اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بعد میں انہیں ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد نے بھی شائع کیا۔ ان کی مشہور کتاب ''اسلامی فقہ'' جو تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے مکتبہ الحسنات نے شائع کی تھی چونکہ اس کے معاملات اچھے نہیں تھے، اس لیے اسے تاج کمپنی دہلی کو شائع کرنے کی اجازت دی جواب تک شائع کر رہا ہے۔ مکتبہ الحسنات دہلی نے انتقاماً فرضی نام سے معمولی ردوبدل کے ساتھ شائع کیا تو مولانا بہت ناراض ہوئے اور اس کے خلاف ماہنامہ الرشاد میں ایک تحریر لکھی اور اس گھناؤنی حرکت کی مذمت کی۔

مولانا مرحوم کی ایک کتاب ''فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل'' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی نے بھی شائع کی ہے۔ یہ دراصل ایک خطبہ تھا جو انہوں نے جامعہ ملیہ میں دیا تھا۔ اخیر دور میں انہوں نے مجھے ندوۃ التالیف والترجمہ کا ذمہ دار بنا کر کہا کہ اب اپنی اور میری تمام کتابیں ندوۃ التالیف والترجمہ سے شائع کرو اور لکھنے پڑھنے والوں کی ایک جماعت بناؤ اور جامعۃ الرشاد کے قدیم طلبہ کو لے کر تصنیف وتالیف کا کام کرو۔ ایک مرتبہ مزاحاً کہا کہ اب تمہیں ندوۃ التالیف والترجمہ کا ڈائرکٹر بنا دیا ہے کچھ کر کے دکھاؤ۔ ان کی تربیت کا یہ انداز اور حوصلہ افزائی کا یہ طریقہ اور کام کرنے اور کرانے کی یہ باتیں اب یاد آتی ہیں تو سوچتا ہوں:

کیسا بلند ظرف تھا، عالی وقار تھا
سرمایہ دار فن تھا مگر خاکسار تھا

جامعۃ الرشاد کے قدرے استحکام کے بعد فروری ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ ''الرشاد'' جاری کیا۔ اس وقت انہیں پھر سے وہ لوگ یاد آئے جنہوں نے مرکز علمی دارالمصنّفین سے علاحدہ کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے لکھا کہ کچھ لوگوں نے ان کا قلم توڑ دیا تھا، اسے نیا قط دے کر دوبارہ رواں کر رہا ہوں۔ چنانچہ مولانا نے اس نئے قط کو اور نئے دوات کی روشنائی کو آخری سانس تک خشک نہیں ہونے دیا۔ مسلسل لکھا اور مختلف موضوعات پر لکھا اور اس قدر لکھا کہ اگر آج انہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو وہ کئی جلدوں میں آئے گا۔ مولانا مرحوم تصنیف وتالیف میں اوریجنل کاموں کے قائل تھے۔ ترتیب وتدوین کے کاموں کو کتاب سازی سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ میری کتاب

''عظمت کے نشان'' شائع ہوئی تو انہوں نے کہا کہ کتاب لکھو کتاب سازی نہ کرو ۔ پھر کئی لوگوں سے از راہِ مزاح کہا کہ الیاس میاں آج کل کتاب سازی کر رہے ہیں۔اسی طرح ایک موقع پر تاریخ کی کچھ باتیں ہو رہی تھیں تو مجھے انہوں نے نصیحت کی کہ تاریخ خواں اور تاریخ داں نہ بنو۔ تاریخ ساز بنو۔ یہ الفاظ ان کے منہ سے بہت اچھے لگتے تھے۔واقعہ یہ ہے کہ وہ ایسے محبت آمیز انداز میں کہتے تھے کہ قربان جانے کو جی چاہتا۔افسوس ان کے اٹھ جانے سے یہ باتیں خواب و خیال ہوگئیں۔

ماہنامہ الرشاد بڑے آب و تاب سے نکلا اور بہت جلد آسمان علم و ادب پر اپنا نقش قائم کرنے میں کامیاب رہا۔اسے انہوں نے ماہنامہ معارف اور الفرقان کے درمیان کا رسالہ قرار دیا تھا اور اسی معیار پر انہوں نے اسے تاحیات باقی رکھا۔ ہندوستان و پاکستان سے متعدد علمی و دینی رسائل نکلے جو اکثر و بیشتر ان کے زیر مطالعہ رہے، مگر انہوں نے معارف اور الفرقان کا نام شاید اس لیے لیا تھا کہ ان رسائل اور ان کے مرتبین سے انہیں خصوصی تعلق تھا۔مولانا سید سلیمان ندوی کی تو وہ ہر ادا پر جان دیتے تھے۔مولانا منظور نعمانی سے کچھ کم تعلق نہیں تھا۔ان کا بار ہا ذکر کرتے۔ ان کے علم و فضل اور خاص طور پر ان کی تحریروں کے بڑے مداح تھے۔ایک واقعہ کا خاص طور پر ذکر کرتے کہ مولانا منظور نعمانیؒ نے ان کی ایک تحریر کو بھرے مجمع میں پڑھوایا۔شاید مولانا کی وہ تحریر الفرقان میں شائع بھی ہوئی۔مولانا منظور نعمانی صاحب کی وفات پر انہوں نے جو وفیات لکھی ہے،اس سے بھی ان سے عقیدت مندانہ احساسات اور جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔

مولانا مجیب اللہ ندویؒ کو اپنے اساتذہ، بزرگوں اور احباب و معاصرین سے جو ربط و تعلق تھا، اس کی داستان ان کے وفیاتی مضامین کے مجموعہ'' کاروانِ رفتگاں'' کی ایک ایک سطر سے نمایاں ہے۔ یہ دراصل ان کے آنسو ہیں جو کاغذ کے صفحات پر بکھر گئے ہیں۔

حضرت الاستاذ کی شخصیت میں بڑا تنوع تھا۔علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کے ساتھ وہ عملی کاموں کو بھی بحسن و خوبی انجام دیتے رہتے تھے۔ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ ایک شخص علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا مرد میداں ہوتا ہے مگر عملی، ملی اور سیاسی کام اس کے بس کے نہیں ہوتے۔اسی طرح عملی جدو جہد اور سیاست میں بہت سے اشخاص نے نمایاں کردار ادا کیا، مگر وہ علم و تحقیق کے

میدان میں کورے رہے۔ ہمارے عہد میں چند ہی ایسی جامع اور خاص شخصیتیں گزری ہیں جن میں یہ دونوں خوبیاں موجود تھیں، ان میں ایک نمایاں اور ممتاز نام استاذی مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم کا بھی ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی نے علم و عمل دونوں میدانوں میں لازوال یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ''اہل کتاب صحابہ و تابعین'' سے لے کر ''اسوۂ حسنہ'' تک علمی و تصنیفی میدان میں ان کے ایسے عظیم الشان کارنامے ہیں جنہیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح جامعۃ الرشاد اور اس کے متعدد شعبہ جات کا قیام اور انتظام و انصرام بھی ایک بڑا مہتم بالشان کارنامہ ہے۔ وہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور تنظیموں سے وابستہ رہے۔ آل انڈیا ملی کونسل کے تو وہ بانیوں میں تھے اور اس کی کامیابی کے لیے بڑی جد وجہد کی، لیکن ان کا اس سے بھی بڑا ایک کارنامہ اعظم گڑھ کے قصبات ومواضعات میں مدارس و مکاتب کا قیام اور ان کی تنظیم ہے۔ انہوں نے اس کے لیے دینی تعلیمی کونسل لکھنو کے پلیٹ فارم سے بڑی جد وجہد کی۔ گاؤں گاؤں کا دورہ کیا۔ تقریریں کیں اور بچوں کی ابتدائی تعلیم کے لیے متعدد مکاتب قائم کرائے اور ان کے نظم وانتظام کی کوششیں کیں اور آخر تک کسی نہ کسی شکل میں وہ اس کام کو انجام دیتے رہے۔ ذاتی طور پر وہ غریبوں اور نادار بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔

انہوں نے بچوں کی ذہنی تربیت کے لے ''اسلامی تعلیم'' کے نام سے چار حصوں میں کتاب لکھی ہے اور بلاشبہ بڑی عمدہ کتاب لکھی ہے جو آج بھی متعدد مکاتب میں بچوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ اسی طرح انہوں نے ''بچوں کی سیرت نبویؐ'' کے نام سے بھی ایک کتابچہ تیار کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بچپن ہی میں سیرتِ نبویؐ بچوں کے ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے۔ یہ کتابچہ بھی بے حد اہم ہے۔

مولانا مرحوم نے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں اصلاح وتغیر کے لیے جو بہت سے کام انجام دیے اس میں ان کا ایک اہم کام ''اصلاح معاشرہ'' کے لیے جد وجہد بھی ہے۔ اس کے لیے انہوں نے جلسے کیے اور متعدد کانفرنسوں میں شرکت کی اور مختلف اضلاع کا دورہ کیا۔ پمفلٹ اور کتابچے لکھے اور شائع کیے۔ الرشاد کے صفحات میں بھی اس کے متعلق لکھتے رہے۔ ان کا خیال تھا

کہ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی میں جب تک انقلاب نہیں آئے گا کوئی تحریک مؤثر نہیں خیال کی جاسکتی۔ وہ مسلمانوں کی جذباتیت کو ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ گراس روٹ سے کام کرنے کی ضرورت ہے، اس کے بعد ہی مسلمانوں کو ملی اور سیاسی مسائل میں کامیابی مل سکتی ہے۔

حضرت الاستاذ کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی تصنیفات وتحقیقات ہیں۔ علی العموم ان کو فقیہ اور دانشور خیال کیا جاتا ہے اور وہ بے شبہ بڑے فقیہ، مصنف اور عظیم دانشور تھے۔ ان کی دانشوری بھی عام شاہراہ سے علاحدہ تھی۔ اصلاً وہ علامہ شبلی کی دانشوری کے سلسلے کی ایک اہم کڑی تھے اور اسی پر ہمیشہ کاربند رہے۔

مولانا مرحوم کی کتاب زندگی کا ایک خوبصورت ورق ان کی ادب وانشاء سے بڑھی ہوئی دلچسپی تھی۔ بحیثیت ادیب وانشاء پرداز ان کا مرتبہ بلند تھا۔ اصلاً وہ شبلی وسلیمان کی علمی وادبی روایتوں کے امین تھے۔ ندوہ کی فرزندی بلکہ ارجمندی نے اس میں اور حسن پیدا کردیا تھا۔ چنانچہ ان کی تمام تصنیفات میں چاہے وہ فقہی ہوں یا تاریخی، ادبی ہوں یا سوانحی، سب میں ادبیت کی چاشنی اور شیرینی صاف محسوس ہوتی ہے۔ شستگی وشگفتگی اور سلاست وروانی نے ان کی نثر میں بلا کا حسن اور بڑی دلآویزی پیدا کردی ہے۔

ان کی ایک مطبوعہ کتاب ''سرمد اور ان کی رباعیاں'' اور ایک نامکمل اور غیر مطبوعہ کتاب خواجہ میر درد کے اوراق میں ادب وانشاء کی دلآویزی کے عناصر ترکیبی دامن دل کھینچ لیتے ہیں۔ ان کی کتاب ''اہل دل کی باتیں'' میں بھی بڑی ادبیت ہے۔ مولانا مرحوم پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا ہے، لیکن جب کبھی ان کی طرف توجہ دی جائے گی تو اہل قلم ان کی ادبی حیثیت سے صرف نظر نہ کرسکیں گے۔

انہوں نے سرمد پر جو کتاب لکھی ہے اور اس میں ان کی رباعیات کی توضیح وتشریح اور تفہیم میں جس دقت نظری سے کام لیا ہے، اس کا تعلق فارسی ادب سے ہے۔ فارسی شعر وادب پر مولانا کی نظر بڑی گہری تھی۔ فارسی شعراء کی شاعری پر اکثر وہ اظہار خیال کرتے اور بروقت ان کے اشعار سنا کر ان کی تشریح کرتے رہتے تھے۔ انہیں اردو شعرا میں خواجہ میر دردؔ سے بڑی شیفتگی تھی بلکہ ان کے بڑے والہ وشیدا تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خواجہ میر درد، میر کے مقابلہ میں بلند رتبہ ہیں۔

اکثر اپنی محفلوں میں میر و درد کے اشعار کا موازنہ کرتے اور دردؔ کو ترجیح دیتے۔ خواجہ میر دردؔ پر انہوں نے ایک مکمل کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اس سلسلے کے چند مضامین ان کے شائع بھی ہوئے ہیں۔ ان مضامین سے شیفتگی درد کے علاوہ ان کے بلند ادبی وتنقیدی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ بالخصوص ان کے عارفانہ کلام کی انہوں نے جس طرح توضیح وتشریح کی ہے وہ تنقیدی شعور کے ساتھ ادبی اور متصوفانہ شاعری پر گہری نظر کا ایک نمونہ ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری ادبی تاریخ میں کسی فقیہ نے شاید ہی اس طرح بالغ نظری سے اردو شعر وشاعری کی تفہیم میں حصہ لیا ہو۔

ان کا شعری ذوق بڑا پختہ اور بلند تھا۔ سیکڑوں نہیں تو ۷۲/شعر (نشتر) ضرور ان کے پاس تھے، جن کا موقع بموقع اظہار ہوتا رہتا تھا۔ اس طرح کے سیکڑوں اشعار انہوں نے ''میرے پسندیدہ اشعار'' کے عنوان سے ماہنامہ الرشاد میں بالاقساط شائع کیے ہیں۔ ان اشعار کی اشاعت کے زمانہ میں راقم ڈرا ڈرا ان کی خدمت میں حاضر ہوتا، کیونکہ اکثر کوئی شعر پڑھوا کر اس کی تشریح کرنے کو کہتے اور جب ان کے ذوق بلند تک رسائی نہیں ہوتی تو وہ خود تشریح کرتے اور نئی نسل کی کم علمی پر اظہار افسوس کرتے۔

میری زندگی میں حضرت الاستاذ کی یادوں اور باتوں کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لیے کہ مجھ بے علمے کی زندگی میں جن لوگوں کے بے پایاں احسانات ہیں، ان میں استاذ مرحوم کا نام سب سے نمایاں ہے۔ میرے والد حاجی عبدالرزاق مرحوم نے مجھے تعلیم وتربیت کے لئے انہیں کے حوالہ کیا تھا۔ انہیں نے میری بسم اللہ کرائی۔ انہیں نے الرشاد کی مجلس ادارت میں شامل کر کے اہل علم وقلم کی صف میں کھڑا کیا۔ انہیں نے تبصرہ نگاری کا کام سونپ کر ہر طرح کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع فراہم کیا۔ انہیں کی صحبت میں بحث ونقد اور تحقیق وتصنیف کی اہمیت دل ودماغ پر واضح ہوئی اور انہیں نے سب سے پہلے میری کتابوں پر دیباچے اور تبصرے لکھ کر حوصلہ بڑھایا۔ سچ یہ ہے کہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

[۵]

مولانا مجیب اللہ ندوی کی فقہی تصنیفات

مولانا سید محمد متین ہاشمی کی نظر میں

مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] میں عنفوان شباب ہی سے جوہر قابل ہونے کے آثار نظر آتے تھے۔ چنانچہ جس وقت وہ ندوۃ العلماء میں فضیلت کا امتحان دینے میں مصروف تھے، علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کا والا نامہ پہنچا کہ ''امتحان کے بعد تم سیدھے دارالمصنّفین آجاؤ، تم ہمیں قرآن سناؤ اور میں تمہیں قرآن پڑھاؤں۔'' (۱) چنانچہ فراغت کے بعد وہ دارالمصنّفین آ گئے۔ ۱۴/نومبر ۱۹۴۴ء کو سید صاحب نے ۳۵/روپئے ماہوار پر دارالمصنّفین کا رفیق مقرر کیا۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۶۶ء یعنی دارالمصنّفین سے جبری علاحدگی تک وہ مطالعہ و تحقیق اور تصنیف و تالیف میں مسلسل مصروف رہے۔ واقعہ یہ ہے کہ تصنیف و تالیف کے لئے انہوں نے منفرد اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کیا اور ان پر مضامین و مقالات اور کتابیں لکھیں۔ مثلاً ہندوستان کے چند نومسلم اکابر کے احوال و آثار کے مطالعہ و تحقیق کا ماہنامہ معارف میں سلسلہ انہیں نے قائم کیا۔ خدمت حدیث میں خواتین کے حصہ اور خدمات کی نشاندہی انہوں نے ہی شروع کی۔ ''صاحب تصانیف سلاطین'' جیسا منفرد موضوع جس پر آج تک کوئی قابل ذکر کتاب نہیں لکھی جا سکی، حضرۃ الاستاذ ہی کا کارنامہ ہے۔ فتاوی عالمگیری کے مؤلفین، فساد زمانہ اور عموم بلوہ اور اجتہاد اور تبدیلی احکام جیسے اہم اور منفرد موضوعات پر داد تحقیق آغاز شباب میں ان کے علمی کمالات کے نمونے ہیں۔ ۱۹۵۱ء میں معرکۃ الآراء کتاب ''اہل کتاب صحابہ و تابعین'' ان کے قلم سے نکلی۔ وہ بھی ایک منفرد موضوع پر مشتمل ہے۔ غرض حضرۃ الاستاذ نے اچھوتے اور منفرد موضوعات کا انتخاب کر کے اور ان پر مسلسل داد تحقیق دے کر اردو دنیا میں بلند رتبہ اور جلیل القدر

عالم و مصنف کا مقام حاصل کر لیا اور اس حیثیت سے ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

حالات کی ستم ظریفی دیکھئے جو قلم دور طالب علمی سے علم و تحقیق میں سرگرم تھا ۱۹۶۶ء میں اسے دارالمصنّفین سے علاحدہ ہو کر جامعۃ الرشاد کے لئے یکسو ہونا پڑا۔ اس کے نتیجہ میں وہ عرصہ تک تصنیف و تالیف سے دور رہے، تاہم تصنیف و تالیف کا خیال ان کے دل سے نہ گیا اور انہوں نے جامعۃ الرشاد میں اولاً دارالتالیف والترجمہ قائم کیا۔ اس کے بعد فروری ۱۹۸۱ء میں ماہنامہ الرشاد جاری کیا اور اس قلم کو رواں کیا جو کئی برس سے حالات کی ناسازگاری کا شکار تھا۔ اس دفعہ وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ میدان علم اور تصنیف و تالیف میں آئے اور وہ بڑے بڑے علمی و فقہی کارنامے انجام دئے جس کی داد ہندوستان و پاکستان کے صاحب فضل و کمال نے دی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب پاکستان میں عنان اقتدار جنرل محمد ضیاء الحق [۱۹۲۴-۱۹۸۸ء] کے پاس تھی اور انہوں نے نفاذ شریعت کے لئے جدوجہد شروع کی اور ایک فقیہہ وقت مولانا سید محمد متین ہاشمی [۱۹۲۷-۱۹۹۲ء] اور دیگر علماء و مشائخ سے نفاذ شریعت کے لئے ملاقاتیں کیں۔ مولانا سید محمد متین ہاشمی بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔ شریعت پر ان کی بڑی گہری نظر اور اصول و قوانین اسلام کے وہ بڑے واقف کار تھے۔ انہوں نے پاکستان میں نفاذ شریعت کے لئے جدوجہد کی۔ متعدد کتابیں سپرد قلم کیں اور متعدد فقہی کتابیں اور ان کے ترجمے دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور سے جس کے وہ ڈائرکٹر تھے شائع کئے۔

انہیں حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی کی فقہی بصیرت کا پورا ادراک تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان کے رسالہ ''مسئلہ کفائت'' کو بڑے اہتمام سے دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے شائع کیا۔ اس رسالہ پر انہوں نے جو دیباچہ لکھا ہے، اس سے حضرۃ الاستاذ سے ان کے گہرے شغف اور ان کے علوئے مقام و مرتبہ سے واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی اطال اللہ بقاءہ کی شخصیت برصغیر پاک و ہند کے علمی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد خوش قسمتی سے مولانا موصوف کو حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی سرپرستی میں دارالمصنّفین اعظم گڑھ یوپی میں کام کرنے کا موقع ملا۔ ایک تو خود مولانا کا ذاتی

ذوق وشوق، علمی صلاحیت اور ثقاہت طبع، اس پر سے علامہ ندوی کی سر پرستی اور تربیت، مولانا کی صلاحیتوں کو خوب خوب جلا ملی، آپ نے ماہنامہ معارف میں نہایت بلند پایہ اور تحقیقی مقالے لکھے اور جلد ہی آپ کا شمار برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے محققین میں ہونے لگا۔ آپ نے متعدد علمی و تحقیقی کتابوں کے علاوہ کم و بیش دوسو گراں قدر مقالے بھی لکھے ہیں۔''(۲)

مولانا سید محمد متین ہاشمی نے مولانا مرحوم کی علمی خدمات کے ذکر کے بعد ان کی تعلیمی اور مذہبی و دینی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دارالمصنّفین کے بعد مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے ایک بڑا دینی ادارہ شہر اعظم گڑھ یوپی میں جامعۃ الرشاد قائم کیا، جس میں فی الحال کئی سو طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ گذشتہ سال راقم الحروف کو اس عظیم دینی درس گاہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا۔ طلبہ کے ڈسپلن، دینداری، علمی شغف اور ذوق و شوق دیکھ کر روح خوش ہوگئی۔ .... یہ بات نہایت مسرت افزا ہے کہ روایتی عربی درجات درجہ حفظ و قرأت، جونیئر ہائی اسکول اور اسلامی نرسری اسکول کے ساتھ ساتھ طلبہ کو دستکاری سکھانے کا بھی انتظام ہے اور علوم قدیم کے ساتھ ساتھ جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ اس ادارے میں ایک دارالتالیف والترجمہ بھی قائم ہے اور یہاں سے ایک بلند پایہ علمی و تحقیقی ماہنامہ الرشاد شائع ہوتا ہے۔ یہ سب اللہ کے فضل و کرم سے حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی کی مخلصانہ مساعی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا موصوف کی ان کوششوں کو قبول فرمائے۔''(۳)

مولانا سید محمد متین ہاشمی مخطوطات کی جمع و تدوین کے لئے دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے وابستہ ہوئے تھے، مگر اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ اس کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ مولانا مجیب اللہ ندوی کو دیال سنگھ ٹرسٹ سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''مرکز تحقیق دیال سنگھ لائبریری کو فخر ہے کہ مولانا ندوی صاحب جیسے مخلص اور عظیم محقق کی نظر کرم اس علمی ادارے پر ہے اور مولانا موصوف اکثر اپنے رشحات

قلم سے ادارے کو نوازتے رہتے ہیں۔'' (۴)

اس تعلق اور پاکستان میں نفاذ شریعت کی ضروریات کے پیش نظر انہوں نے حضرۃ الاستاذ کی ۵؍اہم اور بلند پایہ فقہی کتابیں دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے شائع کیں۔ یہاں ان کتابوں کے تعارف وتذکرہ، اہمیت وافادیت کے ساتھ پاکستان میں ان کی اشاعت کے اسباب اور مولانا مجیب اللہ ندوی کی شخصیت اوران کے فضل وکمال کا ذکر مولانا سید محمد متین ہاشمی کی تحریروں کی روشنی میں واضح کیا جاتا ہے۔

دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور نے اولاً رسالہ ''مسئلہ کفاءت'' ۱۹۸۴ء میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت کے اسباب بیان کرتے ہوئے مولانا سید محمد متین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''مسئلہ کفاءت کی اشاعت بھی ادارہ کے ساتھ مولانا کے علمی تعاون کا ایک اظہار ہے۔ اس مسئلہ کے بعض پہلوؤں کے بارے میں مولانا موصوف کی رائے سے خالص حنفی نقطہ نظر کے تحت اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے، تاہم چونکہ یہ مسئلہ آج ہمارے معاشرے کا اہم ترین مسئلہ ہے، اس لئے اس پر مکالمہ ہونا چاہئے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس رسالے کے مطالعہ کے بعد پاکستان کے دیگر قارئین بھی ہماری طرح مولانا موصوف کے زور استدلال، منطقیت اور تبحر علمی کے قائل ہوجائیں گے۔'' (۵)

اس رسالہ کی اشاعت کے کیا اثرات مرتب ہوئے اوراس پر کس نوع کی گفتگو ہوئی اس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔

اسلام نے مزدوروں کے حقوق طے کردئے ہیں۔ پسینہ خشک ہونے سے پہلے ان کی اجرت ادا کردینی ضروری ہے۔ اس کے واضح احکامات ہیں، تاہم یہ کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ اس موضوع پر علمائے اسلام نے قلم نہیں اٹھایا۔ حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور ''اسلامی قانون اجرت'' جیسی اہم، اچھوتی اور معرکۃ الآراء کتاب لکھی، جسے مولانا سید محمد متین ہاشمی نے دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور سے ۱۹۸۸ء میں شائع کیا اور لکھا کہ:

''آج دنیا کے غریب، محنت کش عوام، سرمایہ داری اور اشتراکیت کی چکی کے دو پاٹ کے درمیان پس رہے ہیں اور دنیا کے عظیم مفکر حیران و پریشان ہیں کہ اس مشکل کا کیا حل ہے، راہ سجھائی نہیں دیتی۔ پیچیدگی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ امت مرحومہ جسے قرآن نے خیر امۃ کا لقب دیا ہے اور دنیا کی قیادت و سیادت کی ذمہ داری سونپی ہے، آگے آئے اور غریب محنت کش طبقے کو رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ وہ عادلانہ نظام بخشے جو ہر درد کی دوا اور ہر عقدہ لاینحل کے لئے ناخن تدبیر ہے۔

زیر نظر کتاب ''اسلامی قانون اجرت'' اسی جہت میں ایک کوشش ہے۔ محنت کی عظمت، محنت کش طبقے کی بہبود، اس کے مسائل کا قرآن وسنت کی روشنی میں حل، اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات، فقہائے امت کے استنباطات اور ان کے نافذ کرنے کے طریقوں پر اس کتاب میں بالتفصیل بحث کی گئی ہے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس کتاب سے پہلے اس موضوع پر دنیا کی معروف زبانوں میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے اور یہ پہلی کتاب ہے۔ اس وقت جب کہ ملک (پاکستان) میں نفاذ شریعت کا عمل جاری ہے، ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ارکان حکومت کے لئے بالخصوص اور محنت کش طبقات کے لئے بالعموم یہ کتاب نہایت مفید ثابت ہوگی۔''(۶)

دیال سنگھ ٹرسٹ سے مولانا کی تیسری کتاب فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین شائع ہوئی۔ یہ بھی اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر اردو اور فارسی زبان میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی۔ مولانا نے تاریخ اور فقہ و فتاویٰ کی کتب سے انتہائی تلاش و تفحص کے بعد یہ کتاب سپرد قلم کی تھی۔ چنانچہ مولانا ہاشمی نے دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور سے اسے فخریہ شائع کیا اور لکھا کہ:

''برصغیر جنوبی ایشیا میں عرصہ دراز تک فتاویٰ عالم گیری کے مطابق مسلم عدالتوں کے فیصلے ہوتے رہے۔ برطانوی دور حکومت میں بھی محمڈن لا کے سلسلے میں اس

کتاب کو درجہ استناد حاصل تھا۔ اتنے عظیم کارنامے کی انجام دہی میں جن علماء نے حصہ لے کر اتنے بڑے صدقہ جاریہ کا اہتمام کیا انہیں جاننا اور انہیں یاد رکھنا ملت کا مقدس فریضہ ہے، کیونکہ جو قومیں اپنے محسنوں کو فراموش کر دیتی ہیں، ماضی سے ان کا رشتہ منطقع ہو جاتا ہے اور وہ جمود وخمول کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اسی مقصد کے تحت برصغیر جنوبی ایشیا کے معروف صاحب قلم حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی نے بہت عرصہ پہلے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے چند حواشی کی تحریک پر ''فتاویٰ عالم گیری کے مؤلفین'' کے حالات وسوانح جمع کر کے معارف میں شائع کرنا شروع کیا اور حضرت علامہ نیز اس وقت کے دیگر اکابر نے ان کے اس علمی کام کو بے حد پسند کیا تھا۔ اتنا وقیع علمی کام ۱۹۴۴ء سے معارف کے پرچوں میں منتشر پڑا ہوا تھا۔ الحمدللہ کہ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی نے مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کو یہ سعادت بخشی ہے کہ وہ مولانا موصوف کے اس عظیم علمی و تحقیقی کارنامہ کو کتابی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ اس علمی تعاون اور مہربانی کے لئے ہم مولانا مجیب اللہ ندوی کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو صحت وسلامتی کے ساتھ حیات دراز عطا فرمائے، تاکہ مرکز تحقیق کے ساتھ ان کا یہ تعاون عرصہ دراز تک جاری رہے۔'' (۷)

چنانچہ مولانا مجیب اللہ ندوی کا تعاون عرصہ دراز تک دیال سنگھ ٹرسٹ سے جاری رہا۔ ''فتاویٰ عالم گیری کے مؤلفین'' کے بعد ان کی انتہائی اہم اور معرکۃ الآراء کتاب ''اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام'' ٹرسٹ نے ۱۹۸۸ء میں شائع کی۔ یہ کتاب بھی اپنے موضوع پر لاثانی ہے۔ اس کا سبب تالیف بیان کرتے ہوئے مولانا مجیب اللہ ندوی تحریر فرماتے ہیں:

''آج سے تیس برس پہلے ڈاکٹر احمد محمصانی صبحی کی کتاب کا اردو ترجمہ پاکستان میں چھپا، جس میں انہوں نے اولیات عمر کی مثالیں دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ کتاب وسنت کے منصوص احکام میں حکومت وقت کو تبدیلی کرنے کا حق ہے، جیسا کہ بہت سے معاملات میں حضرت عمرؓ نے کیا۔ اس کتاب کو پڑھ

کر علماء میں مولانا محمد جعفر پھلواروی صاحب مرحوم اور مولانا محمد حنیف مرحوم وغیرہ نے اور کچھ نئے تعلیم یافتہ حضرات نے کئی مضامین اور کتابیں لکھ ڈالیں، جن میں یہ موضوع مشترک رہا۔ حکومت کو حالات کے لحاظ سے نہ صرف اجتہادی مسائل میں بلکہ منصوص احکام میں بھی تبدیلی کا حق ہے۔ خاص طور پر حکومت کے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے جو پرچہ المعارف کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں اور رسالہ فکر ونظر وغیرہ میں اس طرح کے مضامین برابر آتے رہے۔''(۸)

ان تجدد پسند مجتہدین کے جواب میں حضرت مولانا نے ۵۷-۱۹۵۶ء میں ماہنامہ معارف میں مضامین لکھے تھے۔ ''اجتہاد اور تبدیلی احکام'' دراصل انہیں کا مجموعہ ہے۔ مولانا مرحوم کے ان مضامین کو بے حد پسند کیا گیا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے فرمایا کہ یہ بہت ضروری کام ہے، دوسرے کاموں کو چھوڑ کر آپ اس پر لگ جائیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا کہ آپ پورے ندوہ کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔(۹) خود مولانا مجیب اللہ ندوی نے لکھا ہے کہ:

''جن لوگوں نے ان[تجدد پسندوں] کے خلاف مضامین لکھے ان میں راقم الحروف نے بھی ان کے جواب میں معارف اعظم گڑھ اور صدق جدید میں متعدد مضامین لکھے۔ خاص طور پر ان حضرات کے اس نقطہ نظر پر مفصل تنقید کی گئی کہ ''کتاب وسنت کے صریح احکام حالات ومصلحت کے تحت اجتہاد سے بدلے جاسکتے ہیں۔''(۱۰)

نعیم صدیقی نے چراغ راہ لاہور کا اسلامی قانون نمبر شائع کیا تو مولانا مرحوم کے اس سلسلہ کے تمام مضامین کو شامل کیا۔ بعدازاں افادیت کے پیش نظر مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ نے ۱۹۸۸ء میں اسے بھی اہتمام سے کتابی صورت میں شائع کیا۔ مولانا سید محمد متین ہاشمی نے مولانا مجیب اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس کارنامے کا اعتراف اور مبارکباد دیتے ہوئے لکھا کہ:

''میں مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب اطال اللہ بقاءہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس اہم ترین مسئلے پر قلم اٹھا کر عصر حاضر میں شریعت اسلامیہ کی بہت

بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔اس سلسلے میں جن مفاسد کے پیدا ہونے کا امکان تھا ،مولانا محترم نے اس کا بخوبی جائزہ لے کر نہایت محققانہ انداز میں ان کا سد باب کیا ہے۔مولانا محترم کی اس عظیم کوشش کو مرکز تحقیق [ریسرچ سیل] دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور کی طرف سے شائع کرنے میں ہم نہایت فخر محسوس کرتے ہیں اور دیگر اہل قلم کو دعوت دیتے ہیں کہ مولانا کی اس کتاب کو بنیاد بنا کر کام کو آگے بڑھائیں۔''(۱۱)

اکتوبر ۱۹۵۷ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی طلبہ یونین کی طرف سے مولانا مرحوم کو ''اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات'' کے موضوع پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ چنانچہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں [۱۹۰۲-۱۹۷۹ء] کی صدارت میں مولانا نے یہ مقالہ پیش کیا، چونکہ یہ اپنے موضوع پر پہلی تحریر تھی، اس لئے علی العموم پسند کی گئی۔۵۰-۵۲ صفحے کا یہ مقالہ اس وقت ماہنامہ معارف میں شائع نہ ہوسکا اور ایک عرصہ بعد فروری ۱۹۸۱ء میں جب الرشاد جاری ہوا تو اس میں بالاقساط شائع ہوا، جسے اہل فکر ونظر نے نہ صرف سراہا بلکہ کتابی صورت میں شائع کرنے کی فرمائش کی۔اسی زمانہ میں منہاج لاہور کے مدیر مولانا سید محمد متین ہاشمی نے اسے منہاج میں نقل کیا اور پھر حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی سے کتابی صورت میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ مولانا نے نظر ثانی کی تو یہ ۱۶۳ر صفحے کی کتاب ہوگئی، جسے دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور نے ۱۹۹۰ء میں کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہ اپنے موضوع پر ایک منفرد تحریر تھی۔ خود مصنف نے اس کی انفرادیت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''جس وقت راقم الحروف نے اس موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے مضمون لکھا تھا اس موضوع پر اردو یا عربی یا کسی اور زبان میں کوئی کتاب سامنے نہیں آئی تھی۔ اس کے کئی سال بعد ۱۹۶۴ء شیخ ابوزہرہ مرحوم کی کتاب العلاقات الدولیہ چھپی جو راقم کو ۱۹۶۹ء میں حج کے سفر میں ملی، جسے خرید کر ساتھ لایا۔ پھر ۱۹۸۴ء میں ایک کتاب الاسلام والعلاقات الدولیہ ڈاکٹر محمد صادق عفیفی کی چھپی۔نظر ثانی میں قرآن وحدیث اور سیرت وتاریخ کی کتابوں سے مزید فائدہ اٹھانے کے ساتھ

ان کتابوں سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے۔''(۱۲)

اس کتاب کی اولیت کا ذکر مولانا سید محمد متین ہاشمی نے بھی کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''بین الاقوامی تعلقات (International Relation) تو آج کل ہماری یونیورسٹیوں کا ایک اہم ترین شعبہ ہے، مگر جہاں تک مجھے علم ہے اردو اور انگریزی زبانوں میں اسلام کے بین الاقوامی تعلقات کے موضوع پر کوئی کتاب کم از کم میری نظر سے نہیں گذری اور یہ کتاب یقیناً اور حتماً اردو میں پہلی کتاب ہے۔ اس کتاب میں مولانا موصوف جزئیات کو زیر بحث نہیں لائے بلکہ موضوع کے صرف مبادی اور اصولوں پر نہایت مدلل اور مفید بحثیں کی ہیں۔ آگے چل کر انہی مبادی اور اصولوں کو بنیاد بنا کر تفصیلی کام کیا جا سکتا ہے۔ اب یہ کام نوجوان محققین کا ہے کہ وہ غور وفکر کریں، ریسرچ کریں اور اس موضوع کو متعارف کرائیں تا کہ موجودہ مہذب دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ دین اسلام موجودہ نام نہاد نظام ہائے حیات سے ہزار گنا زیادہ فائق اور ترقی یافتہ ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ دین کے عطا کردہ نظام میں نہ جھوٹی چمک دمک ہے، نہ وہ ملمع کاری ہے، جس سے آج کی نوجوان نسل بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ اخیر میں میں یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ مولانا موصوف کی یہ کتاب بقامت کہتر وبقیمت بہتر کی مصداق ہے۔ ملت اسلامیہ کو ان کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے علوم اسلامیہ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔''(۱۳)

حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی کو ان کی زندگی میں ان کے علم وفضل، تلاش وتفحص اور تحقیق وتدقیق اور بلند پایہ تصنیفات کی وجہ سے بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے مشاہیر اہل علم وقلم مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مفتی ظفیر الدین ندوی، مولانا محمد احمد پرتاپ گڑھی اور دور آخر میں مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی وغیرہ کی تحسین وستائش کم اہم نہیں، تاہم مولانا سید محمد متین ہاشمی کا خراج ملاحظہ ہو:

''میرا خیال ہے کہ مرکز تحقیق [ریسرچ سیل] دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری کی مطبوعات کا مطالعہ کرنے والے برصغیر پاک و ہند کے عظیم محقق اور صاحب قلم حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی کی شخصیت سے ناواقف نہیں ہوں گے۔ ان کی متعدد گراں قدر تصنیفات مثلاً اجتہاد اور تبدیلی احکام، فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین، اسلامی قانون محنت و اجرت، مسئلہ کفائت وغیرہ ہمارے مرکز سے شائع ہو چکی ہیں اور ان کتابوں نے کافی حد تک پاکستان کے باذوق قارئین کو متاثر کیا ہے۔ مولانا کی تحریروں میں سب سے بڑی خوبی سلاست اور روانی کے ساتھ اورجنلٹی (Originality) اور اہم ترین موضوعات پر تحقیق ہے۔ مولانا موصوف گھسے پٹے راستوں پر نہیں چلتے بلکہ ہمیشہ ایسے موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں جن پر دور حاضر کے کسی محقق کی نظر نہ گئی ہو۔ اس طرح تحقیق کا ایک نیا باب وا ہوتا ہے اور نئی نسل کے اسکالر (Scholar) کو کام کرنے کے مواقع میسر ہوتے ہیں اور ان کے جذبہ تحقیق کو مہمیز ملتی ہے۔'' (۱۴)

بلاشبہ حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی کے علمی و عملی بالخصوص فقہی کارناموں سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مدد ملی۔ واقعہ یہ ہے کہ دینی مسائل کے حل میں ان کی تحریروں کا بڑا اہم اور نمایاں حصہ ہے۔ یہی نہیں پاکستان میں نفاذ شریعت کی کوششوں میں بھی حضرۃ الاستاذ کی تصانیف کا یک گونہ حصہ ہے۔ افسوس ہے کہ ان کے بلند پایہ کارناموں کو اب تک تحقیق و تصنیف کا موضوع نہیں بنایا جا سکا ہے۔

حوالے

(۱) نقوش زندگی ص ۷۰
(۲) مسئلہ کفاءت ص ۱
(۳) مسئلہ کفاءت ص ۱-۲
(۴) مسئلہ کفاءت ص ۲

(۵) مسئلہ کفاءت ص۲

(۶) اسلامی قانون اجرت تقدیم ص ۷

(۷) فتاویٰ عالم گیری کے مؤلفین ص ۷-۸

(۸) اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام ص ۷

(۹) ایضاً ص ۸

(۱۰) کاروان رفتگاں ص ۲۵

(۱۱) اجتہاد اور تبدیلی احکام ص ۶

(۱۲) اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات دیباچہ ص ۱۱

(۱۳) ایضاً ص ۴

(۱۴) ایضاً ص ۳

[۶]

چند ساعت مولانا شاہ عبدالحلیم جونپوریؒ کی خدمت میں

مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوریؒ (م: ۲۷/اپریل ۱۹۹۹ء) ہندوستان کے مایہ ناز عالم دین اور ممتاز مشائخ میں تھے۔ راہ تصوف وسلوک کے بڑے سالک اور شیخ وقت تھے۔ مشہور بزرگ حضرت شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ مجاز بیعت وارشاد تھے۔ ان کی وفات کے بعد اپنے استاذ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے رجوع فرمایا، جو علم وعمل کا پہاڑ تھے۔ خود مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوریؒ علم وفضل کے بلند مقام پر فائز تھے۔ ان کا دل اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت سے سرشار تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے جذب وشوق میں خود کو مٹاڈالا تھا۔ بقول مولانا مجیب اللہ ندویؒ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کا یہ شعر ان کے ورد زبان رہا کرتا تھا:

میں تو نام و نشاں بھلا بیٹھا تھا
شہرہ کس نے اڑا دیا میرا

مولانا شاہ عبدالحلیم رحمۃ اللہ علیہ موضع دیوریا ضلع فیض آباد (موجودہ ضلع امبیڈکرنگر) میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ عین العلوم ٹانڈہ میں تحصیل علم کے بعد ۱۹۲۸ء میں مظاہر علوم سہارن پور میں داخل ہوئے۔ پانچ برس تحصیل علم کے بعد ۱۹۳۳ء میں فراغت پائی۔ تکمیل کے بعد مادر علمی میں دو برس تدریسی خدمات انجام دیں۔ بعدازاں ۱۹۳۵ء میں جون پور کے قصبہ مانی کلاں کے ایک مکتب سے وابستہ ہوئے، جسے انہوں نے ترقی دے کے ایک مدرسہ بنادیا۔

مولانا مرحوم ایک عرصہ تک مانی کلاں میں مدرس اول رہے۔ ان سے بے شمار طالبان علوم نبوت نے اپنی تشنگی بجھائی۔ وہ ایک بڑے مربی تھے اور اس کا انہیں خاص سلیقہ تھا، یہی وجہ ہے

کہ وہ طلبہ کی ترتیب پر خاص توجہ فرماتے تھے۔ مانی کلاں کے قیام میں بعض ناعاقبت اندیشوں نے عرصہ حیات تنگ کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے مانی کلاں کو خیر باد کہہ دیا اور چند میل کے فاصلہ پر ۱۹۷۳ء میں موضع گوریني میں ایک دینی درس گاہ مدرسہ عربیہ ریاض العلوم کی بنیاد رکھی۔ جدوجہد اور اخلاص کی بدولت اس ادارے نے بڑی ترقی کی اور اس سے بے شمار طلبہ نے اپنی علمی تشنگی سرد کی۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور اب مولانا مرحوم کے لائق فرزند محترم مولانا عبدالرحیم مظاہری اس ادارے کی ترقی کے لئے ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ اللہ تعالی ان کی عمر میں برکت دے۔

مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوریؒ کی ذات بابرکات سے ملت کو بڑا فائدہ پہنچا۔ انہوں نے علوم دینیہ کی ترویج وترقی اور اشاعت کے لئے ریاض العلوم کو مرکز بنا کر بڑی وسعت دی اور اس میں مختلف شعبے قائم کئے اور انہیں بحسن وخوبی چلایا۔ علوم دینیہ خاص طور پر قرآن وحدیث کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ ان کی زندگی کا دوسرا روشن اور تابناک پہلو اصلاح باطن اور تزکیہ نفس ہے۔ ان کی ذات سے بے شمار اشخاص نے روحانی فیض پایا۔ شیخ القراء مولانا قاری محمد اسماعیل صاحب مدظلہ العالی کی بدولت ریاض العلوم کے شعبہ قرأت نے ملک گیر شہرت حاصل کی۔ قاری صاحب کا مقام ومرتبہ بہت بلند ہے۔ اصلاً وہ شیخ القراء اور استاذ القراء ہیں۔ وہ نہ صرف روایت حفص بلکہ قرأت وسبعہ وعشرہ کے بھی ماہر فن قاری ہیں اور باریکیوں پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ ان کا شمار عالم اسلام کے ممتاز قراء میں ہونا چاہئے، مگر ان کی عزلت پسندی، گوشہ نشینی اور نام ونمود سے دوری کے سبب انہیں وہ شہرت نہیں مل سکی، جس کے اصلاً وہ مستحق ہیں۔

قاری صاحب نے مدۃ العمر قرآن پاک سے شغف رکھا۔ بے شمار طلبہ کو حفظ قرآن اور فن قرأت کی تعلیم دی۔ وہ صاحب تصنیف ہیں۔ فن قرأت میں ان کی کتابیں افادیت کے لحاظ سے بے نظیر کتابیں ہیں۔ راقم کو ان سے شرف اخلاص ونیاز حاصل ہے۔ انہیں کی حوصلہ افزائی کی بدولت راقم کی پہلی کتاب ''اسہل التجوید'' مع ''علم الترتیل'' نوعمری میں شائع ہوئی اور انہیں کی دعاؤں کے طفیل یہ دونوں رسالے مقبول بھی ہوئے۔

جزی اللہ بالخیرات عنا ائمہ

لنا نقلوا القرآن عذبا و سلسلا

حضرت قاری صاحب سے ملاقات کے لئے ایک دوبارریاض العلوم گرینی میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔اس زمانہ میں مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب رحمۃ اللہ سے ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ کہیں باہر تشریف لے گئے ہوئے تھے۔دوبارہ دو بچوں کے داخلہ کے لئے حاضر ہوا۔مہتمم مولانا عبدالرحیم مظاہری صاحب نے یہ کہہ کر کہ اب گنجائش نہیں ہے منع کردیا۔اب میں نے تہیہ کیا کہ حضرت مولانا مرحوم سے ملاقات کرکے اپنی غرض پیش کروں گا۔یقین تھا کہ استدعا خالی نہیں جائے گی۔چنانچہ بعدعصر مولانا مرحوم کی مجلس میں حاضر ہوا۔حضرت مولانا قاری محمداسماعیل صاحب مدظلہ العالی نے حضرت شاہ صاحب سے میرا تعارف کرایا۔شاہ صاحب نے آمد کی وجہ دریافت کی، جواب سے پہلے مولانا عبدالرحیم مظاہری مہتمم پرنظر پڑی تو دیکھا کہ وہ خشمگیں نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور فرمارہے ہیں کہ جگہ نہیں ہے،جگہ نہیں ہے۔میں نے مولانا مرحوم سے کہا کہ ''مولانا اس میں ایک بچہ جس کو داخلے کے لئے لایا ہوں اس کے خاندان میں آج تک کسی شخص نے دینی تعلیم تو کجا کسی طرح کی تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور پورا خانوادہ تعلیم وتربیت سے بے بہرہ ہے۔بڑی مشکل سے میں نے اس کے گھر والوں کو راضی کیا ہے۔اب داخلہ نہیں ہوتا ہے تو یقینی طور پر یہ بچہ تعلیم سے محروم رہ جائے گا۔مولانا میری ذمہ داری تھی کہ اسے تعلیم کے لئے یہاں تک لے آؤں میں نے اپنا فرض پورا کیا۔کل قیامت کے دن میں یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جاؤں گا کہ اسے میں نے مدرسہ ریاض العلوم کے گیٹ تک پہنچادیا تھا، بقیہ حساب مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب سے لیا جائے۔

میں جس وقت یہ جملہ ادا کررہا تھا حاضرین مجلس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ مجھے نگل جائیں گے،مگر میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب میری طرف متوجہ ہیں اور بڑے غور سے میری باتیں سن رہے ہیں۔ایک ذراسی خاموشی کے بعد فرمایا،مولوی عبدالرحیم ان بچوں کا داخلہ کرلو۔چنانچہ دونوں بچوں کا داخلہ ہوگیا۔میں تھوڑی دیر ان کی مجلس میں بیٹھا رہا۔بڑی پرسکون اور پررونق مجلس تھی۔ایسا محسوس ہورہا تھا کہ نور کی بارش ہورہی ہے اور سکینت نازل ہورہی ہے۔اٹھنے کا جی نہیں چاہتا تھا،مگر اعظم گڑھ واپس آنا تھا،مجبوراً حضرت مولانا کی مجلس کو خیرباد کہا اور اعظم گڑھ چلا آیا۔یہ مولانا مرحوم سے میری پہلی اور آخری ملاقات تھی،جس

کی حلاوت میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔اللہ ان کی قبر کونور سے بھر دے۔اب مدارس کا دامن بھی ایسی نورانی شخصیات سے خالی ہے۔سچ ہے زمین کھا گئی آسماں کیسے کیسے

مولانا شاہ عبدالحلیم صاحبؒ سے دلی مناسبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اور میرے استاذ مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم کے پیر بھائی تھے اور دونوں میں تعلق اور رسم وراہ بھی تھی۔دونوں تصوف وسلوک کے دلدادہ تھے۔دونوں نے حضرت شاہ وصی اللہؒ سے تصوف وسلوک کی منازل طے کیں۔ دونوں کا مشن ایک تھا۔دونوں نے اپنی زندگیاں ملت کے لئے وقف کردی تھیں۔دونوں نے مدرسہ قائم کیا۔دونوں نے رسالہ جاری کیا۔ایک نے الرشاد جاری کیا تو دوسرے نے ریاض الجنہ۔ان دونوں رسائل میں میرے مضامین بھی چھپے ہیں۔ریاض الجنۃ میں تو دوایک مضامین طبع ہوئے البتہ ماہنامہ الرشادتو میری تمام تر صلاحیتوں کا آئینہ دار ہے۔غرض دونوں بزرگوں میں مجھے اخلاص وللہیت کے جوہر یکساں نظر آئے۔اللہ تعالی ان کے درجات بلند کرے۔

دوسری وجہ شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جون پوریؒ کا ان سے شرف تلمذ ہے، جو علامہ شبلی کے بڑے قدر شناس تھے۔ان کی بلکہ ان جیسے اور بہت سے اہل دل اور صاحب تصوف وسلوک کی تعلیم وتربیت مولانا شاہ عبدالحلیمؒ کا ایک کارنامہ ہے۔

۲۷/اپریل ۱۹۹۹ء کو جب مولانا شاہ عبدالحلیم جون پوریؒ نے وفات پائی تو استاذ گرامی حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم بہت مضطرب اور بے چین ہوئے۔ان پر اس حادثہ فاجعہ کا ہفتوں اثر رہا اور وہ ان کا بار بار ذکر کرتے رہے۔ماہنامہ الرشاد میں ان پر بڑا پراثر وفیاتی نوٹ لکھا جواب ان کے وفیاتی مضامین کے مجموعہ ''کاروان رفتگاں''میں شامل ہے، جسے راقم الحروف نے مرتب کر کے ۲۰۰۷ء میں مع اشاریہ شائع کیا۔

مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب بہت شریف اور نیک دل تھے۔ان کی نیکی اور شرافت ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی۔ان کی مجلس قدما کی مجلسوں کی یادیں تازہ کردینے والی تھی۔یہی وہ لوگ ہیں جن سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

[۷]

حکیم محمد ایوب ندویؒ

حکیم محمد ایوب مرحوم [۱۹۲۴-۲۰۰۴ء] ہندوستان کے اطبائے حاذقین میں بڑے بلند رتبہ شخص تھے۔ یہی نہیں کہ وہ طبابت کے میدان میں ان کی حذاقت کا عام شہرہ تھا بلکہ ان کی نیکی، شرافت، مروت اور وضع داری کی خوشبو بھی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اپنے متنوع امتیازات اور خصوصیات کی بنا پر عزت وشہرت اور نیک نامی کے دولت ان کے حصہ میں آئی۔ ان کی مسیحائی، دلنوازی اور پرکشش شخصیت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ ان کی طبی، انسانی اور دین کے لئے عملی کوششوں اور کاوشوں کو ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

وہ بلریا گنج [ضلع اعظم گڑھ] کی خاک سے اٹھ کر یتیمی کے باوجود دارالعلوم ندوہ پہنچے۔ مولانا شبلی فقیہ اور مفتی سعید ندوی کی سرپرستی میں عالمیت کی سند ندوہ سے حاصل کی۔ پھر طب کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے اور لکھنو کے تکمیل الطب کالج سے سند لی۔ تکمیل کے بعد وطن واپس آئے اور پھر پوری زندگی بلریا گنج میں طبابت کے پیشے میں نیک نامی کے ساتھ گزار دی۔ ہزاروں لاکھوں افراد ان کی مسیحائی اور مسیحانفسی سے فیض یاب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دست شفا سے نوازا تھا۔ بیماروں اور مریضوں کا ایک جم غفیر ان کے مطب میں ہر وقت ہوتا تھا۔ ان کے دست شفا کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ دور دراز مقامات سے سفر کر کے ان سے علاج کے لئے بلریا گنج آتے۔ باوجود اس کے انہوں نے پیشہ طبابت کو حصول دولت دنیا کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ ہمیشہ راضی بہ رضا رہے اور مریضوں سے شفقت ومحبت اور ہمدردی کا معاملہ کیا۔ دراصل وہ محض ایک طبیب نہ تھے بلکہ ان کی ذات اعلیٰ انسانی اور اسلام کی اخلاقی قدروں کی حامل تھی۔ ان کا دل رحم دلی، عنایت، مروت ومحبت کے جذبات سے لبریز تھا۔ وہ خود عالم باعمل تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند اور شریعت پر سختی سے عمل پیرا رہے۔ تحریک اسلامی سے گہری وابستگی نے ان کے ذوق علم وعمل میں

وارفتگی پیدا کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مطب کی شدید مصروفیات کے باوجود وہ دعوت وتبلیغ کے لئے کسی قدر وقت ضرور فارغ کر لیتے اور اس میں حصہ لیتے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کی مطب کی مصروفیات بھی دعوت وتبلیغ کا ایک حصہ تھی۔ ان کی دلوں میں اثر کر جانے والی تبلیغی کوششوں کا بڑا ذریعہ دراصل ان کا مطب ہی تھا جہاں وہ اسلام کی عملی تبلیغ کیا کرتے تھے۔

ان کی کتاب زندگی کا ایک ورق ان کا ذوق مطالعہ اور کتب بینی سے عبارت تھا۔ بلاناغہ مطالعہ کرتے۔ اچھی کتابوں بالخصوص دعوت وتبلیغ سے متعلق کثرت سے کتابیں خریدتے۔ خود پڑھتے۔ لوگوں تک پہنچاتے اور بعض کتب خانوں کو بھی عنایت کرتے اور اس پر ایک بڑا سرمایہ صرف کرتے تھے۔

حکیم جی میں تصنیف وتالیف کی بھی صلاحیت تھی مگر طبابت کی مصروفیات نے اس کی طرف متوجہ ہونے کا موقع نہیں دیا۔ تاہم ان کی ایک کتاب ''معالجاتی مشاہدات'' یادگار ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر اطباء نے سیکڑوں کتابیں لکھی ہیں مگر حکیم جی کی یہ کاوش بوجوہ منفرد اور قابل ذکر کتاب ہے۔

حکیم جی جماعت کے قدیم بزرگوں کی طرح اعلی اخلاقی محاسن کے حامل اور شب زندہ دار تھے۔ عقائد، عبادات اور معاملات میں جمہور علماء امت کے ہم نوا تھے اور اس میں کسی طرح کا لوچ نہیں رکھتے تھے۔ جامعۃ الفلاح کے ایک ممتاز استاذ اور نامور عالم مولانا محمد عنایت اللہ اسد سبحانی صاحب مدظلہ نے رجم کے سلسلے میں جمہور کے موقف کے برعکس ایک نیا نقطہ نظر پیش کیا اور حدیث کی عظمت کو تار تار کرنے کی کوشش کی تو حکیم صاحب نے بڑا سخت رویہ اختیار کیا۔ نہ صرف اپنی ذاتی مجلسوں میں اس کی تردید کی بلکہ ایک کتابچہ ''ایک فکری فساد اور اس کا علاج'' لکھ کر ان کے موقف کی تردید کی۔ اس کتاب سے ان کے وسیع مطالعے اور رسوخ فی العلم کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے نظریہ کی حمایت میں جو دلائل وبراہین پیش کئے اور جس طرح استدلال کیا ہے، وہ ایک پختہ اہل قلم اور عالم ومحقق کا نقش قائم کرتا ہے۔ بلاشبہ حکیم صاحب کی اسلامیات پر گہری نظر تھی۔ طب اور طبابت کے پیشے نے ان کے جوہر علمی پر پردہ ڈال دیا، ورنہ وہ اس میدان میں بھی نمایاں ہوتے۔ بطور نمونہ ایک اقتباس ملاحظہ ہو، جس سے ان کی تحریری صلاحیت کے ساتھ گہرے

تاریخی شعور کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ مطالعہ کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''قوتِ مطالعہ قدرت کا انمول عطیہ ہے۔ جو شخص صلاحیتِ مطالعہ سے محروم ہے اس کا وجود ایک زندہ لاش کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ مطالعہ انسان کی فطرت ہے۔ ہر شخص خواہی نہ خواہی مطالعہ پر مجبور ہے۔ انسانی زندگی پر مطالعہ ہی کی کارفرمائی ہے۔ انسان کے بناؤ اور بگاڑ میں مطالعہ اور صرف مطالعہ ہی کا ہاتھ ہے۔ جس طرح فاسد ہوا فاسد پانی اور فاسد غذا کے استعمال کا نتیجہ صحت انسانی کے بگاڑ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، اسی طرح فاسد مطالعہ کے نتیجہ میں انسانی فکر و عمل کے بگاڑ کا ظہور ہوتا ہے۔ خواہ وہ فاسد ماحول کا مطالعہ ہو یا فاسد لٹریچر کا۔''

(میرا مطالعہ ص ۲۱۹)

''حقیقت رجم'' پر راقم الحروف نے ماہنامہ الرشاد میں تبصرہ لکھا اور مصنف کے موقف پر تنقید کی، اس تبصرے کے بعد اہل علم نے اس کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ اس کی تردید و تصحیح میں کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ہمارے دوست ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کی کتاب ''حقیقت رجم: ایک تنقیدی جائزہ'' اور برادرم مولانا انیس احمد فلاحی مدنی کی کتاب ''تحقیق سے تحریف تک'' اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔ راقم نے ان کتابوں پر بھی تبصرہ لکھا تو حکیم صاحب نے میرے ان تبصروں کی تعریف و تحسین کی اور ایک خط جو حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی رحمۃ اللہ کے نام تھا، اس میں انہوں نے میرے موقف کو سراہا اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس خوردنوازی پر راقم حیرت زدہ نہ ہوا کہ یہ حکیم صاحب کا امتیاز تھا کہ وہ خوردوں کے ساتھ محبت اور سیر چشمی کا معاملہ کرتے تھے۔

جامعۃ الفلاح سے ان کا بڑا گہرا اور جذباتی تعلق تھا۔ وہ اس مکتب کے فیض یافتہ تھے جس نے جامعۃ الفلاح کی شکل اختیار کی۔ گویا وہ ان کی مادر علمی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بقا و ترقی میں انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس ادارے سے جب رجم کا معاملہ اٹھا تو وہ بڑے کبیدہ خاطر ہوئے۔ اسے ایک فکری فساد قرار دیا اور یہ دعا مانگی:

''اے مالک! جامعۃ الفلاح بلریا گنج کا قیام فکر مودودی اور تحریک اسلامی کے فروغ کے لئے ہوا تھا۔ مالک اس کے طلبہ و طالبات کو انکار حدیث، انکار سنت

اور خارجیت سے بچا۔‘‘

اس دعا سے حکیم جی کی دینی حمیت وغیرت کے ساتھ جامعۃ الفلاح سے ان کے جذباتی تعلق کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دراصل وہ جامعۃ الفلاح کو تحریک اسلامی کا نمائندہ ادارہ تصور کرتے تھے اور اس میں کسی طرح کی کمی اور حرف گیری برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ وہ آخر تک تحریک اسلامی سے وابستہ رہے۔ حالانکہ جماعت بڑے انقلابات اور نشیب وفراز سے گذری، تقسیم وطن کا حادثہ پیش آیا، جماعت دو ملکوں میں تقسیم ہوئی، کئی اہم اکابر جماعت سے علاحدہ ہوئے، لیکن حکیم محمد ایوب صاحب کے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش یا لرزش پیدا نہیں ہوئی۔ اصلاً وہ استقامت کا ایک دیو پیکر تھے۔ عہدہ ومنصب سے دور انہوں نے تحریک اسلامی کی خدمت بنیاد کے اس پتھر کی طرح کی جس کا ظاہری وجود گرچہ مٹ جاتا ہے، تاہم اصل عمارت اسی پر قائم و دائم رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس نیک بندہ اور خادم قوم وملت کے اعمال کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

---

[۸]

مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ

یادیں، باتیں اوراحسانات

مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ [۱۹۳۷-۲۰۰۸ء] مرحوم سابق ناظم دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کو میں نے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ برسوں ان کا ساتھ رہا۔ان کے ساتھ ملک میں کئی سیمیناروں میں شرکت کا موقع ملا۔ میں شہادت دے سکتا ہوں کہ مولانا مرحوم واقعی بہت بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ بڑے عالم اورادیب وانشاء پرداز تھے۔ان سب سے بڑھ کران میں پندارنام کونہ تھا۔شرافت،مروت،نیکی اوروضع داری کے وہ پتلے تھے۔۲۲-۲۳ سال ان کی معیت میں رہے اورکبھی ان کےقول وفعل میں تضادنہیں پایا۔اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے۔اوراعلی علیین میں جگہ دے۔

میں۱۹۸۴ء میں دارالمصنّفین کتابت سیکھنے آیا تھا۔سیداقبال احمد مرحوم [م: ۱۹۸۸ء] کتابت اسکول کے استاذ تھے اور میرے بھی۔کتابت اسکول معارف پریس کے پاس ایک کم کشادہ کمرے میں قائم تھا، جو اصلاً دارالمصنّفین کا باہری حصہ تھا۔ہم لوگ وہیں آتے اور وہیں سے واپس چلے جاتے۔کتب خانہ جانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ایسارعب ودعب تھااوردل میں ایسی عظمت بیٹھی ہوئی تھی کہ شعبہ علمی کی طرف جانے سے گھبراتے تھے۔ یہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم [۱۹۱۱-۱۹۸۷ء] کی نظامت کا زمانہ تھا۔انہوں نے دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کو علمی وعملی ہرطرح سے ترقی دینے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ وہ بارہ، تیرہ برس عملاً دارالمصنّفین کے ناظم رہے۔متعدداہم تاریخی کتابیں لکھیں اوررفقائے دارالمصنّفین سے بھی لکھوائیں اوران کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔کتابوں کی طباعت واشاعت کے لئے اچھےاچھے مشین مین لکھنؤ سے بلوائے۔ پریس کولیتھو سے واٹڈائپ کرایااوربعض کتابوں مثلاً سیرۃ النبی اورشعرالعجم کی طباعت

کے لئے مستقل پلیٹیں تیار کرائیں اور ان پر بڑا پیسہ صرف کیا۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنے گھر سے کبھی براہ راست کتب خانہ آجاتے اور پھر کچھ دیر بعد دفتر چلے جاتے یا پھر اپنے برآمدے میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے اور وہاں سے اٹھ کر دفتر پھر کتب خانہ آتے۔ان کا بڑا دبدبہ اور احترام تھا۔ بڑے صاحب کہے جاتے تھے۔ان کے بعد دارالمصنّفین کی دوسری بڑی شخصیت مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ صاحب کی تھی۔ میں ان سے پہلی بار کب ملا اور کیوں کر ملا یاد نہیں آتا۔البتہ کتابت سیکھنے کے چند ماہ بعد میں کتابت اسکول سے ناطہ توڑ کر اپنے گاؤں واپس چلا آیا تھا۔ایک دن مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کا پیغام ملا کہ آ کر مل لیں۔حاضر ہوا تو کتابت کے لئے اپنی کتاب ''تذکرۃ المحدثین'' جلد سوم کا مسودہ دیا۔یہیں سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب سے اصلاً تعلقات کا آغاز ہوا۔اس کا پہلا ایڈیشن میرا ہی کتابت کیا ہوا ہے۔ یہ میری پہلی کتاب تھی جس کی میں نے نہ صرف کتابت کی بلکہ بہت غور سے پڑھ کر معلومات بھی حاصل کیں۔ بہت اچھی کتاب ہے۔معلومات کے لحاظ سے بھی اور اسلوب کے لحاظ سے بھی۔

چند ماہ بعد مولانا نے دوبارہ بلوایا اور ایک شیعہ شاعر جو قم ایران میں رہتے تھے اور اردو میں دادِ سخن دیتے تھے کا مجموعہ کلام کتابت کے لئے دیا اور کہا کہ آفسیٹ کے مطابق کتابت کر دیں۔میں اس فن سے واقف نہ تھا، تاہم معلومات حاصل کر کے اس کی بھی کتابت کی اور وہ ایران سے شائع ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں ایک شاعر اور ایک ملک ایران دونوں کا تعلق شیعیت سے ہے، مولانا مرحوم کے ذریعہ واقفیت ہوا۔ یہاں یہ عرض کرتا چلوں کہ مولانا مرحوم میں ذرا بھی عصبیت نہ تھی۔ان کے تعلقات ہر مکتب فکر اور ہر طرح کے مسالک کے لوگوں سے قائم تھے۔ یہ دراصل دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی وسیع المشربی ہے، جس نے ہر ایک کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔میرا بھی مختلف مسالک اور مکاتب فکر سے واسطہ رہا ہے اور آج بھی ہے، مگر میں نے آج تک کسی ایک شخص کو بھی دارالمصنّفین پر نقد کرتے نہ دیکھا اور نہ سنا، بلکہ ایسی عزت وعظمت کسی ادارے کی نہیں دیکھی۔

۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۶ء کے سال میرے لئے خاصے پریشان کن رہے اور مجھے بڑی دقتوں کا

سامنا کرنا پڑا، تاہم ہجوم غم میں شادمانی کا ایک پہلو یہ نکل آیا کہ اسی سال میری پہلی ناچیز کتاب اسہل التجوید شائع ہوئی، جس کو لے کر میں مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم کے پاس گیا اور معارف میں تبصرے کے لئے دیا۔ اس زمانہ میں معارف میں وہی تبصرے کرتے تھے۔ کاتب کو مصنف کی شکل میں دیکھ کر مولانا کو بڑا استعجاب ہوا اور انہوں نے مجھ سے چند معمولی سوالات کئے، پھر میں واپس آ گیا۔ بظاہر وہ مطمئن نہیں لگے، مگر چند ماہ بعد معارف میں ان کے قلم سے ''اسہل التجوید'' پر تبصرہ شائع ہوگیا۔ کتاب کے تعارف کے ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ نوجوان مصنف دارالمصنّفین کے شعبہ کتابت سے وابستہ ہیں۔ دارالمصنّفین سے تعلق کا یہ پہلا ذکر تھا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ تبصرے کی دوسری خاص بات ان کی دعا تھی۔ **اللھم زد فزد**. قاری محمد اسماعیل صاحب مدظلہ کے بعد یہ دوسرے بزرگ تھے جنہوں نے مجھے دعا دی تھی۔ یہ تبصرہ مہینوں میں لوگوں کو دکھاتا پھرا، حالاں کہ اس میں تعارف کے سوا کچھ نہ تھا۔ اب خیال کرتا ہوں تو ہنسی آتی ہے کہ اس وقت جس تحریر کو میں فخریہ لوگوں کو دکھاتا تھا، وہ لوگ میرے جانے کے بعد مجھ پر ضرور ہنستے رہے ہوں گے مگر میرے لئے تو یہ بات بہت بڑے افتخار کی تھی کہ میری معمولی کتاب کا ذکر نامور اہل قلم مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ کے قلم سے معارف میں آ گیا تھا۔

۱۹۸۹ء میرا ایم.اے کا پہلا سال تھا۔ رزلٹ بہت اچھا یعنی ۷۲% فی صد تھا۔ مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ صاحب بے حد خوش ہوئے اور لوگوں سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ دراصل کتابت سے ایم.اے تک کا سفر ان کی آنکھوں میں تھا۔ اس دوران ان کی شفقتیں بہت بڑھ گئیں مگر میں ان سے احتراماً دور ہی رہتا۔ ایم.اے. کے بعد Ph.D کے آخری مرحلہ میں میرے گائڈ ایک ناقابل ذکر سبب کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہوئے تو مولانا ہی کی شخصیت سامنے آئی اور انہوں نے میرے گائڈ سے کہا کہ جس طالب علم کے مقالات معارف میں شائع ہوتے ہوں آپ اس سے کہتے ہیں تمہیں لکھنا نہیں آتا۔ یہ کہنا تھا کہ انہوں نے میرے مقالے پر فوری طور پر مہر تصدیق ثبت کی اور مجھے .Ph.D کی ڈگری تفویض ہوئی۔ یہ مقالہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا ہے۔ مولانا مرحوم میری علمی سرگرمیوں سے بے حد خوش ہوتے تھے۔ اسی زمانہ (فروری ۱۹۸۹ء) میں میرا ایک مضمون ''علامہ شبلی کی سیرۃ النبی'' کے عنوان

سے معارف میں شائع کیا تو اس پر یہ نوٹ بھی لکھا کہ:

> ''الیاس اعظمی ایک ہونہار نوجوان ہیں اور شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج سے علامہ شبلی پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ معارف کا مقصد ہونہار اور باصلاحیت نوجوانوں کی حوصلہ افزائی اور علمی تربیت بھی ہے، اس لئے یہ مضمون شائع کیا جارہا ہے اور آئندہ بھی ان کے مضامین شائع ہوں گے''۔(معارف فروری ۱۹۸۸ء ص ۹۸)

مولانا مرحوم کی یہ تحریر میرے لئے ایک سند تھی اور علمی دنیا سے یہ میرا پہلا تعارف تھا جو مولانا ضیاءالدین اصلاحی مرحوم کے قلم سے معارف کے صفحات کی زینت بنا۔اس کے بعد انہوں نے میرے متعدد مقالات شائع کئے اور ہر مقالے پر وہ پہلے سے زیادہ خوش ہوتے اور مفید مشورے دیتے۔آخری مقالہ جوان کی ادارت میں شائع ہوا، وہ فروری ۲۰۰۸ء کا شمارہ ہے، جس کی اشاعت سے پہلے ایک سڑک حادثہ میں انہوں نے وفات پائی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔ یہ مقالہ ''عہد حاضر میں علامہ شبلی کی تجویزوں اور منصوبوں کی معنویت'' کے عنوان سے تھا۔اس میں نادانستہ دارالمصنّفین پر تنقید بھی تھی۔ان کی وسعت ظرفی دیکھئے کہ نہ برا مانا اور نہ مقالہ رد کیا بلکہ اسے ایک طویل نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔اس نوٹ سے بھی ان کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔میں ایک معمولی طالب علم لیکن انہوں نے میرے نقد کا احترام کیا اور جواب لکھا اور اس طرح لکھا کہ میرے اوپر کسی طرح کی تنقید نہیں کی بلکہ اس کا اعتراف کیا اور اس کے اسباب بھی بیان کئے۔اب ایسی صالح اور پاکیزہ فکر رکھنے والے مدیر بھی ملک میں خال خال ہی ملیں گے۔یہ نوٹ خاص طور پر قابل ذکر ہے:

> ''یہ اپنی نوعیت کا انوکھا مقالہ ہے، جس میں حیات شبلی اور خود علامہ مرحوم کے مکاتیب کی مدد سے ان کے عزائم اور منصوبوں کو از سر نو بڑے سلیقے سے مرتب کیا گیا ہے، جس کے لئے لائق مقالہ نگار داد وتحسین کے مستحق ہیں، مگر یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ علامہ مرحوم کے عہد اور موجودہ عہد میں اب بہت تغیر ہو چکا ہے۔ اس وقت جن چیزوں کے لئے حالات ساز گار تھے اب نہیں رہ گئے ہیں۔زمانہ

کے حالات بدلنے سے نئے تقاضے اور ضرورتیں سامنے آتے ہیں اور ان کے مطابق ترجیحات بھی بدلنی پڑتی ہیں۔

ہندوستان خصوصاً شمالی ہندوستان میں بدلے ہوئے حالات میں شبلی نیشنل اسکول بلکہ اب شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے لئے مؤخر الذکر منصوبے کو بہ روئے کار لانا آسان نہیں ہے۔ فارسی زبان کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے بغیر اچھی اردو نہیں لکھی پڑھی جاسکتی، مگر اسے تو مدارس نے بھی ختم کر دیا۔ نئے مضامین کی کثرت وضرورت کی وجہ سے فارسی کے لئے گنجائش نکالنا مشکل ہوگیا ہے، تاہم شکایت بجا ہے اور کالجوں اور مدرسوں دونوں کو اس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ناموران اسلام کے سلسلے میں جوفرماں روایان اسلام علامہ مرحوم کے پیش نظر تھے، ان پر براہ راست نہ سہی لیکن تاریخ اسلام اور تاریخ دولت عثمانیہ پر دارالمصنّفین میں جو کام ہوا ہے اس سے اس کی کسی حد تک تلافی ہوئی ہے۔ خود ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں اکثر فرماں رواؤں کے عہد میں جو مشاہیر علم گذرے ہیں ان پر دارالمصنّفین کا کام وقیع ہے۔

علوم اسلامیہ کی تاریخ وتدوین اور ہر ہر فن کے اکابر ومشاہیر کے سوانح قلم بند کرنا بھی علامہ مرحوم کے منصوبے میں شامل تھا۔ اس سلسلے کی کئی کتابوں کا مقالہ نگار نے ذکر کیا ہے، مگر بعض ناموں کا ذکر رہ گیا ہے۔ جیسے سیرۃ عمر بن عبدالعزیز، سیرت عائشہؓ اور اگر اس دائرے کو وسیع کریں تو حیات شبلی اور حیات سلیمان کو بھی اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

علم کلام اور جدید فلسفہ کے علاوہ اصل اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے مشاہیر کے حالات بھی قلم بند کئے گئے ہیں۔ تاہم اب بھی بہت سارے کام تشنہ تکمیل ہیں، جن کی طرف بجا طور سے مقالہ نگار نے توجہ دلائی ہے۔ جو کرنے کے کام رہ گئے ہیں اس میں وسائل کی کمی ہی نہیں افراد کی کمی بھی مانع بنی

ہے۔مقالہ نگار نے خود علمی بد مذاقی کا بار بار ذکر کیا ہے۔اولاً تو پتہ مار کام کرنے اور جامع کمال اشخاص کا فقدان ہے اور جو ہیں بھی ان کو تن آسانی اور شہرت و ناموری کی طلب اس طرف راغب نہیں ہونے دیتی۔''

(ماہنامہ معارف، فروری ۲۰۰۸ء)

میری علمی و ادبی سرگرمیاں دیکھ کر وہ مجھے دارالمصنّفین کے علمی کاموں میں لگاتے اور سرپرستی کرتے رہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد پروفیسر سید عزیز الدین حسین نے حواشی مولانا ابوالکلام آزاد کا سہارا لے کر مضامین عالم گیر اور علامہ شبلی پر سخت تنقیدیں کیں تو اس کا جواب لکھنے کے لئے انہوں نے میرا انتخاب کیا۔ چنانچہ میں نے پہلی بار جوابی تنقید انہی کی سرپرستی میں لکھی۔ رسالہ جامعہ دہلی نے اسے شائع کرنے میں تاخیر کی تو خود مولانا نے اسے معارف میں شائع کیا۔ بعد میں جامعہ نے بھی اسے شائع کر دیا۔اسے علی العموم پسند کیا گیا،مگر اس میں مولانا ابوالکلام آزاد پر بھی نقد تھا، اس لئے ہمارے بزرگ پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی مرحوم نے انہیں مراسلہ لکھا، جسے انہوں نے معارف میں شائع کیا اور اس پر نوٹ لکھ کر خود ہی ان کا جواب بھی دیا۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ پروفیسر شروانی نے مجھ پر سخت تنقید کی تھی، مگر میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی اور نہ جواب لکھا۔ چنانچہ شروانی صاحب نے مجھے ذاتی طور پر ایک خط لکھا اور ان کی شفقت دیکھئے کہ انہوں نے لکھا کہ الیاس صاحب جس طرح میں اپنے موقف سے دست بردار نہیں ہوسکتا، اسی طرح آپ کو بھی اپنے موقف پر جمے رہنے کا حق ہے۔ جواب اور جواب الجواب میں اب ایسی شرافت اور وضع داریاں شاید ہی مل سکیں۔شروانی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔انہوں نے بھی وقتاً فوقتاً میری بڑی حوصلہ افزائی کی۔اور میری ۱۷ کتابوں پر طویل تنقیدی تبصرے لکھے ہیں اور اس قدر کثرت سے لکھے ہیں کہ اگر انہیں جمع کروں تو ایک کتابچہ تیار ہو جائے گا۔

مراسلات کا ذکر آ گیا ہے تو ایک اور متنازع مراسلہ کا ذکر سنتے چلیں۔ ڈاکٹر محمد صہیب الہ آبادی کا ماہنامہ معارف میں ایک مقالہ شائع ہوا جو محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی مرتبہ مصنف عبدالرزاق پر تھا۔مصنف عبدالرزاق کے سلسلہ میں مولانا الاعظمی اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ

کے درمیان اختلاف نظر تھا اور دونوں کے درمیان مراسلہ نگاری ہوئی تھی اور پھر بغیر کسی نتیجہ پر پہنچے خاموشی ہوگئی تھی اور دونوں نے خیال کیا تھا کہ غالبًا ان کا موقف قابل پذیرائی رہا۔ یہ مراسلت میری نظر میں تھی، چنانچہ میں نے ڈاکٹر محمد صہیب صاحب کے مقالہ پر مدیر معارف کو ایک مراسلہ لکھ کر اس بحث کو دوبارہ شروع کرنے کی کوشش کی کہ آیا معاملہ کیا ہے اور محققین کو اس کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس مراسلہ کے جواب میں محدث جلیل کے نواسے ڈاکٹر مسعود الاعظمی نے ایک مضمون لکھا جو معارف میں شائع ہوا، یہ مضمون جب اشاعت کی غرض سے آیا تو مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ اسے پڑھ لیجئے۔ مجھے اس تحریر سے بڑی تکلیف ہوئی۔ بڑے نازیبا انداز میں قلم بند کیا گیا تھا۔ میں نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا، مگر مولانا نے شاید میرے چہرے کی لکیریں پڑھ لیں تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ زبان و بیان اچھا نہیں ہے، اس لئے واپس کر دیتا ہوں۔ میں نے کہا آپ ان سے بات کر لیں اور زبان و بیان درست کر کے شائع کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور جب انہوں نے مراسلہ شائع کیا تو میں نے ایک اور مراسلہ لکھ دیا۔ مولانا نے اسے بھی شائع کیا، مگر اس پر یہ نوٹ بھی لکھا کہ اسی مراسلہ پر اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس نوٹ کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں انہوں نے میرے موقف کی تائید کی تھی۔ میرے دونوں مراسلے محدث جلیل کے غالی عقیدت مندوں کو سخت ناگوار گذرے۔ مجھے گالیاں دی گئیں۔ خطوط آئے۔ اس میں ایک خط ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی صاحب کا بھی تھا۔ انہوں نے لکھا کہ:

> ''چند ماہ پیشتر ڈاکٹر مسعود الاعظمی کے مضمون کے حوالہ سے آپ کا جو مراسلہ معارف میں شائع ہوا اس میں آپ کا لب ولہجہ اہل علم کے شایان شان نہیں ہے۔ خاص طور پر مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے متعلق آپ کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ان کے علوئے مرتبت سے ناآشنا ہیں، حالاں کہ وہ آپ کے ممدوح مولانا سید سلیمان ندوی کے ممدوح ہیں''۔

اس خط سے پہلی بار مجھے عصبیت کا اندازہ ہوا۔ آپ خود سوچیں ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے مولانا شبلی کی ''سیرۃ النبی'' پر محض تنقید نہیں کی بلکہ ان کے خلاف پوری کتاب لکھی اور اسے ہندو و پاک سے شائع کرایا اور ایک عرصہ تک مجلّہ ترجمان الاسلام بنارس میں ان کی تنقیدات کا سلسلہ

قائم رہا۔اس وقت نہ انہیں کسی کے مقام کا خیال آیا اور نہ مرتبے کا۔خود لکھیں تو تنقید، دوسرے لکھ دیں تو تنقید اور مقام ومرتبہ سے نا آشنائی۔یہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے۔ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ میں نے سوائے اس کے کہ مصنف عبدالرزاق اور معمر ابن راشد کے سلسلہ میں جو دلائل سامنے آئے تھے،ان پر ایک بار پھر سے بحث ہو اور کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔محدث جلیل کی عظیم المرتبت شخصیت پر مری جرأت نہیں کہ حرف گیری کرسکوں اور اگر کسی نوع کا نقد آ بھی جائے تو اس سے محدث جلیل کی عظمت پر کہاں سے حرف آئے گا۔؟

بعد ازاں ہمارے دوست مولانا عمیر الصدیق ندوی نے اپنی ناراضی ظاہر کی۔شاید مئو سے فون کر کے آگاہ کیا گیا تھا۔میں نے ان سے کہا کہ آپ ڈاکٹر صہیب کا مضمون، میرا مراسلہ، پھر ڈاکٹر مسعود کا مضمون اور میرا دوسرا مراسلہ سب دیکھ لیجئے اور پھر مجھے بتایئے کہ میں نے محدث جلیل کی شان میں کیا گستاخی کی ہے۔انہوں نے معارف منگوا کر سب تحریریں دیکھیں اور پھر خاموش ہو گئے۔میں نے ان تمام باتوں کا ذکر مولانا ضیاءالدین صاحب سے کیا تو وہ بہت ناراض ہوئے کہ لوگ علمی معاملات میں اس سطح پر اتر آتے ہیں۔میں نے ان سے کہا کہ مولانا یہ تو ہونا ہی تھا جب اختلاف کی سزا ڈاکٹر حمید اللہ جیسے محقق کو خام مستشرق سے متاثر کہہ کر دی گئی تو میں کیا اور میری بساط کیا۔

مولانا ضیاءالدین صاحب کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر وفن پر متعدد مقالات لکھے۔جسے وہ معارف میں شائع کرتے رہے۔۲۰۱۶ء میں میرے عزیز دوست ڈاکٹر جمشید احمد ندوی[صدر شعبہ عربی ممبئی یونیورسٹی] نے معارف کی شبلی شناسی پر ایک مقالہ لکھا تو اس میں یہ بات لکھ کر کہ علامہ شبلی سے متعلق میرے سب سے زیادہ مقالات معارف کی زینت بنے ہیں خود مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔یہ سب مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی شفقتوں کی بدولت ممکن ہوا۔

مولانا مرحوم نے معارف کے لئے صرف مقالات ہی نہیں لکھوائے، ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی کی وفات پر وفیات لکھوائی، ڈاکٹر محمد سہیل شفیق کے اشاریہ پر تقریظ لکھوائی۔وہ ان سب کو نہ صرف شائع کرتے بلکہ ان کی تعریف وتحسین بھی کرتے رہتے اور جب ان کی شفقتوں کی خبریں

میرے کانوں تک پہنچتی تھیں تو میرا سینہ فخر سے کشادہ ہو جاتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہی ہمارے آئیڈیل اور وہی دبستان شبلی کی آبرو تھے۔

ایک دن کہنے لگے کہ علامہ شبلی کی کتاب ''اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر'' دارالمصنّفین سے کبھی شائع نہیں ہوئی۔ میری خواہش ہے کہ اسے اہتمام سے شائع کیا جائے۔ میں ابھی ندوہ گیا تھا، مولانا مرتضٰی صاحب نے اس کی اشاعت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے تحقیق ومراجعت کے بعد شائع کیا جائے۔ آپ یہ کام کر دیں تو کتاب شائع ہو جائے۔ میں فوراً ہی بخوشی تیار ہو گیا۔ ان کے چہرے سے محسوس ہوا کہ وہ بھی خوش ہوئے۔ شاید ان کا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اب میں رات دن اس میں لگ گیا۔ سب سے پہلے ماہنامہ الندوہ لکھنو میں شائع شدہ اس کی قسطیں حاصل کیں۔ پھر کتاب کا وہ ایڈیشن جو علامہ شبلی کی زندگی میں امرت سر سے چھپا تھا۔ یہی نہیں اس کے کئی ایڈیشن ہندو پاک سے حاصل کئے۔ پھر اس کے حوالوں کو اصل کتابوں سے ملا کر درست کیا۔ فارسی عبارتیں اور بعض اشعار غلط چھپ رہے تھے۔ انہیں درست کیا۔ بعض ضروری فارسی عبارتوں کا ترجمہ بھی کیا۔ غرض جہاں تک بن پڑا اس کی تصحیح وتحقیق میں کوشش کی۔ پھر مولانا مرحوم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس دن ان کی خوشی دیدنی تھی۔ بہت خوش ہوئے، پھر اسے انہوں نے کمپوز کرایا اور مجھ سے کہا کہ پروف بھی تم ہی کو دیکھنا ہے۔ کتاب جب فائنل ہو گئی تو اطلاع ملی کہ اسے طباعت کی غرض سے دہلی بھیجا گیا ہے۔ شاید یہ پہلی کتاب تھی جو معارف پریس اعظم گڑھ میں چھپنے کے بجائے دہلی سے چھپی اور جب کتاب چھپ کر آ گئی تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ دیباچہ میں مولانا مرحوم نے میرا ذکر اس طرح کیا تھا گویا کسی بہت پڑھے لکھے شخص نے تحقیق ومراجعت کا کام انجام دیا ہو۔ میرے لئے یہ بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ انہوں نے کیا لکھا ہے:

> ''چوں کہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی، اس لئے بعض کتب فروشوں نے اس کے بہت معمولی، سستے اور گھٹیا قسم کے نسخے شائع کئے۔ جنہیں دیکھ کر ہمیں تو شرمندگی ہو ہی رہی تھی، علامہ مرحوم کی روح کو بھی اس سے بڑی اذیت پہنچتی رہی ہوگی۔ اس لئے کتاب کے صحیح اور محقق ایڈیشن کے لئے میری فکر وتشویش اور بڑھ گئی۔

اتفاقاً ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی سے اس کا ذکر آیا تو محسوس ہوا کہ وہ اس کی تحقیق و
مراجعت کے لئے پہلے سے آمادہ تھے۔ ان کو علامہ شبلی اور دارالمصنّفین سے قلبی
تعلق ہے۔ وہ بچپن سے کتب خانہ دارالمصنّفین سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔
ابھی حال ہی میں علامہ شبلی پر ان سے والہانہ تعلق کی بنا پر پی. ایچ. ڈی کی ڈگری لی
ہے۔ علامہ شبلی دارالمصنّفین اور دوسرے موضوعات پر ان کے علمی مضامین ہندو
پاک کے رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد الیاس نے سرکاری ملازمت کی مصروفیت کے باوجود اس کام کو
بڑی محنت سے انجام دیا، جس سے اغلاط کی تصحیح ہوگئی اور اصل مراجع سے
مراجعت کر کے انہوں نے حوالوں کی تخریج بھی کر دی اور جہاں ضرورت محسوس
کی فارسی عبارتوں کے ترجمے کر دیئے۔''

یہ کتاب اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر اور مولانا کا مقدمہ میں مہینوں اپنے احباب کو دکھاتا اور خوش ہوتا رہا۔''اس کے بعد انہوں نے''موازنہ انیس و دبیر'' تحقیق و مراجعت کے لئے دے دی۔ میں اس میں تقریباً ایک سال مصروف رہا۔ الحمدللہ یہ کام بھی پسند کیا گیا۔ خود مولانا مرحوم بہت خوش ہوئے اور لکھا کہ:

''ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کو مولانا شبلی سے بڑی عقیدت اور دارالمصنّفین سے عشق
ہے۔ ان کا خاص موضوع تحقیق یہی ہے اور وہ اس کے ہر کام میں پیش پیش رہتے
ہیں۔ انہیں جب میری پریشانی کا علم ہوا تو انہوں نے بڑی خوشی سے تصحیح و
مراجعت کی ذمہ داری قبول کر لی اور بڑی محنت و جانفشانی سے یہ کام انجام دیا اور
جہاں تک بن پڑا اشعار کی صحت کے لئے مراجع ومصادر کھنگالے، اور کاپیوں اور
پروف کی تصحیح بھی دلچسپی سے کی۔ اس کے لئے میں ان کا شکر گزار ہوں۔''

اس تصحیح و مراجعت کے بعد میں نے'' موازنہ انیس و دبیر'' پر ایک مفصل مقالہ لکھا جو ماہنامہ معارف میں شائع ہوا اور اب قدرے ترمیم اضافہ کے ساتھ میری کتاب'' آثار شبلی'' میں شامل ہے۔

مولانا مرحوم ہم لوگوں کو کسی کام پر لگا کر خود یکسو نہیں ہو جاتے تھے بلکہ وہ اس کی رہبری اور رہنمائی کرتے رہتے اور میں ان کے پاس جب کسی دشواری کو لے کر جاتا وہ فوراً ہی کوئی حل پیش کر دیتے۔ وہ صرف ان علمی معاملات تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ ذاتی مسائل و معاملات کی بھی خبر گیری کرتے اور مفید مشورے دیتے۔ میری سرکاری ملازمت کا مسئلہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ اب اپنی ذمہ داری اٹھایئے اور کتب خانہ میں آ جایئے۔ میں نے سرکاری ملازمت کا قصہ گوش گذار کیا اور کہا کہ مولانا دارالمصنّفین کی خدمت کرنا میری دلی آرزو ہے۔ اب یہ ایک نیا مرحلہ سامنے آ گیا ہے۔ آپ ہی فیصلہ کر کے بتائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا اب آپ کل آیئے تو غور کر کے بتاؤں گا۔ دوسرے دن ان کے پاس پہنچا تو جاتے ہی انہوں نے کہا کہ آپ سرکاری ملازمت اختیار کر لیجئے۔ یہی آپ کے لئے بہتر ہوگا اور میں نے ان ہی کے کہنے پر سرکاری ملازمت اختیار کی۔ گو میرا دل ہمیشہ دارالمصنّفین ہی میں لگا رہتا اور جونہی مدرسہ سے فرصت ملتی میں دارالمصنّفین حاضر ہو جاتا۔

میں پہلے اپنے گاؤں مہراج پور میں رہتا تھا۔ دو مرتبہ شدید بیمار پڑا۔ دونوں مرتبہ وہ عیادت کے لئے گاؤں آئے۔ ایک بار ہاسپٹل میں داخل تھا۔ وہاں بھی عیادت کے لئے آئے اور بڑی تسلی دی۔ میں نے کہا آپ کو زحمت نہیں کرنی چاہئے تھی۔ کہنے لگے آپ اسپتال میں تھے یہ بات مجھے پریشان کئے ہوئے تھی۔ اب دیکھ لیا تو اطمینان ہو گیا۔ جلدی سے ٹھیک ہو کر آ جایئے۔ ابھی بڑے کام کرنے ہیں۔ خدا جانے وہ کون سے کام تھے، کبھی دریافت کرنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی، حالاں کہ میں بہتوں کے مقابلہ میں ان سے زیادہ بے تکلف تھا۔

ملازمت کے بعد میرے دارالمصنّفین پہنچنے کے معمولات میں کچھ تبدیلی ضرور آ گئی تھی، لیکن پہنچنا ضرور تھا۔ اس زمانہ میں خدا جانے انہیں کیا ہوا وہ اکثر کہتے آپ یہاں آ کر اپنا اور رفقائے دارالمصنّفین کا قیمتی وقت برباد کرتے ہیں۔ میں نے ایک بار ہمت کر کے تردید کی، مگر وہ نہ مانے، لیکن کچھ ہی دنوں بعد لوگوں سے کہنے لگے کہ الیاس محنت کرتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ ملازمت کے بعد شاید لکھنے پڑھنے کا ان کا مشغلہ کم ہو جائے گا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ دراصل جب انہوں نے دیکھا کہ میرے مضامین و مقالات پہلے ہی کی طرح شائع ہو رہے ہیں تو ان کے رخ

میں تبدیلی آئی۔

ابتداء میں میں کتب خانہ سے کتابیں گھر لے کر چلا جاتا تھا، مگر کسی نے مولانا مرحوم کی توجہ ادھر مبذول کرائی تو اس پر پابندی لگ گئی۔ چنانچہ میں رفقائے دارالمصنّفین اور اپنے احباب مولانا عمیر الصدیق ندوی اور برادر مکرم مولانا عارف عمری کے نام پر کتابیں جاری کرانے لگا۔ کچھ دنوں بعد کسی کرم فرمانے یہ بات بھی ان تک پہنچا دی۔ چنانچہ اس پر بھی قدغن لگی، گو میرے دوست مولانا عمیر الصدیق ندوی اس کے بعد بھی اصرار پر کتابیں عنایت کر دیتے، مگر پھر مولانا نے مجھے بلا کر سختی سے روکا۔ مجھے تکلیف تو بہت ہوئی مگر صبر کر لیا۔ دراصل اس زمانہ میں کتب خانہ کا جائزہ لیا گیا تھا اور بہت سی کتابیں غائب ملی تھیں، اس لئے سختی بہت بڑھ گئی تھی۔ خیر اب دشواری ہونے لگی اور اس زمانہ میں مولانا آ کر رجسٹر چیک کرتے اور خاص طور پر رفقاء کے کالم دیکھتے کہ کوئی کتاب نکالی تو نہیں گئی ہے۔ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، میں نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ ناظر کتب خانہ برادرم سلیم جاوید سے کہا کہ مولانا رفقاء کے کالم چیک کرتے ہیں، اپنا تو چیک نہیں کرتے۔ اب ان ہی کے نام سے کتابیں دے دیا کرو۔ سلیم ہچکچائے، مگر میری محبت غالب رہی، چنانچہ کئی ماہ تک ان ہی کے نام پر کتابیں ایشو ہوتی رہیں، مگر ایک روز تو یہ راز کھلنا ہی تھا اور کھلا۔ بظاہر مولانا بہت ناراض ہوئے، مگر یہ کہہ کر کہ سب باز آ جائیں مگر ڈاکٹر صاحب نہیں باز آ سکتے۔ اس لئے اب ان ہی کے نام کتابیں ایشو کر دیا کرو۔ اس طرح میرا یہ مسئلہ حل ہوا، مگر پھر میر تقرر مدینہ نگر ہو گیا اور یہ قصہ ہی پاک ہو گیا اور جب کئی سال کے بعد لوٹا تو ان کی شفقتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ سارے اصول دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ان کی وفات کے بعد نئے نظام میں ہم اجنبی تھے۔ ساری روایتیں اور ان کی شفقتیں ان ہی کے ساتھ چلی گئیں۔ دراصل کے مولانا مرحوم کے نزدیک کام پیارا تھا۔ وہ کام کرنے والوں کے ساتھ ہر طرح کی رو رعایت دینے کو تیار رہتے تھے۔ خاص طور پر مولانا شبلی پر کام کرنے والوں کی جی جان سے مدد کرتے تھے۔

میں مولانا مرحوم کی مجلس کے حاضر باشوں میں تھا۔ وہ علی العموم کاموں میں مصروف رہتے اور جب ان کا جی چاہتا مجھے بلا لیتے اور جی بھر کے دنیا جہان کی باتیں کرتے۔ خاص طور پر جب وہ سیمیناروں سے واپس آتے تو اس کی روداد بڑے شوق سے سناتے اور ہم سنتے۔ اس سے

ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا۔ ایک مرتبہ وہ علی گڑھ اور لکھنو سے واپس آئے تو وہاں کی بعض خواتین کی تقاریر کی بے حد تعریف کی، بلکہ کئی بار ان کا ذکر کیا۔ میں ان کے پاس اٹھا اور ریڈنگ روم میں آیا جہاں ان کے صاحبزادے کو مخاطب کر کے کہا کہ مولانا کے اعصاب پہ عورتیں سوار ہیں۔ جس وقت یہ بات میں کہہ رہا تھا مولانا میری پشت پر کھڑے تھے۔ جب ان پر نظر پڑی تو کاٹو تو خون نہیں، مگر وہ سنی ان سنی کر کے دوسری طرف چلے گئے اور پھر میں ہفتوں سامنا نہ کر سکا۔ پھر انہوں نے بلوایا تو جان نکلی، خدا جانے اب کیا معاملہ ہو، مگر مولانا کی عظمت دیکھئے دوسری تیسری باتیں کر کے اور میرے بعض مضامین کی تعریف وتحسین کر کے اس طرح خاموش رہے گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔

ایک مرتبہ اور بڑا دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ میں مولانا کے ساتھ دارالمصنفین کے کام سے بمبئی گیا ہوا تھا۔ واپسی کا ٹکٹ میرے بھائی کو لے کر اسٹیشن پر آنا تھا، لیکن ان کے آنے میں تاخیر ہوئی۔ ان کے ساتھ ایک صاحب تھے جو مجھ سے بار بار پوچھتے وہ ٹکٹ لے کر کب آئیں گے۔ میں کہتا آتے ہی ہوں گے۔ مزید تاخیر ہوئی تو وہ برہم ہو گئے۔ میں نے ذرا سخت لہجہ میں ان سے کہا کہ آپ کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، لیکن وہ کہتے رہے کہ تم لوگوں کو کسی کام کا سلیقہ نہیں۔ بہرکیف ٹکٹ آیا اور ہم لوگ وقت سے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں کئی بار مولانا نے پوچھا وہ بوڑھا کیا کہہ رہا تھا میں نے تفصیل بتائی، پھر وہ مسکرائے۔ کچھ دیر بعد پھر پوچھا وہ بڑے میاں کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے پھر بتایا۔ غرض راستہ میں انہوں نے مختلف انداز سے کئی بار پوچھا اور میں نہر بار بتاتا رہا اور ہر بار وہ مسکراتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔ میں پریشان ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر ماجرا کیا ہے، مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ چند ماہ بعد ایک دن دیکھا تو وہ بڑے میاں مولانا کے برآمدے میں تشریف فرما ہیں اور مولانا ان سے باتوں میں منہمک۔ میرے ساتھ مولانا کے منجھلے صاحبزادے محمد طارق تھے۔ میں نے پوچھا طارق یہ کون صاحب ہیں، تو انہوں نے بتایا کہ یہ میرے پھوپھا ہیں۔ اب مجھے مولانا کا ٹرین میں بار بار ان کے بارے میں پوچھنا اور مسکرانا یاد آیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا ایسے ظریف اور بذلہ سنج بھی تھے۔

مولانا مرحوم کے ساتھ میں نے متعدد سفر کئے۔ ان کی نیکی، شرافت، مروت اور شفقت

سفر میں اور بڑھ جاتی تھی۔ انہیں ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ کے الفاروق سیمینار میں جانا تھا، کہنے لگے تم بھی چلو۔ میں مدعو نہیں تھا، مگر ان کے کہنے پر تیار ہو گیا اور ان کے ساتھ ہولیا۔ ٹرین میں کہنے لگے کچھ لکھ لو اور سیمینار میں شامل ہو جاؤ۔ میں نے معذرت کی، کچھ دیر بعد کہا، اس طرح ہر جگہ ساتھ رہے گا اور علی گڑھ والوں سے تمہارا تعارف بھی ہو جائے گا۔ بہر حال میں علی گڑھ پہنچا تو سیمینار کے کنوینر پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جو لوگ مجھ پر میرے زمانہ طالب علمی سے مہربان ہیں، ان میں ایک شفیق بزرگ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب بھی ہیں اور آج تک ان کی محبت و شفقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خاص طور پر جب ان کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو وہ آج بھی اعظم گڑھ میرے لئے بھیجنے کی زحمت اٹھاتے ہیں اور کبھی یہ نہیں پوچھتے کہ میری کتاب تمہیں کیسی لگی۔ شاید انہیں میرے مبلغ علم کا اندازہ ہے۔ بہر حال مولانا کے ساتھ ہی گیسٹ ہاؤس میں مجھے بھی ٹھہرایا گیا اور مولانا مرحوم کے کہنے پر اسی گیسٹ ہاؤس میں الفاروق پر اپنے ایک پرانے مقالے سے اس کے تراجم کا حصہ نکال کر کچھ تمہید وغیرہ لکھ کر مقالہ پیش کرنے کو تیار ہو گیا۔ دوسرے دن علی گڑھ کے ایک قاسمی پروفیسر شاید اپنی دیرینہ روایت کے مطابق شبلی اور الفاروق پر نکتہ چیں ہوئے۔ انہوں نے الفاروق میں شامل بعض روایتوں پر نقد کیا اور اس شخص پر جس نے اردو داں حلقہ میں درایت کی شاید سب سے پہلے اہمیت واضح کی، اسی پر درایت کی رو سے نقد کرتے رہے۔ ان کے بعد مجھے مقالہ پیش کرنے کے لئے بلایا گیا اور جب میں نے یہ کہا کہ ''علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت کا سارا زمانہ معترف ہے۔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں۔'' تو شبلی کے قدر دانوں کے چہرے کھل اٹھے۔ میرے مقالہ میں تھا تو کچھ نہیں، مگر میں نے الفاروق کے نو تراجم کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا کہ لوگوں کو میرے اہل علم ہونے کا شبہہ ہوا۔ خاص طور پر اسی زمانہ میں الفاروق کا عربی ترجمہ جو دارالسلام ریاض سے شائع ہوا تھا کا ذکر کیا تو لوگ بہت متاثر ہوئے۔ آخر میں میں نے الفاروق کا ہندی ترجمہ نہ ہونے پر تاسف کا اظہار کیا۔ وقفہ سوالات میں دیکھا کہ خود مولانا مرحوم سوال کرنے کے لئے آ گئے ہیں۔ میں تو سہم گیا کہ خدا جانے بڑے میاں کیا سوال کریں، مگر انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ مجھے الیاس صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ الفاروق کا ہندی میں ترجمہ ہونا چاہئے، اس سے اصل

اردو ایڈیشن کی اہمیت کم ہو جائے گی ۔ پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی صاحب مسکرائے اور کہا کہ الیاس صاحب کو اس کا جواب دینے کی ضرورت نہیں ۔ اب ملک میں ہندی کا عام رواج ہو گیا ہے اور ہمارے بچے بھی اب ہندی زبان میں کتابیں پڑھنا پسند کرتے ہیں، اس لئے الیاس صاحب کی تجویز مناسب ہے ۔ میں مولانا مرحوم کے سوال کرنے کے بعد ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ سوال انہوں نے کیوں کیا ہے ۔ دراصل وہ علی گڑھ کے علمی حلقہ میں مجھے روشناس کرانا چاہتے تھے ۔ اس طرح کی شفقتیں کرنے والے بزرگ اب کہاں ملیں گے ۔

الفاروق سمینار میں انہوں نے '' الفاروق - ایک تجزیاتی مطالعہ '' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا ۔ ٹرین میں مجھ سے کئی بار پوچھا کہ تجزیاتی مطالعہ کسے کہتے ہیں ۔ میں نے کہا جائزے کو ہی اب تجزیاتی مطالعہ کہا جاتا ہے ۔ کہتے یہ آپ لوگوں کے زمانہ میں تجزیاتی مطالعہ آ گیا ہے، ہم لوگ تو اسے جائزہ کہتے اور لکھتے رہے ہیں ۔ میں نے بلا سوچے سمجھے کہہ دیا کہ دونوں ایک ہی بات ہے ۔ کہنے لگے تو پھر مجھ سے تجزیاتی مطالعہ کے لئے کیوں کہا گیا ہے ۔؟ میں نے گھبرا کے کہا خدا جانے ۔ پھر وہ مسکرائے اور کہنے لگے، الفاظ پر غور کرنا اور لغت دیکھنے کا اہتمام مستقل رہنا چاہئے ۔ آج سوچتا ہوں کہ اب اس طرح کی تربیت کرنے والے اور مشورہ دینے والے کہاں ملیں گے ۔

الفاروق سمینار کے بعد کہنے لگے آیئے ابھی ایک اور سمینار میں شرکت کرنی ہے ۔ مجھے اس کی اطلاع بالکل نہیں تھی ۔ وہ مجھے لے کر مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ گئے ، جہاں انہوں نے داراشکوہ پر مقالہ پیش کیا جو بعد میں ماہنامہ '' آج کل '' دہلی میں شائع ہوا ۔ ان کے ادبی مضامین ، آج کل دہلی ، مالک رام کے رسالہ تحریر اور غالب نامہ وغیرہ میں شائع ہوتے تھے ۔ ان کی علمی زندگی کا آغاز ماہنامہ معارف میں مقالہ نگاری سے ہوا تھا اور آخر تک وہ مقالہ نگاری میں مصروف رہے ۔ پچاسوں رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوئے ہیں ۔ پچاس برس تک وہ مسلسل لکھتے رہے ۔ ہم لوگ ان کے آخری دور میں مذاقاً انہیں دارالمصنّفین کا اکبر اعظم کہتے تھے اور واقعی وہ دارالمصنّفین کے اکبر اعظم ہی تھے ۔ ان سے زیادہ شاید ہی کسی نے دارالمصنّفین میں اور علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے میدان میں وقت گذارا ہو ۔ انہوں نے پچاس برس سے زیادہ دارالمصنّفین سے وابستگی میں گذارے ۔

علی گڑھ سے وہ دہلی چلے گئے۔ وہاں شاید غالب اکیڈمی میں مقالہ پیش کرنا تھا۔

پٹنہ کے ''مولانا ابوالکلام آزاد'' سمینار میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری [۱۹۴۲-۲۰۰۶ء] کی محبت نے مجھے بھی مقالہ نگار بنا دیا تھا۔ میں نے ''مولانا آزاد کی تاریخی بصیرت'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔ مقالہ طویل تھا باوجود اس کے پورا سنا گیا۔ بہت سے اہل علم نے تعریف کی۔ خود سمینار کے کنویز اور خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری نے بے حد پسند کیا۔ مولانا مرحوم نے بھی ستائش کی اور پھر مجھ سے وہ مقالہ لے کر معارف میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ خود مولانا آزاد کے بڑے مداح تھے بلکہ عاشق تھے۔ ان پر بہت سے مضامین ومقالات لکھے۔ آخر میں ان مقالات کو چند اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں دارالمصنّفین سے شائع کیا۔ یہ کتاب بھی دارالمصنّفین کی مقبول کتابوں میں سے ایک ہے۔

اس زمانہ میں ایک ہزار کے قریب ہمارے سفر پٹنہ کا خرچ آیا تھا۔ پٹنہ میں جب سفر کے اخراجات لینے کی باری آئی تو جو واقعی اخراجات ہوئے تھے، وہی ہم لوگوں نے بتائے اور اسی کا بل دیا۔ کیشئر نے ہماری طرف دیکھا، مسکرایا پھر ہمارے بل پھاڑ دیئے اور خود ہی بل بنا کر پیسے ادا کر دیئے اور یہ کہا کہ آپ لوگوں کو بل بنانا نہیں آتا۔ میرا تو خیر یہ پہلا موقع تھا کسی سرکاری سیمینار میں شرکت کا، مگر تعجب تو مولانا پر تھا کہ انہیں بھی اس کا ہنر نہ تھا۔

ہارون اعظمی مرحوم نے بمبئی میں مولانا عبدالسلام ندوی پر پہلا سمینار ان کے مشورہ سے منعقد کیا تھا اور اس کا خاکہ اور عنوانات وغیرہ بھی مولانا مرحوم ہی نے تیار کئے تھے۔ اس میں میں بھی شریک تھا۔ اس سمینار میں دارالمصنّفین کا پورا قافلہ شامل ہوا۔ مولانا مرحوم، مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی، مولانا محمد عارف عمری اور راقم، لیکن اس سمینار کے اصل مرکز توجہ پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم تھے۔

پروفیسر کبیر احمد جائسی مرحوم نے مولانا عبدالسلام ندوی پر ایک مضمون ان کی زندگی میں لکھا تھا جو ماہنامہ آج کل دہلی میں شائع ہوا تھا۔ پھر شبلی کالج کی طالب علمی کے زمانہ میں کالج میگزین کا عبدالسلام ندوی نمبر شائع کیا۔ بلاشبہہ انہیں مولانا عبدالسلام ندوی سے بڑی عقیدت تھی

اورانہوں نے ان پر کئی کام اس سمینار سے پہلے کئے اور کئی کام سمینار کے بعد انجام دیئے۔

مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] علامہ شبلی کی وفات کے بعد ۱۹۱۵ء میں کلکتہ سے اعظم گڑھ آئے اور دارالمصنّفین کے رفیق مقرر ہوئے۔ پھر پوری زندگی آستانۂ شبلی پر گذار دی، بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے۔ سید صاحب سیرۃ النبی کی تکمیل میں مصروف رہے اور وہ اسوہ صحابہ پر کام کرتے رہے اور تین حصوں میں بڑی معرکتہ الآراء کتاب لکھی۔ حکمائے اسلام بھی ان کی بڑی اہم کتاب ہے۔ ایک درجن سے زاید محققانہ کتابیں ان کی یادگار ہیں، لیکن ان کی سات کتابیں ضائع ہوگئیں اور ان کے ساتھی رفقاء نے ضائع کیں۔ اس علمی ضیاع کے خلاف پروفیسر کبیر احمد جائسی ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ حسب توقع انہوں نے اسی موضوع پر مقالہ پیش کیا اور مولانا عبدالسلام ندوی کے ساتھ دارالمصنّفین میں ہونے والی بعض زیادتیوں کا ذکر کیا۔ ہم لوگ بھی اس سے واقف تھے اور جائسی صاحب کے کسی قدر ہم خیال بھی، مگر انہوں نے ظلم یہ کیا کہ ان تلف شدہ کتابوں کا حساب مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم سے دارالمصنّفین کا ناظم ہونے کے ناطے طلب کیا۔ مجھے ناگوار گذرا اور میں نے جائسی صاحب سے کہا کہ ضیاء الدین صاحب سے جواب طلب کر کے آپ نے انہیں مجرم قرار دے دیا اور جو لوگ اصل ذمہ دار تھے، ان کا آپ نے نام نہیں لیا۔ ایک سوال یہ بھی تھا کہ آپ نے ان سے پہلے کے نظمائے دارالمصنّفین سے حساب کیوں نہیں مانگا۔ جائسی صاحب کو میری جسارت ناگوار گذری اور انہوں نے گرہ باندھ لی۔ پھر اس کے بعد برسوں تک علی گڑھ جانے والوں سے وہ میرا مبلغ علم دریافت کرتے رہے۔ اگر چہ آخر میں ''مکتوبات شبلی'' کی اشاعت پر بہت خوش ہوئے۔ مبارک باد دی مگر مولانا عبدالسلام ندوی سمینار کا سوال انہیں ستاتا رہا۔ اس کی وجہ سے ان کے قریب رہنے والے بعض دوسرے افراد بھی مجھ پر معترض رہے اور بعض اب بھی ہیں، گو جائسی صاحب نے مجھے معاف کر دیا تھا۔ ان کے متعدد خطوط جو میرے نام آئے اور جو میری کتاب ''محبت نامے'' میں شامل ہیں، اس بات کے شاہد ہیں۔

۱۹۹۶ء میں مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم نے چار روزہ علامہ سید سلیمان ندوی سمینار منعقد کیا تھا۔ ان کی شفقت تھی کہ انہوں نے علمی امور کی تمام تر ذمہ داری مجھے سپرد کر دی تھی۔ چوں کہ

یہ سمینار بہت کامیاب رہا تھا، اس لئے مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم جب چھوٹا بڑا کوئی پروگرام یا سمینار کرتے تو مجھ کو بلا کر مشورہ کرتے اور یہ سمجھتے کہ مجھے بڑا تجربہ ہے۔ حالاں کہ یہ محض ان کی محبت تھی۔ ۲۰۰۴ء میں علامہ شبلی پر انہوں نے جو سمینار کیا تھا اس میں بھی ابتداء میں میرے مشورے شامل تھے۔ بعض ایسے اہل قلم جو اس وقت روشناس نہیں ہوئے تھے اور اچھا لکھ رہے تھے میرے مشورہ سے مولانا نے انہیں مدعو کیا۔ اس سمینار کے لئے ڈاکٹر شمس بدایونی کا نام بھی میں نے ہی پیش کیا تھا، مگر پھر میں ایک آفت ناگہانی میں مبتلا ہوا اور بمشکل صرف مقالہ ہی پیش کر سکا۔ اس سمینار میں میں نے ''علامہ شبلی بحیثیت مدیر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ مولانا کو اتنا پسند آیا کہ اسے معارف میں شائع کیا۔ اس سمینار کے متعدد مقالات انہوں نے ماہنامہ معارف میں تسلسل سے شائع کئے۔ ۲۰۰۷ء میں حج پر جاتے ہوئے انہوں نے دو کام میرے ذمہ کئے تھے۔ ایک ''شعر العجم'' جلد چہارم کی تصحیح اور دوسرے مذکورہ سمینار کے مقالات کی ترتیب و تدوین۔ افسوس یہ دونوں کام میں ان کی واپسی تک نہ انجام دے سکا اور پھر جب وہ واپس آئے تو موت نے انہیں مہلت نہیں دی کہ وہ مجھ سے باز پرس کرتے۔ ''شعر العجم'' تو کسی طرح چھپ گئی، مگر مقالات کا یہ مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے لئے اب میں زندگی بھر مولانا مرحوم کی روح سے شرمندہ رہوں گا۔

۲۰۰۱ء میں میری کتاب ''علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ'' خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ سے شائع ہوئی۔ دراصل یہ پی. ایچ. ڈی کے مقالہ کا ایک باب تھا جس میں معتدبہ اضافہ کر کے خدا بخش نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا۔ مولانا مجیب اللہ ندوی مرحوم کے استاد پر کتاب تھی وہ بہت خوش ہوئے اور ماہنامہ الرشاد میں بڑا شاندار تبصرہ کیا۔ میں نے مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب سے بھی خواہش کی کہ آپ بھی کچھ لکھ دیں۔ فوراً تیار ہوگئے اور بڑا عمدہ تبصرہ کیا۔ اس تبصرے کے تین پہلو ہیں۔ پہلا میری ذات، دوسرا سید صاحب کی مؤرخانہ بصیرت، تیسرا اس کتاب کی ضرورت۔ میرے بارے میں لکھا کہ:

> ''ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا علم و ادب سے شغف اور لکھنے پڑھنے کی جانب ان کا طبعی میلان انہیں بچپن ہی میں دار المصنفین شبلی اکیڈمی کی علم و ادب پرور فضا میں

کھینچ لایا۔ دارالمصنّفین کی متواتر حاضری اور یہاں کی علمی صحبتوں میں ان کا ذوق علم وادب برابر ترقی کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دارالمصنّفین ان کے مزاج میں رچ بس گیا اور وہ علامہ شبلی کی صہبائے علم وادب سے مخمور اور سرشار ہو گئے۔

علامہ شبلی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد بھی ان کا یہ نشہ نہیں اترا، بلکہ وہ علامہ شبلی، دارالمصنّفین اور یہاں سے وابستہ نامور اشخاص کے علاوہ دوسرے علمی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر مضامین نو کا انبار لگاتے جا رہے ہیں۔ یہ رسالہ اسی سلسلہ زریں کی تازہ مگر اہم کڑی ہے اور ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی سعی ومحنت اور کدوکاوش کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں انہوں نے علامہ شبلی کے علمی وارث وجانشین مولانا سید سلیمان ندوی کے رچے ہوئے پختہ تاریخی مذاق اور ان کی تاریخی بصیرت کے مختلف نقوش ابھارے ہیں''۔

اس کے بعد اس کے مشمولات کا تعارف ہے اور آخر میں اس کی ضرورت کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''رسالے کے مشمولات کی طرح اس کی اچھی ترتیب اور سنجیدہ ومتوازن طرز تحریر نے بھی اس کی دل کشی و دلآویزی بڑھائی ہے۔ اس زمانے میں تاریخ کو مسخ کرنے کی جو منظّم کوششیں ہو رہی ہیں، اس کا تریاق اسی طرح کے رسالوں سے مہیا کیا جاسکتا ہے''۔

مولانا مرحوم ایک بڑے مبصر بھی تھے۔ ماہنامہ معارف میں ایک زمانہ تک تبصرہ کرتے رہے اور سیکڑوں کتابوں پر انہوں نے تبصرے لکھے ہیں۔ انہیں اگر یکجا کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے۔ خدا جانے کب یہ کام ہوگا اور کون انجام دے گا۔

۲۰۰۵ء میں مجھے مجموعہ مضامین شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ شخصیات پر جو مضامین لکھے تھے۔ انہیں یکجا کیا اور ہمت کر کے مقدمہ لکھنوانے مولانا مرحوم کے پاس پہنچ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہا نئی ادبی دنیا کے اثرات آپ پر بھی پڑ ہی گئے۔ چند دنوں بعد انشاء اللہ لکھ دوں گا۔ مسودہ چھوڑے جایئے اور پھر واقعی چند دنوں بعد مقدمہ لکھ دیا اور ایسا حوصلہ افزا

مقدمہ لکھا کہ اس سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی میرے اور میرے مضامین کے سلسلے میں کسی نے نہیں لکھا ہوگا۔ وہ جب میرے کسی کام کے بارے میں یا میری کتاب پر کچھ لکھتے تو دارالمصنّفین سے میرے تعلق پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ان کے بعض اقتباسات سے اندازہ ہوا ہوگا، مگر عظمت کے نشان کے مقدمہ میں ایسا نہیں ہوا۔ اس دفعہ انہوں نے دوسرا انداز اختیار کیا اور لکھا کہ:

''ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کا تعلق سرزمین شبلی سے ہے، جس کا ذرہ بھی نیر اعظم بن کر چمکتا ہے۔ انہوں نے بہت کم عرصے میں علم و ادب کی دنیا میں اپنی جو جگہ بنائی ہے وہ بہت سے لوگوں کو برسوں کی محنت و ریاض کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔ ان کی تحریر و تصنیف کی عمر ابھی زیادہ نہیں ہے، مگر ان کے قلم سے کئی ایسی کتابیں نکل چکی ہیں جن کی وجہ سے وہ ارباب علم و دانش کا مرکز توجہ ہوگئے ہیں اور گذشتہ دس بارہ برسوں میں علمی و تحقیقی مضامین کے تو اتنے انبار لگائے ہیں کہ ہندو پاک کا شاید ہی کوئی موقر اور قابل ذکر رسالہ ایسا ہو جو ان سے متمتع نہ ہوا ہو۔''

پھر ''عظمت کے نشان'' کے مشمولات کا ذکر کرتے ہوئے ایک ایک مقالے کا تعارف کرایا اور اس کی اہمیت کا بھی ذکر کیا۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کی تاریخی بصیرت پر جو مقالہ کتاب میں شامل ہے اس کے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا آزاد کی تاریخی بصیرت پر پہلی مرتبہ الیاس صاحب نے بہت اچھا مضمون لکھا ہے۔ تعارف کے بعد آخر میں مجموعی رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''صاحب مقالات نے اپنی محنت اور ذوق سے اپنی ایک شناخت بنائی ہے۔ ان کے خیالات میں جہاں اعتدال و توازن ہوتا ہے وہاں تحریر میں بھی پختگی اور دلکشی ہوتی ہے۔ ان کی تحسین و تنقیص بھی غلو و مبالغہ سے عموماً خالی ہوتی ہے۔''

''عظمت کے نشان'' شائع ہوا تو اس کی تحسین کرتے رہے۔ اس کے بعد مجھے علامہ شبلی سے متعلق مضامین شائع کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مولانا مرحوم سے ذکر کیا تو کہنے لگے شائع کر لیجئے مگر مستقل کتابوں کی طرف توجہ دیجئے۔ افسوس ''متعلقات شبلی'' اور ''آثار شبلی'' کی اشاعت سے

پہلے وہ دنیا سے رخصت ہوئے اور ہم نو آموز اہل قلم کو بے سہارا چھوڑ گئے۔

مولانا مرحوم سے گونا گوں تعلقات رہے۔علم وفن اور تصنیف و تالیف سے ہٹ کر بعض گھریلو مسائل و معاملات میں بھی وہ شریک رہتے، جن کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں۔لیکن اس قدر ضرور کہوں گا وہ بڑے پاکیزہ شخص تھے۔جو دل میں ہوتا وہی زبان پر، معاملات کے بھی بڑے صاف ستھرے تھے۔ان کے ذمہ کسی شخص کا شاید ہی کوئی حق رہا ہو۔

حج سے لوٹے تو ان کے صاحبزادے سلیم جاوید کا فون آیا کہ مولانا آپ کو یاد کر رہے ہیں اور کہا کہ آج چھٹی لے کر دارالمصنّفین آجائیں۔میں گھبرایا، چھٹی لی اور سویرے ہی دارالمصنّفین پہنچ گیا۔دن بھر ان سے باتیں کرتا رہا۔پہلے دارالمصنّفین کے متعلق باتیں کیں، پھر سوئے حرم لے کر چلے اور سفر نامہ حج سناتے رہے۔ایک گھنٹہ بعد میں نے یہ دریافت کرنے کی جرأت کی کہ آپ نے کس لئے یاد فرمایا ہے؟ کہنے لگے پروفیسر عبدالحق کو فون لگایئے اور توسیعی خطبے کے لئے بات کیجئے۔میں نے اسی وقت رابطہ کیا۔پروفیسر عبدالحق صاحب اس وقت گورکھپور یونیورسٹی میں کسی پروگرام میں تھے۔پہلے میں نے بات کی پھر مولانا نے۔وہ راضی ہو گئے اور دہلی پہنچ کر پروگرام طے کرنے کی بات ہوئی۔توسیعی خطبے کی بات ختم ہوئی وہ پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دنیا جہان کی باتیں کیں۔ان کی گفتگو میں کچھ دیر کے بعد دارالمصنّفین آجاتا، علمی اور مالی دونوں پہلوؤں پر وہ فکر و تشویش کا اظہار کرتے رہے اور اس کے لئے سفر کا ارادہ ظاہر کیا۔میں ان کے ساتھ دارالمصنّفین کی مالیات کے لئے بمبئی کا سفر کر چکا تھا، جس میں ہم لوگ بری طرح ناکام ہوئے تھے۔ہوا یوں کہ مولانا مرحوم کو انجمن اسلام نے حارث میموریل لکچر کے لئے بلایا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ میں بھی ساتھ چلوں۔اتفاق کی بات کہ اسی زمانہ میں انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر آدم شیخ نے اپنی کتاب ''شاہ معین الدین احمد ندوی علم وحلم کی شمع فروزاں'' شائع کی تھی۔یہ کتاب دراصل میرے ایک طویل مقالہ کے ساتھ چند اور مقالات کو شامل کر کے شائع کی گئی تھی۔ڈاکٹر آدم شیخ صاحب حارث میموریل لکچر کے موقع پر اس کی رسم اجرا ادا کرنا چاہتے تھے۔ان کی خواہش تھی کہ چوں کہ آپ ہی کی وجہ سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے، اس لئے آپ بھی شریک جلسہ ہوں۔چنانچہ اس بہانہ سے مولانا مرحوم کے ساتھ سفر کا پروگرام بن گیا۔

حارث میموریل لکچر اور رسم اجرا سے فراغت کے بعد اب مولانا نے دارالمصنّفین کی مالیات کی فراہمی کے لئے تگ ودو شروع کی۔ ڈاکٹر اسحاق جم خانہ والا مرحوم سے ملے۔ انہوں نے جناب رضوان فاروقی کو بھی شامل کر لیا اور انجمن اسلام میں ایک میٹنگ طے کی گئی۔ مگر افسوس کہ ہم دونوں اور جم خانہ والا کے علاوہ کوئی آیا نہیں۔ اعظم گڑھ کے ایک صاحب آخر میں آئے اور انہوں نے دارالمصنّفین کی ضروریات پوچھیں۔ مولانا مرحوم نے سب سے اہم ضرورت پریس کی بتائی۔ معارف پریس میں اس وقت ونڈائنگ سسٹم تھا اور مشین پرانی ہونے کی وجہ سے طباعت بہت خراب ہوتی تھی۔ مولانا مرحوم اس کے لئے بے حد فکر مند تھے۔ انہوں نے مولانا سے اس کا تخمینہ دریافت کیا۔ اس وقت آفسیٹ پریس کا تخمینہ بیس لاکھ کا تھا۔ مولانا نے جوں ہی تخمینہ بتایا، ان صاحب نے کہا اس کے لئے آپ فکرمند نہ ہوں۔ آپ واپس اعظم گڑھ جائیں یہ رقم آپ کو مل جائے گی اور پھر وہ رقم کبھی نہیں آئی۔

یہ سفر بھی اس دن موضوع بحث رہا۔ بہر حال میں اس دن ڈیڑھ بجے تک ان کے ساتھ رہا پھر واپس آ گیا۔ مجھے یہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ مولانا سے میری یہ آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد آئی تو ان کی خبر آئی۔ اب اس سے آگے مجھ میں تاب رقم نہیں۔ ان کی وفات پر میں نے ایک وفیاتی مضمون لکھا تھا، اس کے تمہیدی اقتباس پر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں۔

''افسوس کہ ۲؍فروری ۲۰۰۸ء کو علی الصبح نامور اہل قلم اور مایہ ناز ادیب وانشاء پرداز مولانا ضیاءالدین اصلاحی (پ: ۳؍جولائی ۱۹۳۷ء) ناظم دارالمصنّفین اور مدیر معارف نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ یکم فروری ۲۰۰۸ء کو کھریواں سرائے میر جاتے ہوئے سڑک حادثہ میں شدید زخمی ہو گئے تھے۔ دل ودماغ میں سخت چوٹیں آئی تھیں۔ علاج کے لئے بی. ایچ. یو بنارس لے جائے گئے، لیکن اطبا کی تمام تر مسیحائی کے باوجود وہ جاں بر نہ ہو سکے اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادصبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

آہ! علوم اسلامیہ کا وہ بدر کامل غروب ہو گیا جس کی ضیاء پاشوں سے آسمان علم وادب منور

تھا۔ وہ شمع بجھ گئی جس سے بزم شبلی روشن تھی۔ علم وحلم، شرافت ومروت اور سادگی وتواضع کا وہ پیکر مٹ گیا، جس سے انسانیت کی آبرو قائم تھی۔ دریغا کہ وہ قلم ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا جس کی جنبش علم و ادب کے موتی لٹاتی تھی۔ افسوس کہ وہ آواز خاموش ہوگئی، جو بت کدے میں نعرہ تکبیر بن جاتی تھی۔ افسوس صد افسوس کہ شبلی وسلیمان، شاہ معین الدین اور سید صباح الدین کی وہ امانت لٹ گئی جو ہمارا سرمایہ افتخار تھی۔ واحسرتا کہ فضل وکمال کا وہ تابندہ نقش مٹ گیا، جس سے محفل دوشیں میں رونق تھی۔

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

مولانا کی وفات ملت اسلامیہ کا ایک بڑا سانحہ ہے۔ ایسے اہل علم ودانش، دیدہ ور، روشن دل و دماغ اور جامع کمالات مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور غریق رحمت کرے۔

[۹]

نیاز واحدی
ایک صالح اولاد

نیاز واحدی مرحوم [م:۱۹؍مئی۲۰۱۱ء] مشہور شاعر نشور واحدی مرحوم [۱۹۱۲-۱۹۸۳ء] کے بڑے اور لائق بیٹے تھے اور ان کی تمام تر روایتوں کے امین بھی۔ بڑے شریف اور نیک نفس انسان تھے۔ دینی مزاج رکھتے تھے۔ صوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند تھے۔ تصوف کے ذوق آشنا بھی تھے اور اپنے والد سے ہی سلسلہ قادریہ، چشتیہ اور نیازیہ میں بیعت تھے۔ آخر میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی معروف بہ علی میاںؒ [۱۹۱۳-۱۹۹۹ء] سے بیعت ہو گئے تھے۔ باتیں کرتے تو اپنے والد کی باتیں کرتے۔ شعر سناتے تو اپنے والد ہی کے اشعار سناتے۔ حتی کہ انہیں کے انداز میں غزلیں سناتے۔ جن لوگوں نے نشور صاحب کو سنا ہے ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کی آواز سے آواز ملا دی تھی۔ خود مجھے کئی بار نشور صاحب کی غزلوں کے اشعار سنائے۔

وہ کان پور میں پیدا ہوئے۔ جہاں نشور صاحب اپنے آبائی وطن بلیا سے ترک وطن کر کے سکونت اختیار کی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر نشور صاحب سے حاصل کی۔ بعد ازاں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور اکنامکس میں ایم۔اے کر کے محکمہ صحت میں ملازمت اختیار کر لی۔ ترقی کر کے میڈیکل افسر ہوئے۔ اس عہدہ پر وہ مختلف شہروں میں تعینات رہے۔ وظیفہ کے بعد خود کو اپنے والد کے شعر وادب کے فروغ کے لئے وقف کر لیا اور پھر انہوں نے وہ کارنامہ انجام دیا جو انہیں اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد انہیں جو فنڈ وغیرہ ملا اسے انہوں نے اپنے والد کی کتابوں کے طبع واشاعت پر بے دریغ خرچ کیا اور آخری سانس تک خرچ کرتے رہے۔ نشور واحدی کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت کے ساتھ مطبوعہ کتب نظم ونثر کو از سر نو کتابت وطباعت

کرا کے شائع کیا۔حتیٰ کہ ایک کتاب کے کئی کئی ایڈیشن شائع کئے اور کمال تو یہ ہے کہ انہیں نشور صاحب کی زندگی میں لکھنے پڑھنے سے کوئی سروکار نہیں تھا، تاہم نشور واحدی مرحوم کی کتابوں پر حواشی اور نوٹس کے ساتھ بڑے معلوماتی دیباچے اور مضامین لکھے۔ان سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اچھی اور صاف ستھری زبان لکھنے پر بخوبی قادر تھے۔

وہ اپنے والد کی ہر ادا پر جان دیتے تھے۔ان پر جو سوانحی اور ادبی مضامین لکھے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد کے ادبی شعور سے تو واقف ہی تھے اردو زبان و ادب تاریخ پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔

بات کسی ادیب و شاعر کی ہو رہی ہو وہ نشور واحدی کا ذکر چھیڑ دیتے۔ان کے حالات بیان کرتے۔ان کے واقعات سناتے۔پھر ان کے اشعار سنانا شروع کر دیتے، لیکن اس خوبصورتی سے کہ کسی کو ناگوار نہ گزرتا اور پھر وہ بولتے اور بے تکان بولتے۔ذکر نشور زیادہ ہو جاتا تو بڑے معصومانہ انداز میں معذرت کرتے۔

معاملہ یہیں تک نہیں تھا وہ ہر لکھنے پڑھنے والے کو نشور صاحب پر لکھنے پڑھنے کی دعوت دیتے۔مواد فراہم کرتے۔کتابیں دیتے اور ان پر لکھے جانے والے مضامین و مقالات کا عکس فراہم کرتے اور اس کام میں وہ جی جان سے اس طرح لگے رہتے کہ مضمون یا دیباچہ لکھا کر ہی دم لیتے۔نشور صاحب پر لکھے جانے والے بیشتر مضامین و مقالات کے لکھے جانے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔یہی نہیں وہ ان طلبہ کی جنہوں نے ایم۔فل یا پی۔ایچ۔ڈی کے لئے نشور صاحب پر مقالات لکھے ان کا ہر طرح سے تعاون کرتے۔ان کو اپنے ہاں بلاتے۔ان کی ضیافت کرتے۔ان کے مضامین کی اشاعت کے لئے رسائل کا انتخاب کرتے اور خود ہی اس سلسلہ میں رسائل کے مدیروں کو متوجہ کرتے اور طلبہ ہی سے نہیں بعض پختہ مشق اہل قلم کو بھی انہوں نے آفر کیا کہ آپ نشور صاحب پر لکھیں، کتابیں میں اپنے خرچ سے طبع کرادوں گا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کئی مقالات کے مکمل اخراجات انہوں نے خود برداشت کئے اور انہیں طبع کرایا۔

نیاز واحدی نے نشور واحدی کی زندگی ہی میں ان کی کاوشوں کی طبع و اشاعت سے دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔۴ جنوری ۱۹۸۳ء کو نشور واحدی نے وفات پائی تو نیاز واحدی مرحوم نے ان

کے شعر وادب کو فروغ دینے کا قطعی طور پر تہیہ کر لیا اور پھر دم واپسیں تک اسی کام میں مصروف بلکہ سرگرم رہے۔ انہوں نے نشور واحدی کے غیر مطبوعہ کلام کو نہ صرف مرتب کیا بلکہ مطبوعہ تمام مجموعہ ہائے کلام کو از سر نو شائع کیا۔ وہ سب کام خود کرتے اور خوشی کی خاطر خانوادہ نشور کے ہر فرد کو شامل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی والدہ مومنہ چشتی، بہن ثروت واحدی اور بھائی امتیاز واحدی حتی کہ چھوٹے بھائی کی بیوی تک کا نام کتابوں میں شامل کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ یہ خوشی پورے خانوادۂ نشور میں تقسیم کر دیتے۔

نشور واحدی کا پہلا مجموعہ کلام ''صہبائے ہند'' ہے۔ جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت نشور صاحب کی عمر ۳۲ سال تھی۔ نیاز واحدی نے ۱۹۸۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرایا اور اس کا سارا کریڈٹ انہوں نے والدہ کو دیا۔ اس طرح انہوں نے والدہ کی بھی دلجوئی کی۔

نشور صاحب نے بچوں کے لئے متعدد نظمیں کہی تھیں۔ ۱۹۹۲ء میں نیاز واحدی نے اس کا ایک مجموعہ ''پھولوں کی انجمن'' کے نام سے مرتب کرا سے شائع کیا۔

نشور صاحب نے ہندوستان میں فلسفہ خودی کا ارتقاء کے عنوان سے ایک بڑی زبردست کتاب لکھی تھی۔ ۱۹۹۳ء میں اس کو شائع کیا۔ یہی نہیں اس پر متعدد مضامین بھی لکھوا کر شامل کئے۔

۱۹۹۸ء میں نشور واحدی کی غزلوں کا مجموعہ ''آتش نم'' اور ۱۹۹۹ء میں ''عزم محکم'' کی اشاعت کا سامان کیا۔ نشور صاحب کی منظوم باقیات کو ''اشک چکاں سے عصر رواں تک'' کے نام سے سن ۲۰۰۰ء میں شائع کیا۔ غزلوں کا مجموعہ ''سواد منزل'' جس کا نام نیاز فتحپوری نے منتخب کیا تھا، ۲۰۰۹ء میں اس کا بھی دوسرا ایڈیشن شائع کیا۔ باقیات نثر نشور کو ڈاکٹر محمد ارشد خاں سے مرتب کرا کے ''رمز معانی'' کے نام سے شائع کیا۔ اسی طرح ۲۰۰۹ء میں ''دانش آخر الزماں'' اور ۲۰۱۰ء میں ''تاریخ فلسفہ خودی'' کو انتہائی اہتمام سے شائع کیا۔ یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۱۹ر مئی ۲۰۱۱ء کو نیاز واحدی نے انتقال کیا اور کلام نشور کی طباعت و اشاعت کا جو سلسلہ ان کے دم سے قائم تھا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

نیاز واحدی صاحب نشور صاحب کی جب کوئی کتاب یا مجموعہ کلام شائع کرتے تو اس پر ملک کے کسی ممتاز اہل قلم سے تمہید، دیباچہ یا مقدمہ تو لکھواتے ہی تھے، خود بڑے اہتمام سے اپنی

کوئی تحریر اس میں شامل کرتے۔ کبھی عرض حال لکھتے۔ کبھی یادیں لکھتے۔ اس طرح کی ان کی جو تحریریں نظر سے گذریں درج ذیل ہیں:

۱۔ صہبائے ہند ---- کچھ یادیں
۲۔ ہندوستان میں فلسفہ خودی کا ارتقاء ---- اپنی بات
۳۔ آتش ونم ---- شخصیت نشور ذہن کے آئینہ میں
۴۔ اشک چکاں سے عصر رواں تک ---- اپنی بات
۵۔ سوادمنزل ---- عرض مرتب / نشور واحدی کا نسبی شجرہ اور حیات نشور
۶۔ دانش آخرالزماں ---- عرض مرتب / حرف چند
۷۔ تاریخ فلسفہ خودی ---- عرض مرتب / اظہار ممنونیت

نیاز واحدی عرض مرتب یا عرض حال سرسری نہ لکھتے۔ اس میں مجموعہ کلام کا پورا تعارف پیش کرتے اور وضاحت سے لکھتے کہ یہ مجموعہ پہلی بار کب شائع ہوا۔ اس میں کل کتنی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ ایک دو کتابوں پر انہوں نے بہت مفصل مقالے لکھے ہیں۔ جس میں حیات نشور اور ان کے آباواجداد کے بھی حالات قلم بند کئے ہیں۔ غرض ان کے مقدمات بڑے معلومات افزاء ہیں۔

نیاز واحدی کتابوں کی ترتیب وتدوین میں تو محنت کرتے ہی تھے، طبع واشاعت میں بھی ایک ایک چیز کا خیال رکھتے۔ اس سلسلہ کا ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندستان کے تمام ممتاز اہل قلم اور نقادوں سے رابطہ قائم کیا۔ اپنے والد کے مجموعہ کلام اور نثری تصنیفات ان کو فراہم کیں اور ان سے مضامین لکھوائے اور یہ کام وہ مسلسل انجام دیتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نشور صاحب کی جو کتابیں انہوں نے شائع کیں، سب میں ان کے مضامین دیباچے اور تمہید وتقریظ وغیرہ شامل ہیں۔ انہوں نے جن اہل قلم سے مضامین یا دیباچے لکھوائے ان کے نام یہ ہیں۔

محمد عثمان عارف گورنر اتر پردیش، پروفیسر انور صدیقی، ڈاکٹر نثار فاروقی، ایم امیر شرر، سرسوتی سرن کیف، نظیر صدیقی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، فطرت کاکوروی، انعام درانی، ڈاکٹر احمر لاری، شمس الرحمٰن فاروقی، چودھری مبارک علی، شفاعت علی صدیقی، ڈاکٹر رضوان، سرفراز

علوی، ڈاکٹر طارق حسن، پروفیسر عتیق صدیقی، ڈاکٹر محمد ارشد خاں، عبدالقوی دسنوی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، ڈاکٹر سید عبدالباری، پروفیسر ابوالحسنات، مولانا شمس تبریز خاں، پیام فتح پوری، نامی انصاری، کوثر جائسی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی وغیرہ۔

یہ ان اہل قلم کے اسمائے گرامی ہیں جن سے نیاز واحدی نے رابطہ کر کے نشور واحدی کی کتابوں پر مضامین، دیباچے اور مقدمے لکھوائے اور نشور صاحب کی کتابوں میں شامل کر کے انہیں شائع کیا۔ اگر انہیں جمع کر دیا جائے تو نشور واحدی کے فکر وفن اور کاوشوں پر ایک عمدہ اور مبسوط کتاب آجائے گی۔ آخر میں نیاز صاحب کا یہی خیال تھا کہ میں انہیں جمع کر کے کتابی صورت میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کرادوں۔

تاریخ فلسفہ خودی نیاز واحدی کی آخری اشاعت تھی۔ ضد کر کے اس کا فلیپ مجھ سے لکھوایا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

> ''مولانا نشور واحدی مرحوم اردو شعر وادب میں اپنے عہد کی ایک منفرد آواز تھے۔ ان کا شعری سرمایہ قابل فخر اور نازش شعر وادب ہے۔ ان کی مثالی شاعری کی طرح ان کا نثری سرمایہ بھی افادیت کا حامل ہے۔ افسوس ہے کہ اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ دانش آخرالزماں، تاریخ فلسفہ خودی، ہندوستان میں فلسفہ خودی کا ارتقا اور رمز معانی ان کی اہم نثری کاوشیں ہیں۔
>
> فلسفہ خودی کا تصور اور اس کی تاریخ پر مولانا نشور واحدی مرحوم کی بڑی گہری اور باریک نظر تھی، ان کی کتاب تاریخ فلسفہ خودی اپنے موضوع پر ایک اہم علمی کاوش ہے۔ اس میں انہوں نے فلسفہ خودی کی پوری تاریخ بڑی جامعیت کے ساتھ سپرد قلم کی ہے۔ جس سے اس کے تمام نشیب وفراز اور اس کی خوبیاں پورے طور پر واضح ہو جاتی ہیں۔
>
> اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک اہم اور گراں قدر تصنیف ہے۔ اس کا مطالعہ آج بھی افادیت سے خالی نہیں ہے۔
>
> فلسفہ خودی کی جدید اشاعت پر نشور واحدی مرحوم کے صاحبزادے

جناب نیاز واحدی صاحب قابل ستائش اور اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں''۔

نیاز واحدی کے بعد اپنے والد کے شعر و ادب سے دلچسپی لینے والا اردو ادب میں شاید ہی کوئی اور شخص ملے جس قدر نیاز واحدی نے دلچسپی لی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے والد کی ادبی کاوشوں کی طبع و اشاعت کا کام جس بڑے پیمانہ پر انجام دیا، اس کی دوسری مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

میرے دوست ڈاکٹر محمد ارشد خاں نے نشور واحدی کی شخصیت اور شاعری پر گورکھپور یونیورسٹی میں ڈاکٹر احمر لاری مرحوم کے زیر نگرانی تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔ اس مقالہ کی ترتیب و تدوین اور اشاعت سے بھی انہوں نے بڑی دلچسپی لی اور وہ ڈاکٹر محمد ارشد خاں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ بھی ان کا بڑا خیال رکھتے۔ چھٹیوں میں پابندی سے ان سے ملاقات کے لئے جاتے۔ پہلے وہ جب کانپور میں رہتے تھے کانپور جاتے، پھر جب وہ لکھنؤ منتقل ہوئے اور ان کا قیام اپنی بہن ثروت واحدی کے ساتھ ہو گیا تو وہ لکھنؤ جانے لگے۔ نشور صاحب کی کتابوں کی پروف خوانی اور تصحیح میں بھی ڈاکٹر محمد ارشد خاں حصہ لیتے۔ نیاز واحدی مرحوم کو ان پر اتنا اعتماد ہو گیا تھا کہ ان کے دیکھے بغیر کوئی کتاب طباعت کے لئے نہ دیتے۔

ڈاکٹر محمد ارشد ہی کے توسط سے میں نیاز واحدی کے حلقہ احباب میں شامل ہوا اور پھر آہستہ آہستہ ان کے قریب ہوتا چلا گیا۔ حتیٰ کہ ان سے گفتگو معمولات میں شامل ہو گئی۔ بلا ناغہ فون کرتے اور ڈھیروں باتیں کرتے اور یہ ضرور کہتے کہ کاش آپ مجھے پہلے ملے ہوتے تو میں نشور صاحب پر اور زیادہ کام کرانے میں کامیاب ہوتا، گویا ابھی انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ کم تھا۔

اس دور آخر میں ڈاکٹر احمر لاری نے انہیں کلیات نشور واحدی کی اشاعت کا مشورہ دیا اور پھر خود ہی ایک خاکہ بنا کر ان کے حوالہ کیا۔ جسے نیاز واحدی نے حرز جاں بنالیا اور اب رات دن اسی کی فکر میں غلطاں رہنے لگے۔ یہ کلیات تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصہ میں کلیات غزلیات نشور، دوسرے حصہ میں کلیات منظومات نشور اور تیسرے حصہ میں کلیات نثر نشور۔ بہت جلد انہوں نے اس کا آغاز کر دیا۔ پہلے دونوں حصوں کا کام خود اپنے ذمہ لیا اور آخر الذکر کا ذمہ مجھے سونپا۔ میں نے ابھی یہ کام شروع بھی نہیں کیا تھا کہ ان کا ایک روز فون آیا اور کہا کہ میری ایک گذارش یہ ہے

کہ آپ ایک کتاب نشور واحدی پر لکھ دیں۔ چوں کہ میں ان دنوں مطالعات شبلی کے متعدد حصوں کی تکمیل میں مصروف تھا اس لئے جلدی نہ کرنے کے وعدے پر حامی بھر لی، لیکن نیاز واحدی کہاں پیچھا چھوڑنے والے تھے۔ جلد ہی دوسرا منصوبہ لے کر حاضر ہو گئے اور کہنے لگے نشور صاحب پر مقالات کا ایک مجموعہ ''نشور واحدی نقادوں کی نظر میں'' مرتب کر دیں، اس سلسلہ میں آپ کو محض مضامین و مقالات کا انتخاب کر کے اس پر مقدمہ لکھ دینا ہے، بقیہ کام میرا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نشور صاحب پر جو مضامین لکھے گئے تھے ان میں متعدد کے عکس بھیجنا شروع کر دئے اور کئی مقالات بھیجے۔ میں نے بھی بعض احباب سے مضامین لکھوائے۔ ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ان کا نیا فرمان آیا کہ کلیات غزلیات نشور کی کمپوزنگ ہو گئی ہے۔ جلدی سے اس پر مقدمہ لکھ دو۔ میں نے معذرت کی اور کہا کہ مقدمہ آپ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب سے لکھوائیں۔ وہ اس وقت اردو کی آبرو ہیں اور ان جیسا وسیع المطالعہ اور صاحب نظر ادیب و نقاد کوئی دوسرا نہیں ہے، لیکن وہ نہ مانے اور بضد ہو گئے۔ چنانچہ سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ بہر حال وہ مقدمہ میں نے لکھ کر بھیج دیا، لیکن خائف تھا کہ خدا جانے انہیں پسند آئے یا نہیں۔ اس لئے کہ نشور واحدی کے بارے میں ان کا جذبہ عشق انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور ظاہر ہے وہ بات مجھ میں پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور نہ میں جذباتی ہو کر لکھ سکتا تھا۔ بہر حال لکھا اور وہ انہیں پسند آیا اور اسے انہوں نے بڑی اہمیت دی اور لوگوں سے مقدمہ کی تعریف کرتے رہے اور خود اپنے پیش لفظ میں اس کا ذکر کیا۔

کلیات غزلیات کو وہ ایک بار اور دیکھ کر پریس بھیجنا چاہتے تھے کہ گھر پر ایک دن یکا یک گر پڑے اور کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ اسپتال میں داخل ہو گئے۔ ذرا افاقہ ہوا اور گھر آئے تو بستر ہی سے کلیات منظومات حصہ دوم کی کمپوزنگ شروع کرا دی اور جب پروف آئے تو معلوم ہوا کہ بینائی بہت متاثر ہو گئی ہے اور چشمہ کام نہیں کر رہا ہے۔ اب وہ پھر آنکھوں کے علاج میں مبتلا ہوئے۔ کمزوری بھی بہت تھی۔ مستقل بیڈ پر رہنے کی وجہ سے جسم میں طرح طرح کی تکالیف پیدا ہو رہی تھیں۔ بہر حال ڈاکٹروں نے آنکھوں کا آپریشن علاج تجویز کیا۔ اس سلسلہ میں بھی دو ایک بار اسپتال گئے۔ ابھی وہ اسی سب میں پریشان تھے کہ ان کا وقت آخر آ پہنچا اور ۱۹ر مئی ۲۰۱۱ء کو وہ دائمی سفر پر روانہ ہو گئے۔

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ البتہ ڈاکٹر محمد ارشد خاں کلیات غزلیات نشور کا کمپوز مسودہ کمپوزر سے حاصل کرلائے اور اپنی دیرینہ محبت کے عوض مجھ سے کہا کہ آپ ایک نظر دیکھ لیں اور اپنے ادارہ سے شائع کرادیں۔ چنانچہ راقم الحروف نے اس ضخیم حصہ کو از سر نو دیکھا۔ مقدمہ تو پہلے ہی لکھ چکا تھا، چند سطری ابتدائیہ بھی لکھا اور اسے ادبی دائرہ اعظم گڑھ سے شائع کرادیا۔ اس کے تمام اخراجات ڈاکٹر محمد ارشد خاں نے ادا کئے۔ دوسرے حصوں کی اشاعت کے لئے بھی وہ کمر ہمت کسے ہوئے ہیں، مگر اس وقت ان کے حالات ساز گار نہیں۔ ورنہ وہ بھی شائع ہوجاتے۔ واقعہ یہ کہ وہ بھی نشور صاحب سے کم محبت نہیں کرتے۔

نیاز واحدی صاحب کیا گئے، انہیں کے ساتھ سارا منصوبہ چلا گیا، لیکن ان کی یادیں اور باتیں نہاں خانہ میں زندہ ہیں اور جب ان کی یاد آتی ہے تو بے حساب یاد آتی ہے اور تڑپا دیتی ہے۔ میں نہیں بیان کرسکتا کہ میں کس کرب سے گذرتا ہوں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

[۱۰]

پروفیسر کبیر احمد جائسی کی یاد میں

ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر کبیر احمد جائسی [۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] کی شخصیت علم وادب اور تحقیق وتنقید کے لحاظ سے تو منفرد تھی ہی، رہن سہن، مزاج و مذاق اور اپنے طرز عمل کے لحاظ سے بھی بڑی پرکشش تھی۔ وہ ایسے شخص تھے جو بسی بسائی دنیا کے بجائے نیا چمن آباد کرنے کے قائل تھے۔ بالفاظ دیگر وہ نئی راہوں کے مسافر تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے علمی، ادبی اور تحقیقی کارناموں میں تنوع اور طرفگی ہے۔

بظاہر وہ عالم نہ تھے، مگر ایران کی تفسیروں پر انہوں نے جو معرکۃ الآراء کتاب لکھی ہے اور جو چار جلدوں پر مشتمل ہے، ان کے وسیع و عمیق مطالعے اور تفسیروں پر ان کی گہری نظر کی گواہی دیتی ہے۔ ان کا یہ کام ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

اردو اور فارسی ادب سے متعلق انہوں نے جو کتابیں لکھی ہیں، وہ ان کے گہرے ادبی و تنقیدی شعور کا نتیجہ ہیں اور بلاشبہ وہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ خاص طور پر حافظ شیرازی اور فانی بدایونی کی شخصیت اور شاعری پر ان کی نگارشات بڑی قابل قدر ہیں۔ جن کا اعتراف متعدد اہل علم نے کیا ہے۔

ان کے خاکوں کے دو مجموعے ''ڈھونڈھو گے انہیں'' اور ''نقوش جاواں'' شائع ہوئے۔ ایک ان کی زندگی میں شائع ہوا جبکہ دوسرا ان کی وفات کے بعد ڈاکٹر شباب الدین صاحب [صدر شعبہ اردو شبلی نیشنل پی. جی کالج، اعظم گڑھ] کی ترتیب و تدوین اور تقدیم کے ساتھ منظر عام پر آیا۔ اس میں انہوں نے جن شخصیات کے خاکے لکھے ہیں، ان کی علمی و عملی زندگی اور خدمات کا دائرہ وسیع اور متنوع ہے، باوجود اس کے جائسی صاحب نے ان خاکوں میں ان کی ایسی خوب صورت

مصوری کی ہے کہ ان کی شخصیت کے تمام بنیادی خدوخال پورے طور پر نمایاں اور ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ جائسی صاحب کو خاکہ نگاری پر بڑا عبور حاصل تھا۔آئندہ جب کبھی خاکہ نگاروں کا تجزیہ ہوگا اور ان کی تاریخ لکھی جائے گی تو جائسی صاحب کی کاوشوں سے صرف نظر کرنا آسان نہیں ہوگا۔

کبیر جائسی صاحب شاعر بھی تھے اور اچھے اشعار کہتے تھے۔ان کا پہلا شعری مجموعہ ''صحرا صحرا'' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ بعد میں انہوں نے ''جاویداں مضراب'' شائع کیا۔ جو اصلاً ایک انتخاب ہے۔اس میں ان کا تمام اہم کلام آ گیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلند رتبہ شاعر اور سخن سنج تھے۔البتہ انہوں نے شاعری کی طرف پوری توجہ نہ دی۔ ورنہ اس سے ان کی ایک نئی شناخت قائم ہو سکتی تھی۔

جائسی صاحب کا شعری نام صبا جائسی تھا۔اسی نام سے وہ دور طالب علمی میں شاعری کرتے رہے۔اعظم گڑھ میں یحییٰ اعظمی سے اصلاح لی۔علی گڑھ پہنچے تو متعدد اہم ادباء وشعراء کے یارانہ نے اس میں تازگی پیدا کی۔آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں میں کس قدر طرفگی تھی کہ اس کی داد پروفیسر آل احمد سرور نے دی۔

جائسی صاحب مختلف اوقات میں شبلی کالج میگزین ، ماہنامہ ادیب علی گڑھ، ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ اور ماہنامہ کانفرنس گزٹ علی گڑھ سے وابستہ رہے۔اہتمام سے ان کے اداریے،مضامین لکھے۔اس سلسلے کا ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے مذکورہ رسائل کے معیار سے کسی طرح کا تغافل نہیں برتا، بلکہ ان کے معیار کو بلند کرنے اور ان میں تنوع پیدا کرنے کی کوشش کی۔اردو رسائل کے مطالعے اور ان پر تحقیق وریسرچ کے کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں جائسی صاحب کی خدمات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔اور اس سے بھی زیادہ ضروری ایک کام ان کے مضامین ومقالات کی ترتیب وتدوین اور اشاعت ہے۔امید ہے اس کی طرف توجہ خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔ان کے عزیز شاگرد ڈاکٹر شباب الدین صاحب سے اس کی بجا توقع کرنا شاید نامناسب نہ ہو۔

پروفیسر جائسی صاحب کی خدمات میں ان کی ''عبدالسلام شناسی'' بھی شامل ہے۔ وہ

جب شبلی کالج اعظم گڑھ کے طالب علم تھے اس وقت ادیب شہیر مولانا عبدالسلام ندوی کے قریب آئے۔ ان کی محفلوں کا حصہ بنے اور ان سے استفادہ کیا اور ان کی عظمت دل و دماغ میں پیوست ہوئی تو اس طرح پیوست ہوئی کہ آخر آخر تک نقوش جاوداں بنی رہی۔ انتقال سے دو روز پہلے انہوں نے راقم سے جو گفتگو کی وہ بھی مولانا عبدالسلام ندوی ہی سے متعلق تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ادبی دنیا کو مولانا عبدالسلام ندوی کے ادبی کارناموں سے مسلسل واقف کرانے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ وہ مدۃ العمر ان پر مضامین و مقالات لکھتے اور لکھواتے رہے۔ تقریباً ان کی تمام محفلوں میں کسی نہ کسی نوع سے اور کسی نہ کسی انداز سے مولانا عبدالسلام ندوی کا ذکر ضرور آ جاتا۔ میری ان سے پہلی شناسائی ان کی ایک کاوش ''مولانا عبدالسلام ندوی کی یاد میں'' سے ہوئی۔ اس کو انہوں نے جس خوبی اور مہارت سے مرتب کیا ہے وہ انہی کا حصہ تھا۔ یہ جان کر حیرت ہوگی کہ اسے جب انہوں نے مرتب کیا تھا اس وقت وہ شبلی کالج کے ایک طالب علم تھے اور ان کی عمر ۱۵؍سال تھی۔ اس سے بھی پہلے وہ ایک کتاب فانی کی شاعری پر لکھ چکے تھے۔ اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دور طالب علمی میں ان کے اندر کتنی پختگی، علمی سنجیدگی اور ادبی رعنائی آ چکی تھی۔ یہ جس زمانے کی بات ہے جب حضرت الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ دارالمصنّفین میں رفیق تھے۔ اسی زمانہ میں ان سے گہرے مراسم قائم ہوئے جو اخیر تک باقی رہے۔ حضرۃ الاستاذ ۱۹۶۶ء میں دارالمصنّفین سے جامعۃ الرشاد کے قیام کی وجہ سے علاحدہ کئے گئے۔ چنانچہ علاحدگی کے بعد وہ یکسو ہو کر جامعۃ الرشاد کے قیام و استحکام میں جٹ گئے۔ پروفیسر جائسی صاحب اگرچہ اس وقت اعظم گڑھ کو خیر باد کہہ چکے تھے، تاہم جامعۃ الرشاد کے قیام و استحکام میں انہوں نے بھی حصہ لیا۔ فروری ۱۹۸۲ء میں حضرۃ الاستاذ نے ماہنامہ الرشاد جاری کیا تو جائسی صاحب اس کے اولین مضمون نگاروں اور خریداروں میں تھے۔ علی گڑھ میں ماہنامہ الرشاد کا حلقہ بنانے میں برادر گرامی ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کے علاوہ انہوں نے بھی حصہ لیا اور یہ جذباتی رشتہ اخیر تک قائم رہا۔ ماہنامہ الرشاد کی ڈاک میں ان کے متعدد خطوط شائع ہوئے، جن میں ان کے مفید مشورے اور تجاویز شامل ہیں۔ ان کے درج ذیل مضامین اولاً ماہنامہ الرشاد ہی میں شائع ہوئے۔

۱۔ ہند اسلامی تہذیب کے ایرانی اور زردشتی عناصر۔ ستمبر ۱۹۸۲ء ص ۲۷-۴۳

۲۔فرقہ ملامتیہ سعید نفیسی کی نظر میں۔دسمبر ۱۹۸۵ء ص ۴۰-۵۰
۳۔ایران میں فارسی تفسیر نویسی۔قسط اول، اگست ۲۰۰۲ء ص ۶-۱۹
۴۔ " قسط دوم۔ستمبر اکتوبر ۲۰۰۲ء ص ۲۹-۳۸
۵۔ " قسط سوم۔نومبر دسمبر ۲۰۰۲ء ص ۲۶-۲۹

ماہنامہ الرشاد کے مئی ۱۹۸۳ء، مارچ اپریل ۱۹۸۴ء-مئی جون ۱۹۸۴ء-دسمبر ۱۹۸۷ء، اپریل مئی جون ۱۹۸۹ء، اکتوبر نومبر ۱۹۹۷ء، ستمبر اکتوبر ۲۰۰۰ء کے شماروں میں ان کے خطوط شائع ہوئے ہیں۔ یہ فہرست ۲۰۰۲ء تک کی ہے۔اس کے بعد بھی انہوں نے مولانا مرحوم کو متعدد خطوط لکھے جو الرشاد میں شائع ہوئے۔

جائسی صاحب کی جب کوئی کتاب شائع ہوتی تو وہ ماہنامہ الرشاد میں تبصرے کے لئے ضرور بھیجتے۔ چنانچہ ان کی کئی کتابوں پر حضرۃ الاستاذ نے تبصرے کیے ہیں۔البتہ اخیر میں دو کتابوں پر برادر مکرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے تبصرے کئے۔ جائسی صاحب کی جن کتابوں پر ماہنامہ الرشاد میں تبصرے شائع ہوئے، ان کی فہرست یہ ہے:

۱۔انعکاس۔تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی۔ جولائی ۱۹۸۷ء ص ۵۷-۶۰
۲۔تاجیکی ادبیات کے بانی، تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی، جولائی اگست ۱۹۸۹ء ص ۷۱-۷۲
۳۔جدید تاجیکی شعراء۔تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی۔نومبر ۱۹۹۱ء ص ۴۴-۴۵
۴۔چند ایران شناس۔تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی۔دسمبر ۱۹۹۲ء ص ۴۶
۵۔محمد اقبال۔تبصرہ مولانا مجیب اللہ ندوی۔مئی ۱۹۸۳ء ص ۶۰
۶۔ایرانی تصوف۔تبصرہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی۔نومبر ۱۹۹۴ء ص ۴۷-۴۹
۷۔ایران کی چند اہم فارسی تفسیریں۔تبصرہ ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی۔ جولائی اگست ۱۹۹۷ء ص ۷۵-۷۷

۱۹۹۴ء میں حضرۃ الاستاذ نے راقم الحروف کو ماہنامہ الرشاد کی مجلس ادارت میں شامل کیا اور آہستہ آہستہ تقریباً پورا رسالہ میرے ذمہ کر دیا۔اس دوران انہوں نے راقم سے متعدد مضامین و مقالات لکھوائے اور اہل علم سے خط و کتابت کرائی۔اسی تعلق سے راقم نے پروفیسر کبیر احمد جائسی

صاحب کو بھی خطوط لکھے۔ اصلاً یہیں سے ان سے با قاعدہ تعلق کا آغاز ہوا، جو اخیر تک باقی رہا۔ ان سے تقریباً ۱۵-۱۷ر برس خط و کتابت رہی افسوس کہ ان کے متعدد خطوط محفوظ نہیں رہے۔ چند خطوط جو دست بردز مانہ سے محفوظ رہ گئے ہیں، انہیں یہاں نقل کیا جاتا ہے:

[۱]

علی گڑھ

۵/اپریل ۲۰۰۰ء

مکرمی سلام مسنون

میں یہ خط ایک علمی ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ اس پر توجہ دیں گے۔ مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب مجھ کو الرشاد بھجواتے ہیں، مگر ڈاک کی بدنظمی سے تمام شمارے مجھ تک نہیں پہنچ پاتے۔ اس سال جنوری کا شمارہ غائب ہوا، فروری کا ملا اور مارچ کا آج تک نہیں آیا۔ آئندہ کی خبر خدا جانے۔ جنوری کے شمارے سے مولانا کے مضمون کی پہلی قسط اور مارچ کے شمارے سے آپ کا مضمون پڑھنا چاہتا ہوں۔ اگر ممکن ہو سکے تو یہ دونوں شمارے کسی طرح مجھ کو بھجوا دیجئے۔

امید ہے آپ اپنے علمی کاموں میں مشغول ہوں گے۔ والسلام

مخلص

کبیر احمد جائسی

---

[۲]

علی گڑھ

۲۸/اپریل ۲۰۰۰ء

مکرمی سلام مسنون

آج کل بیمار ہوں اس لئے جواب میں دیر ہوئی۔ آپ کا بھیجا ہوا الرشاد کا پیکٹ [جنوری اور مارچ] ملا۔ شکریہ۔ اپریل کا آج تک نہیں ملا۔ کہاں تک شکایت کروں۔

ایک ضروری کام یہ کریں کہ مولانا مسعود علی ندوی کے انتقال پر مجیب اللہ صاحب ندوی

نے ایک خاصہ طویل مضمون قومی آواز لکھنؤ (اس وقت تک دہلی ایڈیشن کا وجود نہ تھا] میں شایع کروایا تھا۔ اس کو تلاش کر کے الرشاد میں شایع کر دیں۔ ورنہ کل کو ان کے بارے میں کوئی بتلانے والا نہ ملے گا۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں نے بمبئی کے ایک ماہنامہ ''زادسفر'' [نومبر ۱۹۹۹ء؟] میں شایع کروائی تھی، مولانا اگر اجازت دیں تو اس کو آپ بھی شایع کر دیں۔ دلچسپ تحریر ہے۔

مولانا کی خدمت میں آداب، امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۴-۱۹۶۷ء]، علامہ شبلی کے شاگرد عزیز اور دارالمصنّفین کے معماروں میں تھے۔ ان سے حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] کو غایت تعلق تھا۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے قومی آواز لکھنؤ میں ایک مفصل مضمون لکھا تھا، تلاش بسیار کے باوجود وہ مضمون دستیاب نہ ہوسکا بلکہ اب تک اس کا سراغ نہیں ملا، ممکن ہے کسی اہل علم کے ذخیرہ میں قومی آواز کی وہ فائل محفوظ ہو تو از راہ کرم اس کی کاپی فراہم کریں۔ بڑی نوازش ہوگی۔ پروفیسر جائسی نے اپنے خط میں اسی مضمون کا ذکر کیا ہے۔

[۳]

علی گڑھ

۷/اگست ۲۰۰۰ء

مکرمی سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ آپ کے دریافت کرنے پر لکھ رہا ہوں کہ مجھ کو جولائی کا الرشاد نہیں ملا ہے، اگست کا تو ابھی چھپا ہی نہ ہوگا۔

آپ مولانا مجیب اللہ صاحب سے ایک وقت مقرر کر کے روزانہ بلا ناغہ ان کے پاس بیٹھ جایا کریں اور ان سے ان کے زمانے کے دارالمصنّفین کے بارے میں مواد حاصل کیا کریں اور

بعد میں اس کو ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کر دیں۔ اگر مولانا راضی ہو جائیں تو آپ سوالات نہ کریں بلکہ مولانا خود ہی کتاب املا کرانا شروع کر دیں اور گفتنی ناگفتنی سب لکھا ڈالیں جب مسودہ تیار ہو جائے تو اس پر مولانا نظر ڈال کر کتاب شایع کروادیں۔

اگر یہ کام میں کروں گا تو گفتنی کا عنصر کم اور ناگفتنی کا زیادہ ہوگا۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ یہ کام خود مولانا کی نگرانی میں ہو جائے۔ ان سے میرا اسلام کہیے گا۔

والدعا

کبیر احمد جائسی

پس نوشت: اب سال میں ایک مضمون سے زیادہ نہیں لکھ پاتا اس کو بھی تحقیقات اسلامی والے ''مار'' لے جاتے ہیں۔

مولانا مرحوم نے اخیر زندگی میں اپنی خودنوشت ''نقوش زندگی'' لکھنا شروع کیا تھا، جس کی کئی قسطیں ماہنامہ الرشاد میں شائع ہوئیں۔ یہ سلسلہ منقطع ہونے پر جائسی صاحب نے یہ خط لکھا تھا مگر مولانا املا کرانے کو راضی نہ ہوئے بلکہ یہ فرماتے تھے صحت کے لئے دعا کرو خود ہی لکھوں گا۔ املا کرانے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو لکھنے میں ہوتی ہے۔ مگر افسوس کہ مولانا صحت یاب نہ ہو سکے اور ایک ماہ مسلسل کومہ میں رہنے کے بعد ۱۲/ مئی ۲۰۰۶ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میری، ڈاکٹر نعیم صدیقی ندوی اور پروفیسر جائسی صاحب کی ''نقوش زندگی'' کے مکمل ہونے کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر عبداللہ عمار نے نقوش زندگی کو نامکمل ہی شائع کرایا ہے۔

[۴]

علی گڑھ

۱۱/ جون ۲۰۰۱ء مکرمی سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ اس سے پہلے آپ کا کوئی خط مجھ کو نہیں ملا ورنہ جواب نہ دینے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ آپ نے جو مضامین طلب کیے ہیں ان کے بارے میں عرض ہے کہ

۱۔تعمیر انسانیت لاہور کا فائل میرے پاس محفوظ نہیں ہے، اس لئے ''دارالمصنّفین کے بہاری رفقاء'' کی قسطیں بھیجنے سے قاصر ہوں۔ یاد پڑتا ہے کہ مولوی عبدالباری صاحب مرحوم نے دارالمصنّفین میں اس کی جلدیں محفوظ کروادی تھیں وہاں دیکھ لیجئے۔

۲۔نگار میں مولانا عبدالسلام ندوی پر جو مضمون شایع ہوا تھا وہ دسمبر ۱۹۶۱ء کے ادیب میں شامل ہے۔

۳۔ادیب کے تین سال کے شمارے میرے پاس ہیں۔ دو بار ان کی جلد کٹوا چکا ہوں، کاغذ اتنا خستہ ہوگیا ہے کہ مزید کٹوانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں ادیب کا ہر شمارہ دارالمصنّفین بھیجتا رہا ہوں، آپ وہاں نظر ڈالیں آپ کو دسمبر ۱۹۶۲ء اور مارچ ۱۹۶۳ء کے شمارے ضرور مل جائیں گے۔ اگر نہ ملیں تو مطلع کریں میں جلد تو نہ کٹواؤں گا کسی سے نقل کروا کے بھیج دوں گا۔ آپ کی کتاب مل گئی ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی اللہ تعالیٰ آپ سے مزید خدمات لے۔ آمین۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ والسلام

کبیر احمد جائسی

---

[۵]

علی گڑھ

۱۱/۷/۲۰۰۱ء محترمی سلام مسنون

مجھے آپ کے خط کا انتظار ہے۔ کیا آپ کو مطلوبہ مضامین مل گئے یا میں ان کو کسی سے نقل کروا کے بھیجوں؟ اس خط کو پاکر فوراً جواب دیجئے۔ آئندہ سے خط و کتابت اوپر دیئے ہوئے پتہ پر کریں۔ خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔ والسلام

کبیر احمد جائسی

---

[۶]

علی گڑھ

۲۰۰۱/۸/۲۶ء

عزیزی دعائیں

یہ خط ایک ضرورت کے تحت لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ جلد سے جلد مطلوبہ کام کر دیں گے۔ مجھ کو اگست، ستمبر ۱۹۸۱ء کے الرشاد میں شایع ہونے والے ظفر احمد صدیقی کے مضمون ''علوم دینیہ اور مطبع نولکشور'' کی الکٹرواسٹیٹ کروا کر ارسال فرمائیں۔

شباب الدین سے ملاقات ہو تو شکایت کر دیں کہ میں ان کو دو خط لکھ چکا ہوں مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مولانا سے میرا سلام کہیں۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

پس نوشت: پہلی یا دوسری قسط کے آخر میں نوٹ ہوگا بقیہ ص۰ پر بقیہ حصہ چھوٹنے نہ پائے۔

---

[۷]

علی گڑھ

۲/ستمبر۲۰۰۲ء مکرمی سلام مسنون

آپ کا ۲۳/جولائی کا لکھا خط مجھ کو آج یعنی ۲/ستمبر کو رضی الاسلام صاحب نے لا کر دیا۔ لفافہ پر علی گڑھ کی بہت صاف مہر ۲۷/جولائی کی ہے۔ ۲۷/جولائی سے یکم ستمبر تک لفافہ کہاں رہا، خدا جانے، یکم کو رضی الاسلام صاحب کو ملا اور انہوں نے بلا تاخیر لفافہ مجھ تک پہنچا دیا۔ ودیا مہا سبھا کا پتہ مجھ کو بھی نہیں معلوم۔ گجرات کے احباب کو لکھ رہا ہوں اگر معلوم ہو گیا تو مطلع کروں گا۔

آپ کا خیال درست ہے۔ گذشتہ پانچ برسوں میں میری پانچ کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آئی ہیں۔ تین پاکستان سے شایع ہوئی ہیں، دو ہندوستان سے۔ میں نے اب اپنی کتابوں کو تبصرہ کے لئے بھیجنا بند کر دیا ہے، وجہ یہ ہے کہ کم از کم ۴۰۰ روپئے کی کتابیں ہوتی ہیں، لگ بھگ چالیس روپیہ ڈاک خرچ لگ جاتا ہے۔ پھر آٹھ دس مہینے کے بعد آدھے صفحے کی جو ''بقراطی'' پڑھنے کو ملتی

ہے اس سے طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ اس لئے میں کسی رسالے کو تبصرے کے لئے کتابیں نہیں بھیجتا۔ آپ کی اطلاع کے لئے لکھ دوں میری ایک کتاب ''حافظ شخص اور شاعر'' آٹھ نو مہینے سے معارف میں تبصرے کے لئے پڑی ہوئی ہے مگر آج تک تبصرہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ واضح رہے کہ یہ کتاب میں نے نہیں ناشر نے تبصرے کے لئے بھیجی تھی اس لئے مجھے کوئی شکایت بھی نہیں ہے۔

مولانا نجم الدین اصلاحی، مولانا مجیب اللہ ندوی اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے بہت سارے خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ ان کو دھیرے دھیرے کر کے مرتب کرنے کا خیال ہے، اگر یہ کام ہو گیا تو ایک عبرت ناک تاریخ دنیا کے سامنے آ جائے گی۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

راقم نے سہ ماہی فکر و نظر علی گڑھ میں مولانا سید ابوظفر ندوی [۱۸۹۱-۱۹۵۸ء] سابق رفیق دارالمصنّفین پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا، جائسی صاحب نے اس پر استدراک لکھا ہے اس میں انہوں نے ابوظفر صاحب سے متعلق چند نئی باتیں لکھی تھیں۔ اس میں مولانا کی بعض تحریروں کا بھی ذکر تھا۔ راقم نے اس کی تفصیل کے لئے جو خط لکھا تھا جائسی صاحب کا مذکورہ خط اسی کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس خط میں عبرت ناک تاریخ کا معاملہ یہ ہے کہ دارالمصنّفین کے رفقاء و نظماء کے درمیان جو اندرونی چپقلش اور تنازعات ہوتے تھے اس کی تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی اور مولوی مسعود علی ندوی کے اختلافات، مولانا سید ریاست علی ندوی اور مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی دارالمصنّفین سے علاحدگی وغیرہ۔

---

[۸]

ساجدہ منزل، اقرا کالونی

نیوسر سید نگر علی گڑھ　　　　گرامی منزلت سلام مسنون

تقریباً ایک ماہ قبل میں نے اپنی کتاب ''ڈھونڈھو گے انہیں'' کا ایک نسخہ اور آپ کے نام

ایک خط دستی بھیجا تھا۔ یہ دونوں چیزیں لے جانے والے صاحب سرائے میر کے ایک صاحب کو دے آئے تھے کہ آپ کو بھجوا دیں۔ دریافت طلب امر یہ ہے کہ میرا خط اور کتاب آپ کو ملی یا نہیں۔ دوسری بات یہ کہ مئی کے بعد الرشاد شایع ہوا ہے یا نہیں؟

اب آپ کی طبیعت کیسی ہے، خدا کرے آپ اچھے ہوں اور فعال بھی۔

والسلام

کبیر احمد جائسی

یہ خط اشاعت کے لئے نہیں ہے۔

---

[۹]

علی گڑھ

۱۵/جولائی ۲۰۰۳ء

الیاس صاحب سلام مسنون

لفافہ ملا ع

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

مولانا سے دست بستہ عرض کر دیں کہ میری کتاب ''ڈھونڈھو گے انہیں'' پر الرشاد میں کوئی تبصرہ شائع نہ کروائیں۔ از حد شکر گذار ہوں گا۔

امید ہے مولانا کی صحت معمول کے مطابق ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر قایم رکھے۔ آمین

مئی کے بعد سے الرشاد کا کوئی شمارہ نہیں ملا۔ شائع نہیں ہوا یا ڈاک میں ضائع ہوا؟

امید ہے آپ اچھے ہوں گے۔ والسلام

کبیر احمد جائسی

آخری خط کا پس منظر یہ ہے کہ پروفیسر کبیر احمد جائسی صاحب نے اپنے خاکوں کا مجموعہ

''ڈھونڈھو گے انہیں'' امین راحت چغتائی کے طویل تبصرے کے ساتھ بغرض اشاعت بھیجا تھا۔ حضرۃ الاستاذ نے کہا کہ یہ تبصرہ طویل ہے، اس لئے شائع نہیں ہوسکتا اور یہ بات میں جائسی صاحب کو دیرینہ تعلق کی بنا پر لکھ بھی نہیں سکتا۔ اس لئے تم ان کو لکھو کہ یہ تبصرہ بہت طویل ہے، اس لئے دوسرا تبصرہ شائع ہوگا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جائسی صاحب ناراض ہوں گے اور ہوا بھی یہی۔ انہیں خط لکھا گیا اور وہ ناراض ہوئے اور اس کے جواب میں مذکورہ خط لکھا۔ لیکن ایک جملے کے بعد پھر ان کا لب ولہجہ مشفقانہ ہوگیا ہے، گویا انہیں اصل بات سمجھ میں آ گئی، لیکن اس کے بعد ایک اور واقعہ پیش آ گیا، جس سے وہ مجھ سے سخت ناراض ہوئے بلکہ کئی برس ناراض رہے۔

۲۰۰۳ء میں بمبئی میں مولانا عبدالسلام ندوی سمینار منعقد ہوا، جس میں راقم الحروف بھی شریک تھا۔ اس سمینار میں پروفیسر جائسی صاحب کے مقالے کا عنوان مولانا عبدالسلام ندوی کی سات غیر مطبوعہ کتابیں تھا، جس کو انہوں نے بڑی محنت سے لکھا تھا اور بڑے اہتمام سے پیش کیا تھا، البتہ اخیر میں انہوں نے اس وقت کے دارالمصنّفین کے ناظم مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ کو مخاطب کر کے کہا کہ اب ضیاءالدین صاحب بتائیں کہ وہ مسودات کہاں گئے۔؟

میں نے ضیاءالدین صاحب کے دفاع میں جائسی صاحب سے کہا کہ یہ ان سے پوچھنے کا سوال نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو بہت بعد میں دارالمصنّفین کے ناظم ہوئے۔ یہ سوال تو آپ کو ان سے پہلے کے نظمائے دارالمصنّفین سے کرنا چاہئے تھا۔ غالبًا یہ بات جائسی صاحب کو کبیدہ کر گئی اور ان کی ناراضگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس زمانہ میں میرے علی گڑھ کے بعض دوستوں نے بتایا کہ جائسی صاحب سے جب ملاقات ہوتی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ تمہارے دوست ڈاکٹر الیاس کا مبلغ علم کیا ہے۔ مجھے ان کے اس رویے سے شدید تکلیف پہنچی، مگر ان کی شفقتوں کو یاد کر کے خیال ہوتا کہ یہ وقتی معاملہ ہے۔

۲۰۰۷ء میں مولانا عبدالسلام ندوی کے بھتیجے اور پیکر شرافت مولانا عبدالحسیب اصلاحی صاحب مدظلہ نے مولانا سعید انصاری کے چند خطوط مجھے عنایت کئے۔ مولانا سعید انصاری دارالمصنّفین کے قدیم رفیق، علامہ شبلی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے بڑے عقیدت کیش تھے۔ اخیر عمر میں انہوں نے ''حیات عبدالسلام'' لکھی تھی جو لاہور میں ان کی وفات کے بعد نہ معلوم کیا

ہوئی۔ ان کے مذکورہ خطوط اسی زمانہ تصنیف کے تھے۔ چنانچہ میں نے ایک نوٹ کے ساتھ انہیں ماہنامہ معارف میں شائع کرا دیا۔ ان خطوط میں بعض لوگوں پر کچھ چھینٹیں تھیں۔ اس میں ایک آدھ کا تعلق پروفیسر جائسی سے بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی اشاعت سے جائسی صاحب مجھ سے اور برہم ہو جائیں گے، مگر ایسا نہ ہوا بلکہ بڑا ہی شفقت کا معاملہ فرمایا۔ البتہ ان خطوط کے عکس مانگے جو انہیں فراہم کرا دئے گئے۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد نہ معلوم کیوں ان کی شفقتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اکثر فون کرتے اور کبھی کبھار میں بھی کر لیا کرتا۔ بڑی محبت فرماتے اور ہر دفعہ کچھ نہ کچھ مشورہ دیتے۔ میری کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' شائع ہوئی تو بڑی تحسین فرمائی اور دیر تک دعائیں دیتے رہے۔ دسمبر ۲۰۱۲ء میں علامہ شبلی کے نادر خطوط کا مجموعہ ''مکتوبات شبلی'' میرے تعلیقات وحواشی کے ساتھ شائع ہوا اور ان کی خدمت میں بھیجا تو بہت خوش ہوئے اور خاص طور پر میرے حواشی کی بہت تحسین فرمائی۔ دسمبر کے اواخر میں فون کر کے کہا کہ تم میرا ایک کام یہ کر دو کہ مولانا عبدالسلام ندوی نے تاریخ التنقید کے نام سے جو کتاب لکھی تھی اس کا مسودہ دارالمصنّفین میں موجود ہے اس کو کئی قسطوں میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے ادھر ادھر کر کے معارف میں شائع کیا ہے۔ دونوں کو ملا کر مرتب کر دو اور ایک مقدمہ لکھ کر میرے پاس فوراً بھیج دو۔ چنانچہ میں نے مطبوعہ مضامین کی کاپی کرائی اور ارادہ تھا کہ دارالمصنّفین جا کر مسودہ سے ملا لوں گا ابھی یہ کام کر بھی نہ سکا تھا کہ ۵/جنوری کو ان کا یاد دہانی کا فون آ گیا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ میری کتابوں پر معارف میں چھپے دو تبصروں کی ضرورت ہے، انہیں کاپی کرا کے بھیج دو۔ چنانچہ میں نے اپنے دوست ڈاکٹر جمشید احمد ندوی سے کہا کہ یہ دونوں تبصرے جائسی صاحب کو بھیجنے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ کیا بھیجیں گے، میں یہیں سے کاپی کرا کے انہیں دے دیتا ہوں، جس دن وہ دینے والے تھے اسی دن [۷/جنوری ۲۰۱۳] جائسی صاحب نے رخت سفر باندھا۔ انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔

افسوس کہ تاریخ التنقید کی ترتیب و تدوین کا کام میں اب تک نہ کر سکا۔ خدا اس کے کرنے کی توفیق بخشے اور جائسی صاحب مرحوم کی خواہشات کی تکمیل کا سامان کرے۔

---

[۱۱]

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی

ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی [۱۹۳۷-۲۰۱۳ء] ممتاز اہل قلم، ادیب، شاعر اور نقاد تھے، ادب اسلامی کے علم برداروں میں تھے اور مدۃ العمر اس حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ علم و ادب کے متنوع موضوعات پر مقالات اور کتابیں لکھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اردو زبان و ادب کے بڑے خدمت گذاروں میں تھے۔

شبنم سبحانی مرحوم ۷؍ستمبر ۱۹۳۷ء کو قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ کنزالعلوم ٹانڈہ میں حاصل کی۔ وہیں ترلوکی ناتھ کالج سے انٹر میڈیٹ پاس کیا۔ پھر اعلی تعلیم کے لئے گورکھپور یونیورسٹی گئے اور وہاں سے بی۔ اے اور اردو وانگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ پی ایچ ڈی لکھنو یونیورسٹی سے کی۔ درمیان میں کچھ دنوں تک اسلامیات کی تعلیم مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ اور رام پور میں حاصل کیں۔ رام پور ہی میں ادب اسلامی کے ادیبوں سے تعلق قائم ہوا اور ایسا مضبوط رشتہ قائم ہوا کہ دم واپسیں تک قائم رہا۔ اسی زمانہ میں وہ جماعت اسلامی کے رکن بنے اور اس میں سرگرم حصہ لینے لگے، لیکن سنہ ساٹھ کے عشرے میں بعض جزوی اختلاف کے سبب جماعت کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے، مگر جماعت ان کے دل ودماغ میں اس قدر رچ بس گئی کی اس نقطۂ نظر سے وہ کبھی دست بردار نہیں ہوئے۔

تحصیل علم کے بعد پہلے جون پور کے کسی کالج میں استاذ مقرر ہوئے، پھر اردو استاذ کی حیثیت سے ان کا باقاعدہ تقرر جی، ایس، پی، جی، کالج سلطان پور میں ہوا اور پھر یہیں ترقی کے وہ صدر شعبہ اردو ہوئے اور یہیں سے وظیفہ یاب بھی ہوئے۔ یہاں بے شمار طلبہ نے ان سے اپنی علمی تشنگی بجھائی۔ متعدد طلبہ نے ان کی زیر نگرانی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی اسناد لیں۔ وہ طلبہ سے

رسمی تعلق کے قائل نہ تھے، بلکہ ان سے گھل مل کر ان کے ذاتی مسائل و معاملات سے بھی دلچسپی لیتے اور ان کا ہر طرح سے تعاون کرتے۔

زمانہ طالب علمی میں انہیں شاعری کا چسکا لگا۔ شبنم سبحانی نام اختیار کیا اور پھر اسی نام سے تاعمر شاعری کرتے رہے۔ اسی نام سے ان کی نظمیں اور غزلیں شائع ہوئیں۔ ان میں ابتداء ہی سے ادبی مذاق تھا۔ اپنے ادبی و شعری ذوق کی وجہ سے دور طالب علمی ہی میں خاصے مشہور ہو گئے تھے۔ چنانچہ دور طالب علمی ہی میں لکھنو کے رسالہ ''نئی نسلیں'' کی مجلس ادارت کے رکن نامزد ہوئے۔ اس کے بعد ماہنامہ دوام ٹانڈہ کے مدیر مقرر ہوئے۔ بعد ازاں خود دوام نو جاری کیا۔ اس کی ترقی اور فروغ و اشاعت کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ اداریوں کے علاوہ متعدد شخصیات پر مضامین لکھے جو بعد میں ''انوکھے لوگ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ دوام اور دوام نو کے لئے انہوں نے ممتاز علماء اور دانشوروں کے انٹرویو کئے جو بعد میں ملاقاتیں کے نام سے انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

وظیفہ کے بعد اپنی تمام تگ و دو خدمت ادب کے لئے وقف کر دی تھی۔ دہلی میں ادارہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے روح رواں وہی ٹھہرے اور تقریباً پون صدی تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دئے۔ ادب اسلامی کے ترجمان ماہنامہ ''پیش رفت'' کے وہ برسوں مدیر رہے۔ چنانچہ ایک عرصہ تک اس کے لئے اداریئے، مضامین اور تبصرے لکھے۔ ان کے اداریوں کا ایک مجموعہ روشنی بکھرتی ہے شائع ہو چکا ہے۔

شبنم سبحانی صاحب آل انڈیا ملی کونسل کے سے بھی وابستہ رہے۔ خاص طور پر اس کے رسالہ ماہنامہ ملی اتحاد کی برسوں ادارت کی۔ اس کے لئے مضامین، اداریوں اور تبصروں کے ساتھ سیاسی مضامین بھی لکھے۔

ڈاکٹر محمد منظور عالم کے ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز دہلی سے بھی وابستہ رہے اور اس کے بعض تصنیفی پروجیکٹ پر کام کیا۔ وہاں سے ان کی کئی کتابیں منظر عام آئیں۔ سبحانی صاحب مرحوم کے ہاتھ میں قلم مدۃ العمر رہا اور ان کے قلم سے متعدد اہم کتابیں اور قیمتی مقالات نکلے اور شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ان کی کتابوں کے نام یہ ہیں:

[۱] لکھنو کا شعر و ادب (ثقافتی و معاشرتی تناظر میں) ۱۸۵۷ء تک

[۲] لکھنو کے ادب کا ثقافتی و معاشرتی مطالعہ ۱۹۴۷ء تک

[۳] ہندوستانی تہذیب اور اردو ادب

[۴] آزادی کے بعد اردو شعر و ادب

[۵] ادب اور وابستگی

[۶] نقد نو عیار

[۷] افکار تازہ

[۸] کاوش نظر

[۹] آداب شناخت

[۱۰] نئی خوشبو نئے خواب۔۲۰۱۰ء

[۱۱] بیسویں صدی کے اردو ادب کا جائزہ۔۲۰۱۱ء

[۱۲] ملاقاتیں (انٹرویو)

[۱۳] اسمائے حسنیٰ اور انسان سازی۔۲۰۰۵ء

[۱۴] آزاد ہندوستان میں مسلم تنظیمیں ۲۰۰۱ء

[۱۵] جلوے بے شمار (سفرنامہ حج)

[۱۶] جمہوریت، انسان دوستی اور اسلام

[۱۷] دہشت گردی اور اسلام

[۱۸] اسلام میں آداب اختلاف

[۱۹] اردو ادب کا تہذیبی تناظر۔۲۰۱۲ء

[۲۰] انوکھے لوگ

[۲۱] تراوش خیال

[۲۲] فکر انگیز (نظموں کا مجموعہ) ۲۰۰۹ء

[۲۳] طرب خیز (مجموعہ غزلیات) ۲۰۱۰ء

ان کتابوں کے موضوعات اورعنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شبنم سبحانی صاحب کے یہاں کس قدر تنوع تھا اور انہوں نے کن کن میدانوں میں دادِ تحقیق وتصنیف دی اور کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دئے۔شبنم سبحانی صاحب اگر چہ کم گو تھے اوران کی زندگی بھر کی مشق سخن کا نتیجہ نظموں اورغزلوں کے محض دومختصر مجموعے ہیں،تاہم وہ قابل ذکر شاعر تھے۔وہ عالمی تناظر میں غوروفکر کرتے اور عالمی مسائل پران کی متعدد نظمیں ہیں۔جس میں وہ کہیں انسانیت کی زبوں حالی پرآنسو بہاتے ہیں اور کہیں انسانیت کی پامالی پر جھنجھوڑتے ہیں اورانسانوں کوانسان بننے کا مشورہ دیتے ہیں۔استعماری طاقتوں کوانسانی تہذیب کا آئینہ دکھاتے ہیں۔

شبنم سبحانی صاحب فن سے زیادہ فکر کے قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فن پر ذرا کم ہی توجہ دی،لیکن فکری اعتبار سے وہ بڑے سرمایہ دار ہیں۔خاص طور پران کی نظمیں آج بھی دلوں میں گرمی اورحرارت پیدا کرتی ہیں۔

ان کی غزلوں میں سوز وگداز کم نہیں۔وہ گیسوئے تابدارکواور بھی تابدار کرنے کے متمنی ہیں۔ان کی غزلوں میں بھی انسانی رویوں اورانسانی قدروں کے تحفظ کی بات ہے۔اوران کے یہاں حوصلوں کی بھی کمی نہیں ہے:

کیا فکر جو ماحول غم انگیز بہت ہے
محفل کی فضا تیری طرب خیز بہت ہے
سرکش ہے ہوالاکھ،فضالاکھ ہے ناساز
لو مشعل ایماں کی مگر تیز بہت ہے

شبنم سبحانی صاحب کے خیالات واضح ہیں۔فلسفیانہ اینچ پینچ نہیں۔وہ ایمان ویقین کی شاعری کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں وہ مبلغ نظرآتے ہیں۔مبالغہ اورفرضی حسن وعشق ، مبالغہ اورتغافل کا ان کے یہاں گذر نہیں۔وہ انسانیت اورانسانی قدروں کے علمبردار ہیں اور یہی بنیادی طور پران کا موضوع شاعری ہے۔ان کی انسانیت نوازی دراصل اسلامی اصول واقدار کی پاسداری ہے اوراسلام ہی ان کا سب کچھ ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ اسلامی قدروں کی پامالی پر تڑپ جاتے ہیں۔افسوس ابتک ان کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ وتجزیہ نہیں کیا جاسکا ہے۔

اسلام پسند ادیبوں کے حلقہ میں علامہ شبلی ان کی ایک محبوب شخصیت رہے ہیں اوران کی شخصیت اور فکروفن بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔شبنم سبحانی نے بھی ان پر دو اہم مقالات اور ایک گراں مایہ نظم ''نذرشبلی''لکھی ہے۔

ادب کی مملکت صدیوں کرے گی ناز شبلی پر
زباں کو میری کیا کیا فخر ہے دمساز شبلی پر

سنادنیا نے اس سے شوکت اسلام کا قصہ
زمانہ مدتوں کرتا رہے گا ناز شبلی پر

شبنم سبحانی مرحوم سے میرے مراسم کا آغاز حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی مجالس سے ہوا۔سبحانی صاحب ان کے عقیدت مند تھے اورملاقات کے لئے گاہے بگاہے تشریف لایا کرتے تھے۔الرشاد میں ان کا ایک مضمون اورمتعدد خطوط شائع ہوئے ہیں۔مولانا مرحوم مضامین کے سلسلہ میں ان کی رائے کو اہمیت دیتے اوراکثر ان کے خطوط شائع کردیا کرتے تھے۔ان کی وفات کے بعد بھی شبنم سبحانی صاحب نے مجھ سے تعلق باقی رکھا اوررواداری نبھائی۔یہ ان کی خوبی تھی۔ان میں پندارنام کو نہ تھا۔وہ جب اعظم گڑھ آتے تو مجھے پہلے ہی فون کردیتے تھے اور ملاقات کی سبیل پیدا کرلیتے۔اکثر اپنی نئی مطبوعات بطور تحفہ لاتے۔بعض کتابیں انہوں نے ڈاک سے بھی بھیجیں۔وہ علامہ شبلی سے متعلق میرے علمی کاموں کے بڑے مداح تھے۔اوران پر انہوں نے تبصرے بھی لکھے ہیں۔ان کے مقالات کا ایک مجموعہ ''ادب اوروابستگی''ہے،جو بہت پہلے شائع ہوا تھا۔اس میں ایک مضمون علامہ شبلی کے بھائی مہدی حسن بیرسٹر[م:۱۸۹۷ء]اوران کے مکاتیب لندن پر انہوں نے لکھا تھا،اس کی مجھے ضرورت تھی۔میں نے ذکر کیا تو کہیں سے حاصل کرکے بھیجا۔اس سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا۔سبحانی صاحب نے اپنے مضمون میں مکاتیب مہدی کے کثرت سے اقتباسات نقل کئے ہیں۔ایک زمانہ میں بلکہ آج بھی کثرت سے اقتباسات نقل کرنے کو معیوب خیال کیا جاتا ہے،لیکن میرے لئے سبحانی صاحب کی یہی معیوب بات مفید ثابت ہوئی اورمیں مہدی حسن کے مکاتیب کی جمع وتدوین میں کامیاب ہوا۔اس کے

لئے میں نے شبنم سبحانی صاحب کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا۔ دیکھئے کیسے بھلے آدمی تھے، میں نے کثرت اقتباسات کی بات بھی ان سے کہہ دی اور وہ مسکرا کے رہ گئے۔ اب ایسے نیک دل اردو ادیب مشکل ہی سے ملیں گے۔

شبنم سبحانی صاحب مجھ سے بہت سینئر تھے۔ اس لئے ہم ان کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ وہ بھی اس کا بڑا خیال رکھتے۔ ہمیں اپنے تجربات و مشاہدات سے آگاہ کرتے۔ ہماری تحریریں پڑھ کر مفید مشورے دیتے اور کتابوں پر اچھی اور مثبت رائے دے کر ہمارا حوصلہ بڑھاتے۔ میری کئی کتابوں پر انہوں نے تبصرہ لکھا اور بڑی حوصلہ افزائی کی۔

وہ بڑے سادہ مزاج اور سادہ طبیعت تھے۔ نام و نمود اور صلہ و ستائش کی پروا کرتے کبھی نہیں دیکھا۔ کئی سمیناروں میں میرا ان کا ساتھ رہا، کبھی بلا وجہ ایک لفظ نہیں بولتے۔ دراصل وہ ہماری پرانی تہذیب اور باوقار قدروں کے علمبردار تھے۔ حق مغفرت کرے۔

میری ان سے خط و کتابت بھی رہی، مگر ان کے خطوط ضائع ہو گئے۔ جب میں اہل علم کے خطوط ''محبت نامے'' شائع کر رہا تھا اس وقت ان کا محض ایک خط ملا، جسے میں نے تبرک کے طور پر شامل کر لیا ہے۔ انہوں نے میری کتاب پر تبصرہ کیا تو میں نے شکریہ کے طور پر انہیں خط لکھا تھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''آپ کا خط ملا۔ کتاب پر تبصرہ اظہار حقیقت کے طور پر کیا تھا۔ تعریف تو عام طور پر لوگ اس کی کرتے ہیں، جس سے کچھ حاصل ہونے کی توقع ہو۔ یہاں بے لوث اظہار مسرت کا معاملہ ہے۔ ''آثار شبلی'' خدا کرے بحسن و خوبی منظر عام پر آ جائے۔ میرے مقالات کا مجموعہ ''نئی خوشبو نئے خواب'' اسی ہفتہ چھپ کر آ رہا ہے۔ آپ کو بھیجوں گا۔ معارف کو بھی ایک جلد جائے گی۔ آپ تبصرہ کیجئے گا۔ خدا کرے آپ جیسے علم دوست احباب سے بار بار ملنے کے مواقع ملتے رہیں۔ دارالمصنّفین کے ذمہ داروں تک سلام پہنچائیں۔ مولانا مجیب اللہ ندوی کا ذکر کر کے آپ نے بہت سی شیریں یادوں کا جھروکہ کھول دیا۔ عجیب شخصیت تھی، جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔ ایسے لوگوں کے جانے بعد زندگی ویران سی

محسوس ہوتی ہے۔''

شبنم سبحانی صاحب کثرت سے خطوط لکھتے تھے، مگر اہتمام نہیں کرتے تھے بلکہ فوری جوش سے لکھتے تھے۔ اور بے خیالی میں بعض ایسی باتیں لکھ جاتے تھے جس کو وہ نہ بھی لکھتے تب بھی کوئی بات نہیں ہوتی۔ آبروئے اردو شمس الرحمٰن فاروقی کو جب ماہنامہ معارف کی مجلس ادارت کا رکن بنایا گیا تو انہوں نے فوری جوش سے ایک خط لکھ دیا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا اور اس میں بعض ایسی باتیں بھی لکھ دیں جو قطعی درست نہ تھیں۔ ظاہر ہے یہ خط گراں گذرنا تھا اور گذرا۔ بلکہ ہم سب کو ناگوار گذرا۔ محترم فاروقی صاحب اعلیٰ ظرف اور بلند شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے انتہائی خاموشی سے خود کو ماہنامہ معارف کی مجلس ادارت سے علاحدہ کر لیا، جس کا لوگوں کو بہت قلق ہوا۔ خود مجھے ذاتی طور پر بڑا رنج ہوا، بلکہ ابتک ہے۔ کوئی فاروقی صاحب کی شخصیت اور ان کے عظیم الشان کارناموں کا منکر ہو تو ہو، میں انہیں عہد ساز شخصیت خیال کرتا ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان و ادب کی تاریخ ہمیشہ ان پر ناز کرے گی۔ خاص طور پر اردو تنقید کو انہوں نے جو آبرو بخشی ہے، ہمارے عہد میں اس کی کوئی مثال نہیں۔ اللہ تعالی ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔ اس واقعہ سے میرے اور شبنم سبحانی صاحب کے تعلقات پر اثر پڑا۔ میں نے ان کے خط کو ناپسند کیا۔ اس کا انہیں علم ہوا تو انہوں نے خاموشی اختیار کر لی۔ شاید قدیم دیرینہ مراسم کی وجہ سے وہ خاموش رہے۔ ایسے بھی وہ خاموش طبع تھے۔ ان کی نیکی اور شرافت کا کوئی شخص منکر نہیں ہوسکتا۔ اب ایسے اشخاص بھی اردو ادب میں مدتوں میں پیدا ہوں گے۔

شبنم سبحانی صاحب ایک اسلام پسند ادیب اور نقاد تھے اور ہر جگہ خود کو ادب اسلامی کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم ان کے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں کرتے تھے بلکہ اسے ایک محدود فکر کا نتیجہ خیال کرتے اور سرے سے اس تقسیم ہی کے خلاف تھے۔ ادب ادب ہوتا ہے۔ ذات پات فرقہ و مذہب اور ملک و ملت میں اسے تقسیم کرنا خلاف فطرت ہے۔ ہندوستان میں جب اسلامی ادب کے علمبردار نہیں تھے اور اس وقت جو بلند پایہ کتابیں لکھی گئیں جیسے علامہ شبلی کی المامون اور الفاروق یا ڈپٹی نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح وغیرہ کیا وہ اسلامی ادب کا حصہ نہیں ہیں۔؟ دراصل وسیع پس منظر سے محدود دائرہ میں آنا درست نقطہ نظر نہیں۔ اس لئے ان کے

محدود ادبی نقطہ نظر سے بھی اختلاف تھا، باوجود اس کے انہوں نے کبھی برا نہیں مانا۔ وہ کم از کم اس قدر آزادی رائے کے حامی ضرور تھے اور یہی ان کا بڑکپن تھا۔ بہر حال اب شبنم سبحانی صاحب جیسے صاف شفاف دل کے ادیبوں کے لئے بھی ملت ترسے گی۔

مجھے ان کی وفات سے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اختلاف رائے کے باوجود مجھے اپنے ہی قبیلے کا اہل قلم خیال کرتے تھے۔ علمی وادبی ہی نہیں وہ اپنے بعض ذاتی معاملات مسائل میں بھی شامل کر لیتے تھے۔ ان کی وفات سے میں نے اپنا ایک بے لوث محسن، شفیق کرم فرما اور بزرگ کھو دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو ایک ادیب اور ملت ایک صاحب نظر درد منداہل قلم سے محروم ہوگئی۔ مگر ان کی گراں مایے کتابیں ہمیشہ زندہ رہیں گی اور ان کی شخصیت کو بھی زندہ رکھیں گی۔

---

[۱۲]

ڈاکٹر خلیق انجم۔ایک تاثر

انجمن ترقی اردو ہند کے سابق جنرل سکریٹری، اردو کے نامور ادیب ونقاد، محقق ومدون اور ماہر غالبیات ڈاکٹر خلیق انجم [۱۹۳۳-۲۰۱۶ء] اپنے علم وفضل، ادبی وتنقیدی، خاص طور سے تحقیقی خدمات کے لحاظ سے یگانہ روزگار شخص تھے۔ان کی کاوشوں کا دائرہ بے حد وسیع وعریض ہے۔جس کے ذکر کے لئے ایک دفتر بھی کم ہوگا۔واقعہ یہ ہے کہ وہ مدۃ العمر اردو زبان وادب کی خدمت میں مصروف بلکہ سرگرم رہے۔

مرحوم ڈاکٹر خلیق انجم دہلی کے رہنے والے تھے اور دہلی ہی میں ۲۲/جنوری ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ابتدائی اور بنیادی تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی۔انٹر پاس کرنے کے بعد وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے اور وہاں سے گریجویشن کیا۔پھر دہلی لوٹ آئے۔ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد دہلی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔مرزا مظہر جان جاناں پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند لی۔اس کے بعد کروڑی مل کالج دہلی میں اردو کے استاذ مقرر ہوئے۔پھر متعدد عہدوں پر کام کرنے کے بعد ۱۹۷۴ء میں پروفیسر آل احمد سرور کی جگہ انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے۔اس وقت ان کی عمر ۴۱/سال تھی، تاہم انہوں نے اپنے بلند پایہ ادبی، تنقیدی اور تحقیقی کارناموں اور انتظامی صلاحیتوں سے ثابت کر دیا کہ ان کا انتخاب درست تھا۔اس عہدہ پر وہ ۳۸/برس فائز رہے۔۲۰۱۲ء میں سبکدوش ہوئے تو انہیں انجمن کا نائب صدر مقرر کیا گیا، جس پر وہ دم واپسیں تک فائز رہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے خود کو مدۃ العمر علمی وتحقیقی کاموں میں منہمک رکھا اور شعر وادب کے مختلف اور متنوع موضوعات پر ۸۰/سے زائد علمی وتحقیقی کتابیں سپرد قلم کیں۔سیکڑوں مضامین و

مقالات ان کے قلم سے نکلے۔ان کے اداریوں اورتبصروں کو شمار کیا جائے تو وہ بھی سیکڑوں نکل آئیں گے۔ تقدیم اور دیباچوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہے۔سوانحی، ادبی،تنقیدی اورتاریخی کتابوں کے علاوہ لسانی اورمتنی تحقیق وتنقید پر بھی ان کی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ان کی چنداہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

غالب اورشاہان تیموریہ، غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ،خطوط غالب (ترتیب و تدوین، چار جلدیں)،انتخاب خطوط غالب، غالب پر چند مضامین، غالب کی نادر تحریریں، مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، متنی تنقید، مرزا محمد رفیع سودا، دلی کی درگاہ شاہ مرداں، کربل کتھا کا لسانی مطالعہ، دلی کے آثار قدیمہ،فن ترجمہ نگاری وغیرہ۔تعلیقات وحواشی کے ساتھ مرتبہ ومدونہ کتب کی تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

آثارالصنادید،آصف علی اوراروناآصف علی،اختر انصاری شخص اور شاعر،انتخاب عزیز لکھنوی، انتخاب کلام حسرت موہانی،بیسویں صدی کی ممتاز شخصیت خواجہ احمد فاروقی، پروفیسر مسعودحسین خاں ایک جامع حیثیات شخص، پنڈت آنندنرائن ملا کی ادبی خدمات، جوش ملیح آبادی تنقیدی جائزہ،خواجہ غلام الثقلین مضامین اورتقریریں،سردارجعفری کے خطوط، سیرت فریدیہ،شبلی کی علمی وادبی خدمات، قاضی عبدالغفار ایک ممتاز نثر نگار، گلکاری وحشت کا شاعر مجروح،محی الدین قادری زور وغیرہ۔

ان کاوشوں سے ان کے ادبی وتحقیقی انہماک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ایسی مصروف خدمت ادب وتحقیق شخصیت اردو کی تاریخ میں کم ہی ملے گی۔ان تحقیقی اور پِتہ مار کاموں کے سوا ہندوستان و پاکستان اوربعض یوروپی مما لک کے سمیناروں اورادبی تقریبات میں شرکت اورحصہ داری کے لحاظ سے بھی کم ہی لوگ ان کے مدمقابل لائق ذکر ہو سکتے ہیں۔

انجمن ترقی اردو(ہند) کی سکریٹری شپ اور ہماری زبان کی برسوں ادارت ان کے ناقابل فراموش کارنامے ہیں۔انجمن کو علمی لحاظ سے تو انہوں نے مالا مال کیا ہی انتظامی لحاظ سے بھی بہت مستحکم کیا۔سہ ماہی اردوادب اورہفت روزہ ہماری زبان کی مسلسل اشاعت اورمعیار ووقار کا تحفظ،ان کی انجمن سے انتہائی وفا شعاری کا نتیجہ ہیں۔ان کاموں میں ان کے احباب بالخصوص

محترم صدیق الرحمٰن قدوائی کی جدوجہد اور ان کے معاون محمد عارف خاں کی لگن بھی شامل حال اور قابل ذکر ہے۔

مجھے فخر حاصل ہے کہ میں نے ڈاکٹر خلیق انجم کو دیکھا تھا۔ ان سے ربط و تعلقات تھے۔ خط و کتابت کا سلسلہ تھا اور وہ مجھ سے بے حد تعلق رکھتے تھے۔ بارہا ملاقاتیں رہیں۔ اپنی ایک اور بعض دوسروں کی کتابوں پر پیش لفظ لکھوائے۔ انہوں نے میری کسی ایک کتاب پر تبصرہ بھی لکھا ہے۔ دو ایک سمیناروں میں بھی ساتھ رہا۔ غضب کا آدمی تھا۔ مرد آہن۔ ہنستا کھیلتا چلا جاتا تھا اور وہ کسی کی پرواہ بھی ذرا کم ہی کرتا تھا۔ ان کے چاہنے والوں کا ہند و پاک میں ایک بڑا حلقہ تھا، مگر مخالفین و معاندین بھی کم نہ تھے۔ وہ جب انجمن ترقی پسند مصنّفین کی اعظم گڑھ کانفرنس میں شرکت کے لئے آئے تھے تو ملاقات پر انہوں اپنے بعض مخالفین کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کیا تھا۔ اس ملاقات پر انہوں نے غالبیات سے متعلق چند نادر کتب کی ایک فہرست دی اور کہا کہ کتب خانہ دارالمصنّفین سے تلاش کر کے بھیجو۔ دیکھئے یہ دونوں کتنی متضاد باتیں ہیں، مگر ڈاکٹر خلیق انجم کو اس طرح کے تضادات سے بارہا سابقہ پڑا اور وہ انہی تضادات سے نبرد آما ہو کر ساحل مراد تک پہنچے تھے۔

ڈاکٹر خلیق انجم سے سب کچھ چھوٹ سکتا تھا، مگر دہلی، انجمن اور قلم کبھی نہیں چھوٹ سکتے تھے۔ انہوں نے بہت کچھ لکھا، بہت سے موضوعات پر لکھا، حتیٰ کہ ان موضوعات پر بھی لکھا جس پر لکھنے کے وہ اہل نہیں تھے۔ تاہم ان کے قلم میں ایسی سائستگی، شستگی، برجستگی اور روانی تھی کہ ایک ایک حرف موتی کی طرح واضح ہیں۔ اصلاً ڈاکٹر خلیق انجم کا اپنا ایک خاص اسلوب نگارش تھا، جس میں سادگی اور شائستگی کے عناصر کی کثرت ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو، وہ جگن ناتھ آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''آزاد صاحب کو لڑکپن میں اقبال کے کلام کا بہت بڑا حصہ حفظ تھا اور ان کے دوست انہیں حافظ اقبال کہا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے علامہ اقبال کو بتایا کہ تلوک چند محروم صاحب کے صاحبزادے کو آپ کے کلام کا بہت بڑا حصہ حفظ ہے، علامہ نے آزاد صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا، ان صاحب نے آزاد صاحب کو اس کی اطلاع دی اور طے پایا کہ وہ صاحب آزاد صاحب کو لے

کرعلامہ کے پاس جائیں گے۔آزادصاحب بتاتے ہیں کہ وقت تو طے ہوگیااور
میں بہت خوش تھا،لیکن پتانہیں کیوں دل پر یہ خوف طاری ہوگیا کہ میں علامہ کے
پاس کیسے جاؤں گا۔ان کے سامنے کیسے بیٹھوں گا۔یہ خوف اس قدر بڑھا کہ آزاد
صاحب مقررہ وقت پران صاحب کے پاس نہیں گئے۔''

ڈاکٹرخلیق انجم کا مطالعہ بے وسیع اورعمیق تھااوراپنے موضوعات پرانہیں استحضاربھی تھا۔ مہرومروت کے بھی وہ ایک پیکر تھے،تاہم ان کی زندگی میں کوئی ترتیب اورنظم وضبط نہ تھا۔اردو سے جس قدرلگاؤ بلکہ عشق تھا،مذہب سے اسی قدروہ شخص بیزاربھی تھا۔اس لئے اس کی بہت سی ایسی خوبیاں جن کا ذکر ہونا چاہئے تھا،مگرنہیں ہوسکا۔اسی طرح وہ جس پایہ کے شخص تھےاس کے مساوی ان کا ماتم بھی نہیں ہوا۔یہ اردو والے زندوں کو یاد کرنے میں مہارت رکھتے ہیں اور مرجانے والوں کو بہت جلدفراموش کردیتے ہیں۔

ڈاکٹرخلیق انجم کی گراں قدر اورعظیم الشان خدمات کا مختلف اداروں،انجمنوں اور اکیڈمیوں نے اعتراف کیااورانہیں مختلف ایوارڈ اوراعزازات سے نوازا۔شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکرواعزاز وانعام ہوجوانہیں نہ ملا ہواورواقعہ یہ ہے کہ وہ شخص اس کا حق داربھی تھا۔

میری ان سے عرصہ تک خط وکتابت رہی۔میرے پاس ان کے متعدد خطوط تھے،بعض ضائع ہوگئے اور چند''محبت نامے'' میں شائع ہو چکے ہیں۔ان میں کوئی خاص بات نہیں۔خیر خیریت اور ہماری زبان میں مضامین کی اشاعت وغیرہ کا ذکر ہے۔ایک خط کا اقتباس ملاحظہ ہو، میں نے علامہ شبلی سے متعلق اپنی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' پرمقدمہ لکھنے کی فرمائش کی تھی،اس کے جواب میں وہ لکھتے ہیں:

''مجھے دلی مسرت ہے کہ آپ کوعلامہ شبلی سے ایسی عقیدت ہے کہ ان پرلگاتار
کتابیں لکھ رہے ہیں۔میں بھی علامہ کا بہت بڑاعاشق ہوں،لیکن اتنا نہیں
جتنا کہ آپ ہیں۔مجھے آپ کی کتاب پرپیش لفظ لکھنے میں خوشی ہوگی۔اس سلسلہ
میں ایک گذارش ہے میں چاہتاہوں کہ آپ کی کتاب پر جوپیش لفظ لکھوں وہ
بہت جامع ہو۔اس لئے براہ کرم مسودے کے ساتھ اپنا سوانحی خاکہ اور اپنی

تصنیفات کی فہرست ضرور بھیجئے۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور علامہ شبلی کے بارے میں جو ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں خدا آپ کو اس کا اجر دے۔''

اس سے پہلے وہ میری کتاب ''شاہ معین الدین احمد ندوی۔ حیات وخدمات'' پر مقدمہ لکھ چکے تھے، مگر ان کا خیال تھا کہ وہ رواروی میں لکھا گیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے مجھ جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کو خطوط لکھے ہیں۔ انہوں نے اپنے بلند رتبہ معاصرین اور بزرگوں کے نام بھی بہت سے خطوط لکھے ہیں، جو علم وادب کا خزانہ ہیں اور اس میں نہ صرف پون صدی کی خدمات کا ذکر ہے، بلکہ اس میں انجمن ترقی اردو (ہند) کی ایک اجمالی تاریخ بھی پوشیدہ ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی شخص ان کے خطوط ایڈٹ کر کے شائع کرادے، بلکہ اسی طرح محنت وتحقیق سے مرتب کرے، جس طرح ڈاکٹر ٹی، آر، رینا نے رشید حسن خاں کے خطوط مرتب کر کے شائع کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر خلیق انجم انسان تھے، انسانی کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں، ان میں بھی تھیں، جن کا ذکر لاحاصل ہے، البتہ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بابائے اردو کی صحیح جانشینی کی۔ انہی کی طرح مدۃ العمر انجمن سے وابستہ رہے اور بے پناہ اردو کی خدمت کی۔ اسی طرح انجمن کے رسالوں کی ادارت کی، اسی طرح تحقیق وتدقیق اور ادب کے سمندروں میں غواصی کی اور علم وادب کے موتی نکال نکال کر پیش کرتے رہے اور انجمن سے اسی طرح محبت کی جس طرح بابائے اردو کو تھی۔ مگر یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ بابائے اردو کو علامہ شبلی سے بیر تھا، لیکن ڈاکٹر خلیق انجم ان کے بے حد مداح بلکہ شیدائی تھے۔ انہوں نے علامہ شبلی کی شخصیت اور فکروفن پر نہ صرف مضامین لکھے بلکہ انجمن میں سہ روزہ سمینار بھی کیا۔ ایک نہیں دو دو کتابیں شائع کیں، حتیٰ کہ بابائے اردو اور ان کے ہم نواؤں نے علامہ شبلی پر جو الزامات عائد کئے تھے ان کا جواب بھی سید شہاب الدین دسنوی سے قلم بند کرا کے انجمن کی طرف سے شائع کیا۔ اتنا ہی نہیں علامہ شبلی پر ہونے والے بعض سمیناروں میں بھی انہوں نے اہتمام سے شرکت کی اور مقالات پیش کئے۔ علامہ شبلی ہی نہیں ان کے شاگرد اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی پر بھی انجمن میں سمینار کیا اور ان کے مقالات کا مجموعہ بھی شائع کیا۔ ان دونوں سے اپنی عقیدت کا اظہار میری کتاب شاہ معین

الدین احمد ندوی کے مقدمہ میں بھی کیا ہے۔

ان کا یہ کارنامہ بھی ادبی تاریخ میں یاد رکھا جائے گا کہ انجمن کو انہوں نے خود اپنے قلم سے نت نئے موضوعات پر کتابیں لکھ کر صاحب ثروت بنایا بلکہ اپنے احباب اور ملک کے دیگر اہل قلم کی نگارشات بھی اہتمام سے شائع کیں اور انجمن کو ہمیشہ زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھا اور اس کے معیار و وقار کو گرنے نہیں دیا۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے ۱۸/اکتوبر ۲۰۱۶ء کو وفات پائی۔ ان کی وفات سے مجھے سخت صدمہ پہنچا کہ اردو کا ایک بے مثل خدمت گذار دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ۱۸/اکتوبر کو میں نے اردو کا ایک ادیب اور محقق ہی نہیں کھویا بلکہ ایک مخلص کرم فرما سے بھی محروم ہو گیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی بشری لغزشوں سے درگذر کر کر غریق رحمت کرے۔

---

[۱۳]

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد [۱۹۲۹- ۲۰۱۶ء] نامور ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ عالمی شہرت یافتہ ناظم مشاعرہ تھے۔ ہنس کر خلوص، تپاک اور مہر ومحبت سے ملنے والے غیر معمولی انسان تھے۔ میری ان سے بارہا ملاقاتیں رہیں۔ عرصہ تک خط وکتابت کا بھی سلسلہ رہا، مگر ان کے محض چند ہی خطوط میری کتاب ''محبت نامے'' میں شامل ہیں۔ افسوس بہت سے خطوط ضائع ہو گئے۔

میری پہلی ملاقات ان سے کب اور کہاں ہوئی مجھے یاد نہیں۔ ہاں دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کی بعض دلچسپ ملاقاتیں اب تک ذہن میں ہیں۔ یہیں کی ایک ملاقات کا قصہ ہے کہ وہ یکا یک بغیر اطلاع کے تشریف لائے اور کتب خانہ کے اندر مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی نشست کے پاس بیٹھ گئے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ جلدی جلدی ہم لوگ آ کر ان کے پاس بیٹھے اور ضیافت میں لگ گئے۔ مجنوں گورکھپوری پر ایک خاتون اسکالر کی تھیسس اسی زمانہ میں چھپ کر آئی تھی اور وہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی میز پر رکھی ہوئی تھی۔ ملک زادہ صاحب نے اسے اٹھا کر دیکھا اور پھر الٹ پلٹ کر رکھ دیا اور کہنے لگے کہ تم کو یہ بات معلوم ہے کہ ''غبار خاطر'' کے تمام خطوط مولانا ابوالکلام آزاد نے مجنوں گورکھپوری کے نام لکھے ہیں۔ میں ہنسنے لگا، پھر کہنے لگے دیکھو یہ بات محترمہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھی ہے اور نگراں صاحب نے ظاہر ہے کہ تھیسس دیکھا ہوگا، مگر شاید ان کے نزدیک بھی یہی بات درست ہو کہ ''غبار خاطر'' کے تمام خطوط احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کے نام لکھے گئے ہیں۔ اب جو ذہن اس تحقیق انیق کی اصل کی طرف منتقل ہوا تو مجلس میں ہنسی کا فوراہ پھوٹ پڑا۔ دراصل مقالہ نگار نے مولانا آزاد کے صدیق مکرم کو احمد صدیق مجنوں سمجھ لیا تھا اور اپنی اس ناسمجھی کو تحقیقی مقالہ میں لکھ بھی

دیا تھا۔ خیر اب یہ ذکر مناسب نہیں کہ یہ مقالہ کس نے لکھا تھا اور کس کی سرپرستی میں لکھا گیا تھا، لیکن بہر حال اس سے یہ ضرور اندازہ ہوا کہ ملک زادہ منظور صاحب کسی کتاب پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ دراصل ملک زادہ صاحب ہماری اس نسل سے تعلق رکھتے تھے، جس نے محنت ومشقت، باریک بینی، دیدہ ریزی اور ذوق وشوق کے ساتھ گہرائی سے ادبیات کا مطالعہ کیا تھا اور زبان وبیان پر بے پناہ دست رس رکھتے تھے۔ واقعہ یہ کہ ملک زادہ صاحب نہ صرف اردو شعر وادب پر گہری نظر رکھتے تھے بلکہ انگریزی ادبیات پر بھی حاوی تھے۔

ملک زادہ صاحب بڑے اچھے ادیب اور اہل قلم تھے۔ ان کے قلم سے اگر چہ محض چند ہی کتابیں نکلیں، جیسے شہر سخن، شہر ادب، مولانا ابوالکلام آزاد: حیات اور کارنامے، غبار خاطر ایک تنقیدی مطالعہ، ابوالکلام آزاد الہلال کے آئینے میں اور سب سے آخر میں ان کی ضخیم خودنوشت ''رقص شرر'' وغیرہ، مگر یہ چند کتابیں انہیں خوب صورت نثر اور نقد ونظر کے حوالہ سے اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ خاص طور پر ان کی صاف ستھری، سادہ، سلیس، پاکیزہ، نرم اور دل نشیں اردو نثر جس میں بلا کی دلکشی اور جاذبیت ہے، نثر نگاری کے دربار میں ان کے ثبات ودوام کے لئے کافی ہے۔

شہر سخن کا پرانا ایڈیشن میرے پاس ہے جو ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا یہ کہاں سے اور کس طرح میرے پاس آیا مجھے یاد نہیں، البتہ یہ ضرور یاد ہے کہ اس میں مرزا احسان احمد صاحب پر ایک بڑا شاندار مضمون شامل ہے، جسے میں نے ایم.اے کے زمانہ میں حرفاً حرفاً پڑھا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی مضمون کے مطالعہ سے مرزا احسان احمد کی شاعری کی نہ صرف عظمت سے واقف ہوا بلکہ ان پر ایک مفصل مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوا۔ جو صہبا لکھنوی کے ماہنامہ افکار کراچی میں شائع ہوا اور بہت پسند کیا گیا۔

ملک زادہ صاحب کی شہر سخن سے لے کر رقص شرر تک کی نثر میں نے پڑھی ہے اور دلچسپی سے پڑھی ہے۔ شہر سخن میں اٹھان ہے، بانکپن ہے، فہم وشعور کی بلندی اور غور وفکر کی سنجیدگی ہے، جب کہ شہر ادب میں پختہ مشقی ہے۔ تحقیق اور تنقید ہے۔ لیکن رقص شرر ان کی طویل ادبی مسافرت کی داستان ہے اور سب کچھ سمیٹ لینے کی تمنا ہے۔ یہی فرق دونوں کتابوں کی نثر میں بھی ہے مگر

ان کے تحقیقی مقالے مولانا آزاد فکر و فن میں بڑی گھن گرج ہے۔ اس میں وہ ایک طالب علم نہیں معلوم ہوتے بلکہ ایک پختہ مشق نقاد اور دانشور نظر آتے ہیں۔ جو کچھ لکھتے ہیں، دلائل و براہین کے ساتھ لکھتے ہیں۔ مولانا آزاد پر سیکڑوں کام ہو چکے ہیں، مگر اس مقالہ کی انفرادیت اب بھی باقی ہے۔ دراصل یہ کتاب دبستان محمود کا ایک ثمرہ ہے۔ اس دبستان کے مصنّفین نے جو چند بہت اچھی کتابیں لکھی ہیں جیسے پروفیسر محمود الٰہی کی کتاب قصیدہ نگاری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر احمر لاری کی کتاب حسرت موہانی حیات اور شاعری وغیرہ، ملک زادہ مرحوم کی کتاب بھی اسی معتبر سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

آج کے دور میں ہر شاعر قادرالکلام شاعر ہے جس کو دیکھئے مجموعہ کلام لئے چلا آ رہا ہے اور غور سے دیکھئے تو اس پر کسی بڑے اہل قلم نے ان کی پختہ مشق شاعری کی داد و تحسین کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ اپنے عہد کے بڑے با کمال اور قادرالکلام شاعر ہیں، لیکن ابھی ہمارے عنفوان شباب میں ایسا نہیں تھا۔ بطور تقریظ و تقدیم وہی لکھا جاتا تھا جو صحیح ہوتا تھا۔ اس طرح کے شعرا سے ملک زادہ صاحب کا بھی پالہ پڑتا تھا اور انہوں نے بھی بعض معمولی لوگوں کے کلام پر رائے دی ہے، مگر وہ خود اس عہد کے پروردہ تھے جو بہت ٹھونک بجا کر رائے دیتا تھا، اس میں کہیں کہیں ان سے بے احتیاطیاں سرزد ہوئی ہیں، مگر وہ خود بڑے اچھے شاعر تھے، فکر و فن پر گہری نظری تھی۔ پختہ مشقی کی دولت تو انہیں کم عمری ہی میں مل گئی تھی، مگر اس میں انہوں نے ریاض نہیں کیا۔ ایک مقام پر پہنچ ان کی شاعری کی رو تھم سی گئی تھی۔ مگر ان کی شاعری میں بانکپن تھا، جدت تھی، احساس اور شعور کی بالیدگی تھی ۔

آنے والی صرف ہوا ہوا ایسا بھی ہوسکتا ہے

ان کے شعری مجموعہ شہر ستم پر لکھے ہوئے اشعار ان کی شاعری کے رخ کو واضح کرتے ہیں

ہمارے شعروں میں مقتل کے استعارے ہیں
ہماری غزلوں نے دیکھا ہے کوچہ قاتل
صلیب و دار پر نظمیں ہماری لٹکی ہیں
ہماری فکر ہے زخمی لہو لہان ہے دل

ہر ایک لفظ پریشاں ہر ایک مصرعہ اداس
ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پشیماں ہیں

کلاسیکی شاعری کا ملک زادہ صاحب نے بڑی گہرائی، باریک بینی اور سنجیدگی سے مطالعہ کیا تھا۔ وہ ادب کی باریکیوں پر نظر رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ خود انہوں نے جو شاعری کی اس پر کلاسیکی شاعری کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن وہ اپنے عہد کے شعری رویوں کے بڑے نباض اور بڑے سخن شناس تھے۔ اس کا اظہار مشاعروں کی نظامت میں خاص طور پر ہوتا تھا۔ چند جملوں میں وہ شاعر کا ایسا تعارف کراتے تھے کہ اس سے بہتر تعارف نہیں کرایا جاسکتا تھا۔

ملک زادہ مرحوم کا شعری سرمایہ بھی نسبتاً مختصر ہے۔ وجہ وہی رات دن مشاعروں سے دلچسپی اور نظامت اور اس کے اسفار تھے۔ تاہم ان کی بدولت شعروادب کے جو بازار سجے اور ان کے زیراثر جو شاعری وجود میں آئی، وہ زبان وادب کی ایسی بڑی اور قابل ذکر خدمت ہے جو وہ خود انفرادی طور پر نہیں کر سکتے تھے۔

ان کا اعظم گڑھ سے بڑا گہرا رشتہ تھا۔ اس رشتے کی اتنی نوعیتیں ہیں کہ انہیں بیان کرنا بھی دشوار ہے۔ اس کا ذکر خود انہوں نے رقص شرر میں کیا ہے۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ اعظم گڑھ سے ان کا رشتہ جسم وجاں کا تھا اور ہم لوگوں سے انہیں جو محبت تھی وہ محض اعظمی ہونے ہی کی وجہ سے تھی ورنہ ہم میں اور کوئی جوہر نہیں تھا۔

ملک زادہ صاحب اعظم گڑھ کے شبلی نیشنل کالج میں اس وقت انگریزی ادبیات کے استاد تھے جب ہم پیدا نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس وقت اعظم گڑھ بھی ادبستان تھا۔ یحییٰ اعظمی، مرزا احسان احمد، منیف اعظمی، رحمت الٰہی برق اعظمی اور امجد غزنوی وغیرہ دادِسخن دے رہے تھے اور ہر مجلس بزم شعروادب بنی ہوئی تھی۔ ملک زادہ صاحب ان محفلوں کی جان تھے اور ان سے پہلے کبھی جگر واصغر ان محفلوں کی رونق ہوا کرتے تھے، بلکہ انہیں مجلسوں نے جگر واصغر کو ادبی دنیا سے متعارف کردیا۔

میری ان سے آخری ملاقات ۲۰۱۴ء میں ان کے کنچن بہاری مارگ والے گھر پر ہوئی تھی۔ برادرم ڈاکٹر عمیر منظر نے شبلی صدی تقریبات کے تحت لکھنؤ میں ایک تقریب منعقد کی تھی،

جس میں دہلی سے پروفیسر اختر الواسع، لکھنو سے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، علی گڑھ سے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی اور اعظم گڑھ سے راقم الحروف نے شرکت کی تھی۔اس موقع پر میری نئی ''کتاب شبلی شناسی کے سو سال'' کی رسم اجراء بھی ادا کی گئی تھی۔ رسم اجراء ادا کرنے والوں میں پروفیسر ملک زادہ منظور احمد بھی شریک تھے۔ پہلی بار میں نے انہیں نہایت کمزور، نحیف اور خاموش خاموش دیکھا، معلوم ہوا کہ ابھی بیمار تھے اور ہاسپٹل سے واپس آئے ہیں، محض اردو کی محبت میں اس تقریب میں آ گئے ہیں۔ وہ خود تقریبات کے بادشاہ تھے، نہ جانے کتنی تقریبات منعقد کیں اور مشاعروں میں تو نہ جانے کتنی راتیں جاگ کر گذاریں۔ایک زمانہ میں آل انڈیا مشاعرے ان کے بغیر منعقد ہی نہیں ہوتے تھے۔ ہندوستان ہی نہیں ہندوستان سے باہر پاکستان، امریکہ، کناڈا اور دبئ وغیرہ میں بھی انہوں نے متعدد مشاعروں کی نظامت کی۔ وہ اس فن نظامت کے بانیوں میں تھے اور انہوں نے دنیا بھر کے نظمائے مشاعرہ کو نظامت کا ہنر دیا ہے۔

تقریب کے اختتام کے بعد میں ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے، کمزور صحت کے باوجود بہت دیر تک اردو زبان و ادب اور اعظم گڑھ کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ رقص شرر کا ایک نسخہ اپنے دستخط سے عنایت کیا جو آج بھی میری ذاتی لائبریری کی زینت ہے۔اس موقع پر انہوں نے رقص شرر کی ایک مطبوعہ تلخیص دکھائی اور کہا کہ بغیر اطلاع کے ایک صاحب نے اس کے حصے بکھرے کر دیئے ہیں۔ایسا محسوس ہوا کہ شاید انہیں یہ کام پسند نہیں آیا تھا۔

ملک زادہ صاحب چوں کہ دبستان شبلی کے بہت قریب رہے تھے، اس لئے دیر تک اپنے عہد کے اعظم گڑھ کی ادبی فضاؤں کی تفصیل بتاتے رہے، حتی کہ انہوں نے مرزا احسان احمد کے بعض اشعار بھی سنائے۔انہوں نے علامہ شبلی کے تلامذہ سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کے بارے میں رقص شرر میں لکھا ہے کہ:

> ''ایک نے علامہ شبلی کے جمالیاتی رنگ میں اپنی انفرادیت گھول کر نثر لکھی۔ دوسرے نے شبلی کے حکیمانہ ادراک کو اپنی نظموں اور غزلوں میں سمویا تھا۔ایک ہی میخانہ کے میکش ہونے کے علاوہ دونوں میں اور کوئی مشابہت اور مطابقت رہی ہو یا نہ رہی ہو لیکن دونوں عجائبات قدرت میں تھے۔ وہی کھویا کھویا سا انداز، وہی

بہکی بہکی سی نگاہیں، طبیعت میں باوجود تبحر علمی کے ایک استغنا آمیز لاابالی پن جو تخلیقی ادب کے معماروں کا طرہ امتیاز رہا ہے، دونوں میں پایا جاتا تھا۔ اگر جھکے تو شاخ ثمر دار کے مانند، قلم اٹھایا تو شہپر جبریل کی تیزی دکھائی، بولے تو بازگشت ایوان حکومت میں سنائی ، خاموش رہے تو صبر ایوبی کی یاد دلا دی، مگر دونوں صورتوں میں حبل متین تھامے رہے''۔

رقص شرر میں اعظم گڑھ کے متعلق اور بھی بہت کچھ ہے۔ دراصل رقص شرر گذشتہ ۶۰ - ۷۰ سالوں کی ادبی سرگرمیوں کی دستاویز ہے۔

ملک زادہ صاحب اردو اکادمی کے چیرمین اور اردو رابطہ کمیٹی کے صدر رہے۔ ان کے حوالہ سے بھی انہوں نے اردو کی بڑی خدمات انجام دیں، خاص طور پر اردو کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ یہاں تک کہ اردو کی آواز بلند کرنے کے لئے وہ اردو رابطہ کمیٹی کا ممبر پارلیامنٹ ضروری خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعظم گڑھ پارلیامانی الیکشن میں امیدوار ہوئے ،مگر ظاہر ہے ہمارے یہاں الیکشن میں شرافت نیکی اور سادگی پسند اشخاص کا گذر نہیں، چنانچہ ملک زادہ صاحب کو کامیابی نہ ملنی تھی، نہ ملی۔ ہم لوگ اس زمانہ میں ان سے ملتے ہوئے کتراتے تھے اور ان سے کیا کہتے کہ آپ جس اردو کی بھیڑ کو مشاعروں میں دیکھ کر اردو کے مستقبل کو سازگار بتاتے ہیں، وہ دراصل اردو والوں کی بھیڑ نہیں ہوتی ، وہ تو وقتی لطف ولذت سے شادکام ہونے والوں کا ایک مجمع ہوتا ہے اور اس کی حیثیت محض واہ واہ تک محدود رکھتی ہے۔

۲۰۱۵ء میں میری طبیعت خراب ہوئی اور سالوں زیر علاج رہنے کے بعد معلوم ہوا کہ معاملہ دل کا ہے اور سوائے آپریشن کے اور کوئی علاج نہیں، چنانچہ میں بمبئی چلا گیا اور کئی ماہ زیر علاج رہا۔ ابھی میں بمبئی میں زیر علاج ہی تھا کہ ان کے سانحہ وفات کی اطلاع اخبارات میں آئی، بہت دکھ ہوا۔ اردو کا ایک بےلوث خادم مدۃ العمر زبان وادب کی خدمت کر کے راہی ملک عدم ہوا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

[۱۴]

مولانا حکیم عبدالمجید اصلاحی کی یاد میں

مولانا حکیم عبدالمجید اصلاحی [۱۹۳۳-۲۰۱۷ء] مایہ ناز عالم دین، ادیب، خطیب، طبیب اور مصنف ومترجم تھے۔ دین وملت کے لئے مدۃ العمر سرگرم عمل رہے۔ ۸۴/سال کی عمر میں ۱۸/ جنوری ۲۰۱۷ء کوعلی الصباح وفات پائی۔ انالله و انااليه راجعون.

مولانا مرحوم کا شمار جید علماء میں ہوتا تھا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی وفات سے ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے جو جلد پر نہ ہو سکے گا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

مولانا عبدالمجید اصلاحی ۱۹۳۳ء میں اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز گاؤں جیراج پور میں پیدا ہوئے۔ عہد طفولیت ہی میں یتیم ہو گئے۔ چار ماہ کے تھے تو والدہ اور چار سال کے ہوئے تو والد حکیم عبدالحمید نے وفات پائی۔ ان کی پرورش ان کی چچی مرحومہ نے کی تھی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گاؤں پر حاصل کی۔ متوسطات تک کی کتابیں مدرسہ الہیات کان پور میں پڑھیں۔ بعدازاں ۱۹۴۹ء میں مولانا محمد ایوب اصلاحی کی سرپرستی میں اعلی تعلیم کے لئے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر آئے۔ چار برس زیر تعلیم رہے۔ ۱۹۵۳ء میں فراغت پائی۔ ان کے اساتذہ میں مولانا اختر احسن اصلاحی۔ مولانا بدرالدین اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی اور مولانا جلیل احسن ندوی قابل ذکر ہیں۔ دور طالب علمی میں ان کا شمار ذہین اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا اور وہ ممتاز نمبروں سے پاس بھی ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد وہ مادر علمی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں استاذ مقرر ہوئے۔ پھر مختلف مدارس و مکاتب میں درس وتدریس کی خدمات انجام دیں۔ اسی زمانہ میں انہیں طب کی تعلیم کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ لکھنو گئے اور تکمیل الطب کالج لکھنو میں داخلہ لیا۔ ۱۹۵۹ء میں

ایف،ایم،بی،ایس کی سند لی۔اس فن میں ان کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پورے کالج میں انہوں نے اول پوزیشن حاصل کی۔

تکمیل الطب کے بعد مئو ناتھ بھنجن میں مطب شروع کیا اور کئی برس تک یہ مشغلہ رہا، مگر اس میں زیادہ کامیابی نہیں ملی تو دوبارہ کے شعبہ تدریس سے وابستہ ہوگئے اور ملک کے مختلف مدارس ومکاتب میں وقفہ وقفہ سے تدریسی خدمات انجام دیں۔اس دوسرے دور میں وہ عرصہ تک مادر علمی مدرسۃ الاصلاح پر بھی استاد رہے۔اس دور میں ان سے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، پروفیسر نقی حسین جعفری، مولانا مظفر احسن اصلاحی، مولانا عمر اسلم اصلاحی، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی، مولانا عارف عمری، مولانا محمد ارشد اصلاحی، ڈاکٹر صفدر سلطان اصلاحی، مولانا نسیم ظہیر اصلاحی اور ڈاکٹر اشہد رفیق ندوی وغیرہ نے کسب فیض کیا۔

مولانا مرحوم میں بے پناہ صلاحتیں تھیں۔علم ومطالعہ بھی بہت گہرا تھا۔حافظہ بھی بہت قوی تھا۔طریقہ تعلیم وتدریس بھی بہت عمدہ تھا۔نیک اور صالح بھی بہت تھے، مگر ان کی طبیعت میں استقلال وقرار نہ تھا، جس کی وجہ سے وہ کہیں جم کر ٹھہر نہیں سکے اور کوئی کام مستقل مزاجی سے انجام نہ دے سکے۔تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کی شخصیت مختلف اوصاف وامتیازات سے عبارت تھی۔وہ ایک بڑے خطیب ومقرر تھے۔داعی تھے۔مصنف ومترجم تھے۔تاریخ اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔تعلیم اور اصول تعلیم سے بھی بخوبی واقف تھے۔تعلیم نسواں کے بڑے زبردست حامی اور مدرسہ بنات المسلمین جیراج پور کے بانی تھے۔ان میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ غرض ان کی ذات مجموعہ کمالات تھی۔

خطابت کا ذوق ان میں دور طالب علمی سے تھا جو مدرسۃ الاصلاح کے دور طالب علمی میں پروان چڑھا۔چنانچہ وہ انجمن الاصلاح کے پروگراموں میں شوق سے لیتے رہے۔تحصیل و تکمیل کے بعد دینی جلسوں میں وہ شریک ہوتے اور مختلف دینی اور اصلاحی موضوعات پر خطاب کرتے۔جمعیۃ اہل حدیث کے جلسوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ایک زمانہ میں وہ خطیب کی حیثیت سے اطراف وجوانب کے جلسوں میں مدعو کئے جاتے اور شوق سے شریک ہوتے۔قرب و جوار کی بعض مسجدوں میں خطبہ جمعہ دینے کا بھی وہ اہتمام کرتے تھے۔ان کے خطبات علمی اور

عوامی دونوں انداز کے ہوتے تھے۔وہ عام خطبا کی طرح لسان نہیں تھے۔مگر بڑی پر اثر گفتگو کرتے تھے۔وہ اگر چہ مسلکاً اہل حدیث تھے،مگر جس طرح ان میں نام ونمود اور صلہ وستائش کا جذبہ نہیں تھا،اسی طرح ان میں مسلکی تشدد وتفرد بھی نہیں تھا،یہی وجہ ہے کہ وہ ہر حلقہ اور ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔

مولانا مرحوم ایک بڑے اہل قلم تھے۔مصنف اور مقالہ نگار تھے۔ان کی متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور ان کے مضامین ومقالات معاصر رسائل وجرائد میں برابر چھپتے رہتے۔مولانا ماہرالقادری کے فاران،مولانا مجیب اللہ ندوی کے الرشاد،دہلی کے ماہنامہ نوائے اسلام اور التوعیہ وغیرہ میں ان کی تحریریں نظر سے گذری ہیں۔غالباً محدث بنارس میں بھی ان کی بعض تحریں شائع ہوئیں۔مگر واقعہ یہ ہے کہ تصنیف وتالیف کا کام بھی انہوں نے باقاعدگی اور دلجمعی کے ساتھ کبھی انجام نہیں دیا،تاہم انہوں اپنی بے قاعدگی میں جو کچھ کر دیا وہ بعض باقاعدہ کرنے والوں سے کہیں زیادہ وقیع اور گراں مایہ ہے۔ان کی کتب ورسائل کے نام یہ ہیں: رہبر کامل،دین وشریعت،عشرہ مبشرہ،نصیحتیں اور وصیتیں،دینی تحریکوں کا بناؤ بگاڑ،اسلامی سماج کی تعمیر وغیرہ۔

اول الذکر کتب ورسائل میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں اور خود مولانا مرحوم کی عنایت کردہ ہیں۔بیشتر کتابیں انہوں نے بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ان میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ان سب کا مقصد بچوں کی ذہن سازی اور انہیں مضر اثرات سے محفوظ رکھنا ہے۔وہ چاہتے تھے کہ بچے سنہ بلوغت سے پہلے اسلام کے بنیادی ارکان واحکام سے واقف ہوجائیں اور اگر اس کے بعد وہ دینی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں تو باطل افکار ان کے ذہنوں پر حاوی نہ ہوسکیں اور جدید تعلیمی نظریات کے مضر اثرات سے بھی وہ پاک رہیں۔

''رہبر کامل'' ان کی بڑی پیاری کتاب ہے۔بچوں کے سیرتی ادب پر جن لوگوں نے تحقیقی کام کیا ہے شاید ان کی نظر اس کتاب پر نہیں پڑی،ورنہ وہ مولانا مرحوم کی فکری اور فنی خوبیوں کی ضرور داد دیتے۔رہبر کامل کا تعارف خود مولانا مرحوم نے ان الفاظ میں کرایا ہے۔

> ''سیرت پاک کا حق صحیح معنوں میں اس طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اس کی تصویر آئینہ قرآن میں پیش کی جائے،جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا

نے فرمایا ہے کہ آپ کے جو اخلاق وعادات تھے،ان میں آپ قرآن پاک کی چلتی پھرتی تصویر تھے۔

اس کتاب میں ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ سیرت کا بنیادی رخ جو قرآن کی روشنی میں متعین ہوتا ہے وہ تبدیل نہ ہونے پائے اور کم از کم بچوں کے ذہن میں سیرت پاک کا ایک صحیح اور مختصر خاکہ آجائے اور آئندہ علمی اور عملی اعتبار سے دین فطرت کی سیدھی راہ ان کے سامنے باز ہوجائے۔ (رہبر کامل ص۲)

یہ رسالہ بعض مکاتب کے نصاب میں شامل ہے اور اس کے مفید نتائج بتائے جاتے ہیں۔ان کا دوسرا رسالہ ''عشرہ مبشرہ'' بھی طلبہ ہی کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ

''سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جس کی ایک ایک ادا کو از بر کر لینا ہر مسلمان مرد عورت اور نونہالان اسلام کے لئے لازم ہے کے بعد یوں تو جملہ صحابہ وصحابیاتؓ کی زندگی ہماری زندگی کی شب تاریک میں روشنی کے مینار اور راہ کے چراغ ہیں،مگر سب تو نہیں کم از کم عشرہ مبشرہ صحابہؓ اور ازواج مطہراتؓ کی حیات کے ایک ایک ورق سے واقفیت بچوں اور بوڑھوں سبھی کے لئے ضروری ہے۔ عشرہ مبشرہ صحابہ کرامؓ کی سیرت پاکؐ سے واقفیت ضروری اس لئے ہے کہ ان کی زندگی یقینی طور پر باغ جنت کی طرف جاتی ہے۔جنت کی راہ چلنا چاہیں تو ان کی سیرت اور ان کا سلوک نگاہوں کے سامنے رکھ لیں۔ازواج مطہراتؓ کی حیات پاک کا آئینہ رکھ لینا اس لئے لازم ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی اور پرائیویٹ زندگی کی ساری ادائیں انہوں نے دیکھی تھیں اور وہ ہمہ وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں میں تھیں۔'' (رسالہ عشرہ مبشرہ ص۳)

اسی فکر وخیال کی وجہ سے انہوں نے ایک رسالہ ''عشرہ مبشرہ'' تیار کیا اور طبع کرایا۔اس سلسلہ میں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس موضوع پر بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق کوئی رسالہ نہیں لکھا گیا تھا۔اس بڑی کمی کو دور کرنے کے لئے انہوں نے یہ کام انجام دیا تھا۔اس تالیف میں انہوں نے دروس التاریخ اور محی الدین الخناط کی عشرہ مبشرہ اور علامہ شبلی کی الفاروق سے خصوصی استفادہ کا ذکر

کیا ہے۔

مولانا حکیم عبدالمجید اصلاحی مرحوم اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے درمیان مراسم اور خط و کتابت کا سلسلہ تھا۔ان کی خواہش پر مولانا مرحوم مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ چند ماہ دارالعروبہ سے بھی وابستہ رہے۔مولانا مودودی کی خواہش کے احترام میں ان کے رسالہ دینیات کی تسہیل وتخفیف بھی ان کی ایک اہم کاوش ہے، جسے انہوں نے دین وشریعت کے نام سے شائع کیا۔اس کا مقصد تالیف بھی ان کے نزدیک بچوں کے سادہ ذہن پر اسلامی تعلیمات نقش کرنا ہے۔خود انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''مکاتب اسلامیہ کے اندر فقہ کی ابتدائی نظری اور عملی تعلیمات کے بعد اس بات کی شدید ضرورت ہوتی ہے کہ بچے اور بچیاں سن شباب کی جانب رواں دواں ہونے سے پہلے اپنے ذہنوں کی سادہ تختیوں پر دین وشریعت کے نقوش ثبت کرلیں۔اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بجائے بچے یا بچیاں عصری تعلیم کی جانب راغب ہوں تو ان کے اندر فکر وعقیدہ اور عمل واقدام کے نقوش اتنے گہرے ہوں کہ وہ عصری تعلیمات اور عصری تہذیب سے متاثر ہونے کے بجائے ہوسکے تو خود موثر بن جائیں۔''
>
> (دین وشریعت ص۳)

مولانا مرحوم نے اگرچہ اردو زبان میں کام کیا اور کتابیں لکھیں، لیکن اصلاً وہ عربی زبان و ادب کے آدمی تھے۔انہیں عربی زبان وادب پر عبور حاصل تھا۔نہ صرف بولنے، لکھنے بلکہ ترجمہ و تفسیر اور تشریح پر پورے طور پر قادر تھے۔خاص طور پر لغات کے تو وہ بڑے زبردست عالم تھے۔ مگر افسوس ان کی غیر مستقل مزاجی کے سبب ملت کو وہ فائدہ نہیں پہنچ سکا جو ان کے استقلال سے پہنچ سکتا تھا۔تاہم ان کی عربی خدمات بھی کم نہیں بلکہ قابل ذکر ہیں۔ابتدائی عربی درجات کے لئے ان کی یادگار نصابی کتاب ''القراۃ العربیہ'' جو آج بھی مدرسۃ الاصلاح اور بعض دوسرے مدارس میں داخل نصاب ہے،ان کی عربی زبان وادب پر دسترس کا پتہ دیتی ہے۔ان کے تراجم سے بھی ان کی عربی دانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا مرحوم ایک بڑے مترجم تھے۔انہوں نے متعدد عربی کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے۔خاص طور پر طب سے متعلق کتب کے ان کے تراجم خصوصیت سے لائق ذکر ہیں۔لیکن طبی تراجم سے پہلے انہوں نے اپنے دوست مولانا عبدالحمید رحمانی کی خواہش پر ابن القیم کی مشہور کتاب ''زادالمعاد'' کا اردو ترجمہ ''توشہ آخرت'' کے نام سے کیا،جس کی محض پہلی جلد ہی شائع ہوسکی، حالانکہ اطلاع کے مطابق انہوں نے تمام حصص کا ترجمہ کردیا تھا۔اسی طرح انہوں نے حکومت کے طبی ادارے (CCRUM) کے لئے کئی کتابوں کا ترجمہ کیا۔اس میں مشہور مورخ ابن ابی اصیبعہ کی کتاب عیون الانباء فی طبقات الاطباء کی دوجلدوں کا ترجمہ بھی شامل ہے۔اس کے علاوہ ہمارے دوست حکیم وسیم احمد اعظمی کی اطلاع کے مطابق ابوبکر رازی کی ۲۳رجلدوں پر مشتمل مشہور کتاب الحاوی الکبیر فی الطب کی ابتدائی سات جلدوں کا ترجمہ ان کے قلم سے نکلا، جسے (CCRUM) نے مولانا مرحوم کے نام کے بغیر شائع کیا ہے۔

ان کے علاوہ بعض مقالات کے بھی انہوں نے عربی میں ترجمہ کئے جوالرشاد اعظم گڑھ عربی مجلّہ میں شائع ہوئے۔افسوس ایسی گراں قدر علمی خدمات انجام دینے والے شخص کے ذکر سے بھی کوتاہی برتی گئی اوران کی وفات پران کا خاطر خواہ ماتم نہیں ہوا۔

تعلیمی سلسلہ کا مولانا مرحوم کا ایک اور یادگار کارنامہ جوان کے لئے ایک صدقہ جاریہ ہے مدرسہ بنات المسلمین جیراج پور کا قیام ہے۔۱۹۸۳ء میں انہوں نے اس کی بنیاد رکھی اور پھر اسے آخری سانس تک ترقی دینے کے لئے ہمہ تن کوشاں رہے۔اس کا ایک نصاب انہوں نے تیار کیا، جسے خود انہوں نے عملی جامہ پہنایا اور پھر اس کے اجراء کے لئے انہوں نے استانیوں کی تربیت کی اوران سے بھی یہ کام لیا۔اس مدرسہ سے خطہ بندول اور جیراج پور کو بڑا فائدہ پہنچا۔بے شمار بچیاں اس مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرکے عالمہ بنیں۔جیراج پور اور قرب وجوار کی خواتین کی دینی، تعلیمی اور فکری بیداری میں مولانا مرحوم کا بڑا حصہ ہے۔

اس مدرسہ کی ترقی کے لئے انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ملک وبیرون ملک کے متعدد اسفار کئے اوراسے مالی طور پر مستحکم کرنے کے لئے بعض عرب اداروں سے بھی انہوں نے تعاون حاصل کیا۔دین وشریعت اوراسلام کی سربلندی کے لئے ایسی جدوجہد کرنے والے خال خال پیدا

ہوتے ہیں۔مولانا مرحوم انہیں خال خال لوگوں میں سے ایک منفرد شخص تھے۔

مولانا مرحوم کی ایک بڑی خوبی ان کے رفاہ عام کے کام ہیں۔انہوں نے کئی مساجد و مکاتب کی تعمیر میں حصہ لیا۔چھوٹے بچوں کی تعلیم کا نظم کیا تھا۔اپنے علاقہ جیراج پور اور جمعیۃ اہل حدیث کی نظامت کے دور میں ضلع اعظم گڑھ کے مواضعات میں دینی اجلاسوں کا انعقاد کیا اور باہر سے اہل علم کو بلا کر دینی موضوعات پر تقریریں کرائیں۔یہی نہیں انہوں نے بعض غیر مسلموں کی شادی بیاہ میں بھی مدد کی۔دراصل مولانا مرحوم تمام تعصّبات سے پاک تھے۔ان کا دل صاف شفاف اور کینہ وکدورت کی آلائشوں سے پاک تھا۔واقعہ یہ ہے کہ ان کی تمام تگ ودو دین وشریعت کے لئے تھی۔اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے۔

مولانا مرحوم کی قرآن مجید پر بڑی گہری نظر تھی۔اس کا مطالعہ اور اس پر غور وتدبر بھی وہ کرتے رہتے تھے۔یوں بھی مدرسۃ الاصلاح پر علامہ حمیدالدین فراہی کی ذات سے تفہیم قرآن کا جو آغاز ہوا تھا الحمدللہ وہ بابرکت سلسلہ اب بھی کسی قدر باقی ہے۔مولانا مرحوم کو بھی یہ ذوق مدرسۃ الاصلاح ہی سے ملا تھا۔وہ بعض مواقع پر آیات کی تفہیم وتفسیر کرتے رہتے تھے۔وفات سے چند ماہ پہلے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو ان کے پیش نظر ایک دارالقرآن کا قیام تھا۔انہوں نے اس کی شدید ضرورت کے متعدد اسباب بتائے اور پھر چند آیات قرآنیہ کے معانی ومفہوم واضح کرکے معاصر اور بزرگ مفسرین کی کمیوں کی نشاندہی کی اور فرمایا اس کے لئے دارالقرآن کی شدید ضرورت ہے۔ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مسلمانوں نے مطالعہ وتحقیق کے لئے ہر موضوع سے متعلق ادارے قائم کئے اور اسے چلایا مگر انہوں نے قرآن پاک کے مطالعہ اور اس پر تدبر وتفکر کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔انہوں نے اپنے مسلک اہل حدیث علماء پر بھی نقد کیا کہ ان ساری توجہ محض حدیث ہی کی طرف ہو کے رہ جاتی ہے، اس لئے دارالقرآن کا قیام بے حد ضروری ہے۔میں نے ادارہ علوم القرآن علی گڑھ کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ وہاں بھی قرآن پر غور فکر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔میں ان کی اس بات سے اتفاق یا اختلاف کرتا اس سے پہلے وہ کہنے لگے کہ الیاس سوئے سوئے آیات قرآنیہ برابر ذہن میں گردش کرتی رہتی ہیں، کوئی ہوتا تو میں انہیں نوٹ کرا دیتا۔میں نے ان کی کمزور صحت اور بصارت سے محرومی کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ بس

کام کا آغاز ہوجائے تو میرے تلامذہ اس کو دارالمصنّفین کی طرح ترقی دیدیں گے۔ان پر جس طرح دارالقرآن کا خیال راسخ ہو چکا تھا، اگر ان کی صحت اچھی ہوتی اور قوی ساتھ دیتے تو وہ فوری جوش کے تحت ہی سہی، اس کا آغاز کر دیتے۔

مولانا مرحوم کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ان کی مادر علمی کے احباب تو تھے ہی ملک کے تمام اہم مدارس ومکاتب کے نامور اہل علم، اساتذہ وغیرہ سے ان کے روابط تھے۔عام افراد سے بھی وہ ٹوٹ کر ملتے تھے۔ میرے والد حاجی عبدالرزاق مرحوم [۱۹۱۸- ۱۹۹۶ء] بھی ان کے دوستوں میں شامل تھے، بلکہ قریبی دوستوں میں تھے۔قاری نذیر احمد موضع خیرالدین پور ان کے اور میرے والد کے مشترکہ دوست تھے۔ان کے ساتھ مولانا مرحوم بھی میرے گھر قیام کرتے تھے۔جس زمانہ میں وہ عارضہ خلل دماغ میں مبتلا تھے، اس زمانہ میں بھی میرے گھر قیام کیا تھا۔ والدصاحب ان کی بڑی دلجوئی کرتے تھے۔ مجھے بچپن میں ان کی ضیافت کا موقع ملا۔میرے نکاح میں بھی ان کی خواہش شامل تھی اور انہیں کے کہنے میرے والد بندول رشتہ کے لئے راضی ہوئے تھے۔میری اہلیہ شائستہ ریاض ان کے مدرسہ کی صدر معلّمہ تھیں۔ان تعلقات کا وہ بڑا لحاظ کرتے تھے۔میرے ساتھ ان کا بڑا شفقت آمیز معاملہ تھا۔غالبًا یہ شفقت میرے والد ہی کے تعلق سے تھی۔وہ میرے والد کے زہدوورع کے بڑے مداح تھے۔میں بھی کبھی کبھی ان سے ملاقات کے لئے جیراج پور جایا کرتا تھا۔وہ بھی مجھ سے اور شائستہ سے ملنے آجایا کرتے تھے اور بڑی شفقت فرماتے تھے۔ان کی وفات سے میں نے اپنے والد کا نہ صرف ایک دوست کھودیا بلکہ ایک شفیق بزرگ اور نیک دل انسان سے بھی محروم ہوگیا۔حق مغفرت کرے۔

[۱۵]

پروفیسر محمد ہاشم قدوائی

مجھے جن بزرگوں سے محبت وشفقت حاصل ہوئی ان میں ایک پروفیسر محمد ہاشم قدوائی [۱۹۲۳-۲۰۱۷ء] بھی تھے۔اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ میں نے اپنی کتاب ''متعلقات شبلی'' اردو بک ریویو دہلی میں تبصرے کے لئے بھیجی۔اس کے ایڈیٹر محمد عارف اقبال نے اسے قدوائی صاحب کے پاس بھیج دیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک مفصل تبصرہ لکھا جو اردو بک ریویو میں شائع ہوا۔ چونکہ انہوں نے بڑا حوصلہ افزا تبصرہ لکھا تھا اس لئے میں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا، لیکن میرے پاس ان کا رابطہ نمبر نہیں تھا۔ابھی میں رابطہ نمبر حاصل کرنے کی کوشش ہی میں تھا کہ ایک روز قدوائی صاحب کا فون آ گیا۔ پہلے مبارک باد دی۔ پھر کہا کہ آپ نے اچھی کتاب لکھی ہے۔ ان کے تبصرے سے بھی مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ انہیں کتاب بہت پسند آئی ہے۔ پھر انہوں نے علامہ شبلی کا ذکر کیا۔ان کے علمی کارنامے گنائے اور آخر میں پھر جی کھول کر میری کتاب کی تعریف وتحسین کی۔البتہ ایک مقالہ ''شبلی علی گڑھ میں'' کے بارے میں کہا کہ آپ نے موضوع کا حق ادا نہیں کیا۔ بڑا تشنہ ہے۔واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ کمزور مقالہ ہے اور حق ادا نہیں ہوا ہے۔

میری کتاب پر قدوائی صاحب کے جی لگا کر تبصرہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا گھرانہ علامہ شبلی کا بڑا معتقد اور مداح رہا ہے۔علامہ شبلی کے اس گھرانہ کے کئی اشخاص سے تعلقات تھے۔اس میں سب سے گہرا تعلق تو مولانا عبدالماجد دریابادی سے تھا اور انہی کے توسط سے ان کے والد اور بھائی سے بھی تعلقات ہو گئے تھے۔ان کے نام علامہ شبلی کے خطوط بھی ''مشاہیر کے خطوط'' مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی میں شامل ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مدۃ العمر علامہ شبلی کے مداح رہے۔دراصل وہ علامہ شبلی کو اپنا

معنوی استاد خیال کرتے تھے۔ بار ہا اس کا ذکر کیا ہے۔ اپنی متعدد تحریروں اور خاص طور پر اپنی ''آپ بیتی میں انہیں بڑا زبردست خراج پیش کیا ہے۔ ان کے بعد ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی سے بھی گہرا تعلق قائم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ دارالمصنّفین قائم ہوا تو وہ اس کے رکن قرار پائے اور پھر آخر میں اس کی صدارت بھی انہیں تفویض کی گئی۔ دارالمصنّفین کی جبلی کے موقع پر انہوں نے جو تحریر پڑھی تھی اور جس کا عنوان ''شبلی، انسان، مصنف اور مصنف گر'' تھا وہ علامہ شبلی پر لکھی جانے والی سیکڑوں تحریروں پر آج بھی بھاری ہے۔

بہر حال یہ پس منظر جس کے اپنے عہد میں ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی صاحب اکلوتے نمائندہ تھے، میری کتاب کی تحسین وستائش کا سبب بنا اور دراصل یہی پس منظر مجھ سے پہلے رابطہ اور پھر تعلقات کا بھی غالباً عنوان تھا۔ پھر اکثر وبیشتر قدوائی صاحب کا فون آجاتا، لیکن وہ مختصر بات کرتے۔ اکثر تو ایسا ہوتا کہ وہ اپنی بات کہے چلے جاتے اور جہاں بات پوری ہوتی وہیں فون رکھ دیتے۔ ان کے پاس موبائل نہیں تھا۔ دو لینڈ لائن نمبر تھے، انہیں سے وہ بات کیا کرتے تھے۔ مئی ۲۰۱۶ء میں ان سے آخری بار گفتگو ہوئی تھی، اس کے بعد میں بہت بیمار ہوا اور دوسرے دوسرے شہروں اور اسپتالوں کی خاک چھانتا رہا۔ یہ سلسلہ اب بھی قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ شفائے کلی عطا فرمائے۔

قدوائی صاحب سے خط وکتابت بھی رہی، لیکن خدا جانے ان کے خطوط کیا ہو گئے۔ جب میں اپنے نام کے خطوط شائع کر رہا تھا مرحوم قدوئی صاحب کا محض ایک ہی خط ملا، جسے میں نے ''محبت نامے'' میں شائع کر دیا ہے۔ قدوائی صاحب خط اچھا لکھتے تھے مگر بے حد بدخط تھے۔ کئی کئی بار پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتے تھے۔ میرے نام ان کا جو اکلوتا خط محفوظ ہے اس میں انہوں نے اپنی بدخطی کے لئے معذرت بھی کی ہے۔ بڑے لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان کی بدخطی سے یاد آیا کہ یہ انہیں ورثے میں ملی تھی۔ خود مولانا عبدالماجد دریابادی کا خط بھی ایسا ہی تھا کہ اس کا پڑھنا دشوار ہوتا، مگر ان کے عاشق اسی ذوق وشوق سے پڑھتے بلکہ شائع کرتے تھے۔ استاذی ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی لکھنو میں یکجا تھے اور آپس میں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔ اسی درمیان

مولانا عبدالماجد صاحب نے کہا کہ آپ تو ایسا خط لکھتے ہیں کہ پڑھا نہیں جاتا۔ مولانا عبدالباری ندوی صاحب نے کہا آپ کا خط تو ہمارے دوست فخرالاسلام اعظمی کسی طرح پڑھتے ہیں اور ہمیں سناتے ہیں۔

۲۰۱۲ء میں میری دوسری کتاب ''مکتوبات شبلی'' شائع ہوئی تو مدیر اردو بک ریویو نے پھر انہیں کو تبصرے کے لئے دی۔ اس پر بھی انہوں نے بھرپور تبصرہ کیا۔ اس کا آغاز ان جملوں سے ہوا ہے:

> ''نابغہ عصر، متکلم اسلام، اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار، مورخ بے بدل، ماہر اسلامیات، اردو ادب کے ممتاز ترین معمار، جدید طرز کے سوانح نگار، سیاسی بصیرت اور فراست کے مالک علامہ شبلی ہمہ جہت اور عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ ایک طرف وہ خاتم النبیین محبوب رب العالمین کے معتبر ترین سیرت نگار تھے تو دوسری طرف وہ لاثانی طرز انشا اور اسلوب بیان کے مالک تھے۔ وہ تحریک ندوۃ العلماء کے اہم ترین بانیوں میں تھے اور آخر دم تک دارالعلوم کی خدمت کرتے رہے اور اسی کے ساتھ وہ مفکر جلیل بھی تھے۔ ان کا تاریخ ساز کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی فکر انگیز نظموں اور مضامین کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کا رخ موڑ دیا اور برطانوی حکومت کی دریوزہ گری اور غیر متزلزل اور غیر مشروط وفاداری کی پالیسی کو جو علی گڑھ تحریک کے بانی کی سیاست کا امتیازی پہلو ہے یکلخت مسترد کر دیا۔
>
> وہ اعلیٰ پائے کے مصنف تھے۔ افسوس ہے کہ ان کے متنوع اور تاریخ ساز کارناموں اور علمی کاوشوں پر اتنا نہیں لکھا گیا جتنا کہ لکھا جانا چاہئے تھا۔

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کے بارے میں قدوائی صاحب مرحوم کے کیا احساسات اور خیالات تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''جدید ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ''، میں بھی علامہ شبلی کے سیاسی خیالات اور ان کی سیاسی بصیرت کا بڑا عمدہ تجزیہ کیا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ دراصل قدوائی صاحب کا بنیادی موضوع ہی سیاسیات تھا اور بلا شبہ وہ

اپنے موضوع پر بڑی وسیع اور گہری نظر رکھتے تھے۔

قدوائی صاحب کا اصل وطن تو دریاباد ضلع بارہ بنکی تھا، مگر ان کا خانوادہ زیادہ تر لکھنو میں قیام پذیر رہا۔ وہ لکھنو ہی میں ۳۱؍مارچ ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم کے ساتھ اعلی تعلیم بھی حاصل کی۔ لکھنو یونیورسٹی سے بی اے اور ایم اے کیا۔ البتہ پی ایچ ڈی کی سند علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پھر یہیں یعنی علی گڑھ میں اکتوبر ۱۹۴۸ء میں شعبہ سیاسیات میں استاد مقرر ہوئے۔ ۳۴؍سال تدریسی خدمات انجام دیں۔ بے شمار طلبہ نے ان سے اپنی تشنگی بجھائی۔ مئی ۱۹۸۲ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔

آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے سیاسیات پر اعلی اسناد حاصل کیں، پھر سیاسیات ہی کو مدۃ العمر پڑھایا اور ایک بڑے سیاست داں رفیع احمد قدوائی کے بہت قرب رہے اور عملی سیاست میں بھی بھرپور حصہ لیا تو ان کی نگاہ سیاسیات پر کس قدر گہری رہی ہوگی۔ بلاشبہہ وہ اپنے موضوع مسلمانوں میں ایک مثالی شخص تھے۔

علمی سیاسیات کی تدریس وتعلیم کے ساتھ وہ عملی سیاست کے بھی ایک نمونہ اور مثالی شخص تھے۔ وہ مجاہد آزادی تھے۔ جدجہد آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ملک جس وقت آزاد ہوا ان کی عمر ۲۴؍سال تھی۔ اس دور طالب علمی میں تعلیم کے ساتھ انہوں نے جدوجہد آزادی میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ وہ اصلاً کانگریسی تھے اور ایسے اٹل کانگریسی تھے کے گردش لیل ونہار اور تمام تر سیاسی اتھل پتھل سے بھی ان کے موقف میں ذرا بھی لچک پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ۱۹۸۴ء میں انہیں راجیہ سبھا کا رکن نامزد کیا گیا، جس پر وہ چھ برس تک فائز رہے۔ اس دور میں انہوں نے انتہائی فعال اور سرگرم زندگی گذاری۔ خاص طور پر اس معاملہ میں تو ان کا کوئی ثانی نہیں ملے گا کہ وہ راجیہ سبھا کا رکن ہونے کے باوجود علمی زندگی سے دست بردار نہیں ہوئے اور مسلسل لکھتے پڑھتے رہے اور یہ سلسلہ ۱۰؍جنوری ۲۰۱۷ء یعنی وفات تک جاری رہا۔ انہوں نے اردو اور انگریزی میں متعدد کتابیں لکھیں۔ جمہوریہ ہند کا دستور اساسی، اصول سیاسیات اصول مدنیت، دنیا کی حکومتیں، مبادی سیاسیات، یورپ کے عظیم مفکر، جدید ہندوستان کی سیاسی وسماجی تاریخ، جدید فکر وغیرہ ان کے عظیم الشان علمی کارنامے ہیں۔

وہ سیاسیات میں مشہور محبِّ وطن اور مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی سے بہت متاثر تھے۔ ان کی سوانح ''رفیع احمد قدوائی'' کے نام سے لکھی۔ یہ بھی ان کی بڑی اچھی کتاب ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی ان کے چچا بھی تھے اور سسر بھی۔ ان کی شخصیت اور خدمات پر کئی مضامین میں اظہار خیال کیا ہے۔ اس سلسلہ کا ان سب سے بڑا کارنامہ ''مکتوبات ماجدی'' کی سات جلدوں میں جمع و تدوین ہے۔ مکتوبات ماجدی کی مختلف جلدوں پر انہوں نے جو دیباچے اور حواشی لکھے ہیں وہ ان کی گہرے علم و مطالعہ اور وسیع النظری کا نمونہ ہیں۔ اس میں وہ محض مرتب نظر نہیں آتے بلکہ فکر ماجدی کے شارح و ترجمان نظر آتے ہیں۔

قدوائی صاحب نے دور آخر میں تبصرہ و تعارف کا کام بڑے پیانہ پر کیا اور سیکڑوں کتابوں پر نقد و تبصرہ لکھا، جو اردو بک ریویو دہلی اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہوئے، جن کا ایک مجموعہ ''ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی کے تبصرے'' کے نام سے اردو بک ریویو دہلی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ اگر ان کے تمام تبصروں کو یکجا کیا جائے تو وہ کئی جلدوں میں سمائیں گے۔ اسی طرح ان کے مضامین کے مجموعے بھی شائع ہو سکتے ہیں۔

قدوائی صاحب کا ایک اور بڑا کارنامہ مراسلہ نگاری ہے۔ وہ بڑی محنت اور تندہی کے ساتھ رسائل کو مراسلات لکھ کر ان کے غلط اندراجات کی نشاندہی اور تصحیح کرتے تھے۔ بے شمار رسائل میں انہوں نے مراسلے لکھے ہیں۔ اگر ''مراسلات قدوائی'' جمع کئے جائیں تو اس کی بھی ایک بے حد مفید کتاب آسکتی ہے۔

قدوائی صاحب نے لمبی عمر پائی، جسے انہوں نے علم و ادب کی خدمت میں صرف کر دیا، اس سے ان کی علم دوستی کے ساتھ مستقل مزاجی کا بھی علم ہوتا ہے۔ جو لوگ ان کے قریب رہے انہوں نے بتایا کہ قدوائی صاحب علم و ادب اور سیاسیات کے علاوہ کسی موضوع پر کم ہی بولتے تھے۔

وہ سرسید احمد خاں کے مذہبی اور سیاسی افکار کے بڑے ناقد تھے۔ اور انہیں سخت ناپسند کرتے تھے اور اپنی ناپسندیدگی کا برملا اظہار کرتے تھے۔ مجھ سے فون پر اکثر اس طرح کی گفتگو کرتے۔ مجھ ہی سے نہیں انہوں نے اوروں کے سامنے بھی اس کا برملا اظہار کیا۔ انہوں نے کئی مراسلوں اور تبصروں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اردو بک ریویو دہلی میں ایک بار بعض اہل قلم نے

ان پر اعتراض بھی کیا۔ میں نے ''مکتوبات شبلی'' میں ایک جگہ یہ لکھا ہے کہ سر سید کی صحبت سے علامہ شبلی کی فکر ونظر میں انقلاب بر پا ہوا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قدوائی صاحب نے لکھا کہ

> ''یہ محل نظر ہے کہ علی گڑھ تحریک کے بانی کے فیض صحبت سے علامہ شبلی کی فکر ونظر میں انقلاب بر پا ہوا۔ علامہ کو نہ تو سید صاحب کے گمراہ کن مذہبی عقائد سے اتفاق تھا اور نہ سیاسی نظریات سے۔ وہ مغربی تہذیب وتمدن کے تفوق و برتری کے بالکل قائل نہ تھے۔ خطبات احمد یہ معذرت خواہانہ انداز کی کتاب ہے۔''

قدوائی صاحب اس بارہ میں سرسید کے جس قدر خلاف تھے، علامہ شبلی کے اسی قدر مداح۔ ایک بار انہوں نے کہا کہ شبلی نے سر سید کی مخالفت کر کے اسلام کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو سر سید احمد خاں اسلام کی روح ختم کر دیتے۔ علامہ شبلی نے اس دور میں اکیلے اسلام کی حفاظت کی ہے۔

ہاشم قدوائی صاحب میں جرات اور بے باکی تھی۔ وہ اپنا موقف جرات کے ساتھ رکھتے تھے، مگر مدلل گفتگو کرتے اور ٹھوس بنیادوں پر اپنا موقف پیش کرتے۔ ان کی وفات سے ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے اور مسلمان ایک بڑے دانشور سے محروم ہوئے ہیں۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور غریق رحمت کرے۔

---

[۱۶]

ڈاکٹر جمیل جالبی

آج ۱۸؍اپریل ۲۰۱۹ء کو اردو ادب کا ایک اور تابندہ نقش مٹ گیا۔ یعنی اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی نے ۸۹؍برس کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کیا۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون.**

ڈاکٹر محمد جمیل خاں معروف بہ جمیل جالبی ۱۲؍جون ۱۹۲۹ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ہندو پاک کے مختلف شہروں میں تحصیل علم کیا۔ ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول سہارن پور سے میٹرک پاس کیا۔ پھر میرٹھ آ گئے جہاں ان کے والد محمد ابراہیم خاں مقیم تھے۔ چنانچہ میرٹھ کالج سے ۱۹۴۵ء میں انٹر اور ۱۹۴۷ء میں بی اے پاس کیا۔ مشہور صحافی سید جالب دہلوی ایڈیٹر ''ہمدرد'' ان کے دادا کے ہم زلف تھے۔ ان کے علم و فضل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے نام کی نسبت سے جالبی لکھنے لگے۔

تحصیل علم کے بعد بہادر یار جنگ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ لیکن ملازمت کے ساتھ تعلیم کا سلسلہ قائم رہا۔ چنانچہ دوران ملازمت ایم اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں۔ پھر سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام مصطفے خاں کی زیر نگرانی قدیم اردو پر مقالہ لکھ کر ۱۹۷۲ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ ۱۹۷۸ء میں ''مثنوی کدم راؤ پدم راؤ پر'' ڈی لٹ کی سند تفویض ہوئی۔ بعدازاں ایس ایس سی کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوئے اور مختلف بڑے عہدوں کے حقدار ٹھہرے۔ چنانچہ ۱۹۸۳ء میں انہیں کراچی یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر کیا گیا۔ ۱۹۸۷ء میں مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر نشیں نامزد ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں قومی اردو لغت بورڈ کے سربراہ بنائے گئے۔ اس عہدہ پر وہ ۱۹۹۷ء تک فائز رہے۔ اپنے ان عہدوں کو انہوں نے بخوبی

نبھایا اور بڑی خدمات انجام دیں۔

انہیں لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف کا شوق کم عمری سے تھا۔ دور طالب علمی میں سکندر اور ڈاکو کے عنوان سے کہانی لکھی تھی جسے کالج میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ وہ متعدد ادبی محفلوں کا حصہ رہے۔ کچھ دنوں تک ماہنامہ ساقی کے معاون مدیر رہے۔ پھر کراچی سے خود اپنا رسالہ نیا دور جاری کیا۔ تصنیف و تالیف کا کام بھی بڑے پیمانہ پر انجام دیا۔ ان کی پہلی کاوش ''جانورستان'' تھی، جسے انہوں نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ انہوں نے درج ذیل کتابیں لکھیں یا مرتب کیں:

تاریخ ادب اردو، تنقید اور تجربہ، نئی تنقید، پاکستانی کلچر، ادب کلچر اور مسائل، محمد تقی میر، معاصر ادب، قومی زبان یکجہتی نفاذ اور مسائل، قلندر بخش جرات، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ، دیوان نصرتی، دیوان حسن شوق، قدیم اردو کی لغت، فرہنگ اصطلاحات جامعہ عثمانیہ، میرا جی ایک مطالعہ، ن م راشد وغیرہ۔

اس سلسلہ کا ان کا عظیم الشان کارنامہ ''تاریخ ادب اردو'' کی تصنیف ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے اور جس کے ہندو پاک سے متعدد ایڈیشن شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ تاریخ ادب اردو ان کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ وہ اس کے سوا کچھ بھی نہ کرتے تو بھی یہ کتاب ان کے نام کو اردو ادب میں دوام عطا کرنے کے لئے کافی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ ادب اردو نے ادبی مورخین میں ان کا نام معاصرین میں سب سے بلند اور ممتاز کر دیا ہے۔ اس حیثیت سے انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ قومی انگریزی اردو لغت کی تدوین ہے۔ اس کی تدوین میں انہوں نے انتھک محنت کی اور اپنی سب صلاحیتوں کو لگا دیا۔ اس لغت کو انگریزی اردو لغات میں سب سے بہتر قرار دیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ جانورستان، مضامین ایلیٹ، ارسطو سے ایلیٹ تک، ان کے اہم ترجمے ہیں۔ بچوں کے ادب پر انہوں نے حیرت ناک کہانیاں اور خوجی وغیرہ کتابیں لکھیں۔

مذکورہ تصنیفات، تالیفات اور تراجم سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر

متنوع اور وسیع وعمیق تھا اور وہ علم وادب اور تحقیق وتصنیف کے کن کن موضوعات پر عالمانہ درک وبصیرت رکھتے تھے۔ خاص طور پر تاریخ ادبیات اور تنقید وتحقیق ان کے کمالات کے میدان ہیں اور ان کی بیشتر کاوشیں انہیں دونوں میدانوں میں ہیں۔

اہل علم اور ارباب کمال نے نہ صرف ان کی جلیل القدر خدمات کا اعتراف کیا ہے بلکہ تحقیق میں ان کی بلندی اور تنقیدی عظمت بھی بیان کی ہے۔ رئیس امروہوی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ''علمی تحقیقی مہمات کو سر کرنے کے لئے جس تحمل، استعداد، محنت اور منطقی ذوق کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب چیزیں ڈاکٹر جمیل جالبی کی ذات میں مجتمع ہوگئی ہیں''۔ ڈاکٹر خلیق انجم کا خیال ہے کہ ڈاکٹر جمیل جالبی ایک منکسر المزاج عالم ہیں، جن کی زندگی نئی نسل کے لئے قابل تقلید ہے اور جن کے ادبی کارنامے اردو کا بیش بہا خزانہ ہیں۔

ان کے تحقیقی مزاج اور ان کی تحقیقی روش کا اندازہ اس مصرعے سے بھی لگایا جاسکتا ہے، جسے وہ اکثر پڑھا کرتے تھے:

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

حکومت اور نجی ادبی اداروں نے ان کی گراں قدر ادبی خدمات کا اعتراف کیا اور متعدد ایوارڈز اور انعامات سے سرفراز کئے گئے۔ چار بار داؤد ادبی ایوارڈ، یونیورسٹی گولڈ میڈل، محمد طفیل ایوارڈ، ستارہ امتیاز، ہلال امتیاز اور وہاں کے سب سے بڑا ادبی انعام کمال فن ایوارڈ سے بھی وہ سرفراز کئے گئے۔

وہ جس زمانہ میں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں اور اخبار اردو اسلام آباد کے مدیر تھے، راقم الحروف نے انہیں خط لکھا اور ''کتابیات شبلی'' مرتب کرنے کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ حتیٰ کہ میرے خط کو انہوں نے اخبار اردو اسلام آباد میں شائع کر دیا۔ چونکہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب سابق چیف ایڈیٹر ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد ''کتاب نامہ شبلی'' مرتب کر چکے تھے اس لئے انہیں اس کی اطلاع دی اور میرے خط کا تراشہ بھی انہیں بھیجا۔ چنانچہ ڈاکٹر سفیر اختر صاحب نے اپنا اشاریہ ''کتاب نامہ شبلی'' بطور تحفہ بھیجا، لیکن وہ ڈاک کی نذر ہو گیا۔ البتہ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ دارالمصنّفین میں موجود تھا۔ میں نے ''کتابیات شبلی'' کی ترتیب میں اس سے

بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔خاص طور پر علامہ شبلی سے متعلق جو مضامین ومقالات اور کتابیں پاکستان میں لکھی گئیں تھیں یا شائع ہوئی تھیں، اس کا علم اسی کتاب نامہ شبلی سے ہوا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی مرحوم نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ مجھے ایک گراں قدر تحفے کے ساتھ یہ خط بھی لکھا:

محترمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔یاد فرمائی کا شکریہ

یہ اچھی بات ہے کہ آپ شبلی نعمانی کے تعلق سے کتابیات مرتب کر رہے ہیں۔ہمارے یہاں کوئی کتابیات مرتب نہیں ہوئی ہے۔جب آپ اسے ہر اعتبار سے مکمل کرلیں تو اس کی ایک عکسی نقل مجھے بھی بھجوادیجئے گا۔مقتدرہ قومی زبان کے ۲۸ پمفلٹ آپ کو رجسٹری سے بھجوائے جارہے ہیں، ملنے پر مطلع کیجئے گا۔

امید کہ آپ بخیر وعافیت ہوں گے۔آپ کا مخلص

جمیل جالبی

۲۲/اگست ۱۹۹۳ء

مقتدرہ قومی زبان کے جو ۲۸ پمفلٹ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے مجھے بھیجے تھے، ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔	مولانا عبدالماجد دریابادی	ڈاکٹر تحسین فراقی	۱۹۹۱ء
۲۔	پطرس بخاری	کرنل غلام سرور	۱۹۹۱ء
۳۔	صوفی غلام مصطفےٰ تبسم	ڈاکٹر نثار قریشی	۱۹۹۱ء
۴۔	حافظ محمود شیرانی	ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی	۱۹۹۱ء
۵۔	ڈپٹی نذیر احمد	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	۱۹۸۷ء
۶۔	ڈاکٹر شوکت سبزواری	ڈاکٹر سلیم اختر	۱۹۹۲ء
۷۔	مولانا غلام رسول مہر	ڈاکٹر شفیق احمد	۱۹۹۱ء

۸۔	اختر شیرانی	ڈاکٹر یونس حسنی	۱۹۹۱ء
۹۔	فراق گورکھپوری	نوازش علی	۱۹۹۱ء
۱۰۔	خواجہ میر درد	ڈاکٹر الف و نسیم	۱۹۹۱ء
۱۱۔	محمد الدین فوق	محمد اجمل نیازی	۱۹۸۷ء
۱۲۔	ڈاکٹر گیان چند جین	ڈاکٹر انعام الحق جاوید	۱۹۹۱ء
۱۳۔	جگر مراد آبادی	ڈاکٹر احمر رفاعی	۱۹۹۱ء
۱۴۔	ممتاز شیریں	ڈاکٹر انوار احمد	۱۹۸۹ء
۱۵۔	علامہ اقبال	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۹۹۲ء
۱۶۔	ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم	ڈاکٹر ممتاز گوہر	۱۹۸۷ء
۱۷۔	امام بخش ناسخ	صابر کلوروی	۱۹۸۷ء
۱۸۔	سلیم احمد	ڈاکٹر مشرف احمد	۱۹۸۹ء
۱۹۔	سر شیخ عبد القادر	محمد حنیف شاہد	۱۹۹۲ء
۲۰۔	ڈاکٹر سید عبد اللہ	سید جمیل احمد رضوی	۱۹۸۹ء
۲۱۔	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	ڈاکٹر معین الدین عقیل	۱۹۸۷ء
۲۲۔	مولانا صلاح الدین احمد	ڈاکٹر انور سدید	۱۹۸۹ء
۲۳۔	سید عابد علی عابد	ڈاکٹر عبد الرؤف شیخ	۱۹۸۷ء
۲۴۔	مولانا محمد علی جوہر	ابو سلمان شاہجہاں پوری	۱۹۹۲ء
۲۵۔	حکیم احمد شجاع	ڈاکٹر اے بی شیخ	۱۹۸۷ء
۲۶۔	سید مسعود حسن رضوی ادیب	ڈاکٹر طاہر تونسوی	۱۹۸۶ء
۲۷۔	آغا حشر کاشمیری	ڈاکٹر اے بی اشرف	۱۹۸۶ء
۲۸۔	خواجہ حیدر علی آتش	صابر کلوروی	۱۹۸۷ء

ڈاکٹر جمیل جالبی مرحوم کے اس علمی تحفہ سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا اور مذکورہ شخصیات کی کتابیات سے ان کے تمام کارنامے نگاہوں میں آ گئے۔ اس سے میرے علم و معلومات میں بڑا

اضافہ ہوا۔ان کے اس تحفے کے لئے میں ان کا ہمیشہ ممنون رہوں گا۔دور طالب علمی میں ملا ان کا یہ تحفہ میرے ذاتی کتب خانہ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے۔

اس وقت ''کتابیات شبلی'' کا کام بعض دوسرے کاموں کی وجہ سے ملتوی ہو گیا،لیکن جب ۲۰۱۱ء میں یہ کام پایہ تکمیل کو پہنچا تو میں نے اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی خدمت میں مقتدرہ قومی زبان کے پتہ سے بھیجا۔اس وقت مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشیں مشہور شاعر افتخار عارف صاحب تھے۔انہوں نے مجھے لکھا کہ کتاب جالبی صاحب کے پاس بھیج دی گئی ہے۔اس زمانہ میں جالبی صاحب گوشہ نشیں اور ہر طرف سے بے نیاز ہو کر ''تاریخ ادب اردو'' کی بقیہ جلدوں کی تکمیل میں مصروف تھے۔ان کا کوئی جواب تو نہیں آیا مگر مجھے یقین ہے کہ اس سے وہ بہت خوش ہوئے ہوں گے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان وادب کے بے لوث سپاہی تھے اور بیش بہا خدمات انجام دیں۔دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی بشری لغزشوں سے درگذر فرمائے اور غریق رحمت کرے۔

[۱۷]

پروفیسر خورشید نعمانی رودولوی

ایک پیکر شرافت

پروفیسر خورشید مظہرالحق نعمانی رودولوی [پ:۱۹۳۶ء] اردو کے ممتاز اہل قلم، مصنف، محقق اور ناقد ہیں۔ دارالمصنّفین کی ادبی خدمات [مطبوعہ:۱۹۷۷ء]، فکر ونظر [مطبوعہ:۱۹۸۲ء]، عرفان آگہی [مطبوعہ:۱۹۹۲ء] اور دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات [دو جلدیں، مطبوعہ دارالمصنّفین] جیسی اہم کتابیں اور متعدد ادبی وتنقیدی مضامین ان کے نوک قلم سے نکل چکے ہیں، وہ گذشتہ نصف صدی سے علم وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ضعف اور پیرانہ سالی کے باوجود ان کا قلم اب بھی رعنائی بکھیر رہا ہے۔

ایک بار میں نے ان سے خودنوشت لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے اسے نظرانداز کردیا۔ پھر میں نے مختصر حالات لکھنے کی فرمائش کی تو انہوں نے ایک خط میں کچھ باتیں لکھ بھیجیں۔ اس کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''میں اپنے بارے میں کیا لکھوں، کبھی اس کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ مجھے لکھنے پڑھنے کا شعور دارالمصنّفین ہی سے ملا۔ جب میں بی اے کا طالب علم تھا تو ہمارے پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین کے گولڈ اسمتھ کا ایک مضمون انگریزی ادب کی کتاب پر تھا، اس کا عنوان تھا City night peace جس کا ترجمہ میں نے ''سکوت نیم شبی'' کے عنوان سے کیا اور قومی آواز کے سنڈے ایڈیشن میں

۱۹۵۳ء میں چھپا۔ دارالمصنّفین کے علم پرور ماحول میں مجھے پڑھنے کا زریں موقع ملا اور میں نے حسب استعداد کافی پڑھا۔

۱۹۶۲ء میں میں بمبئی آ گیا۔ یہاں دارالمصنّفین تو نہیں تھا لیکن پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور محترم عبدالرزاق قریشی صاحب جیسے ذی علم حضرات مل گئے، جس سے میری علم کی طلب مہمیز ہوئی۔ میں نے ایم اے، پی ایچ ڈی کی ڈگری بمبئی یونیورسٹی سے لی۔ کالج میں حالات کی ناسازگاری سے ایم اے تاریخ بھی کرلیا۔ گورکھپور یونیورسٹی سے بی ایڈ بھی کرلیا تھا۔ مقالہ جیسا کہ آپ خود جانتے ہیں ''دارالمصنّفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات'' ہے جو ۱۹۷۷ء میں (بمبئی سے) شائع ہوا۔ یہ میری پہلی کاوش ہے اور اس بات کی خوشی ہے کہ یہ کتاب دارالمصنّفین میں تعطیلات کے دوران لکھی گئی اور شاہ (معین الدین) صاحب اور صباح الدین صاحب مرحوم کی نظروں سے گذر کر اچھی قرار پائی۔ یہ میری دوسری کاوش ہے جسے طالب علمانہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ میرا پہلا مجموعہ مضامین ''فکر ونظر'' ہے جو کہ ۱۹۸۲ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ مزاج سے بے خبری اور انکساری اس کتاب سے جھلکتی ہے۔ اس میں مختصر مختصر ۱۶ر مضامین شامل ہیں، جن میں گیارہ مضامین ادبی وتنقیدی اور پانچ مضامین تحقیقات پر مشتمل ہیں۔ (۱) اقبال اور حب الوطنی (۲) اقبال کا تعلیمی نقطہ نظر (۳) مولانا آزاد شخصیت اور فن (۴) مجاز حقیقت کے دور میں (۵) مجاز کی انقلابی شاعری (۶) پریم چند جنگ آزادی کا عظیم مصنف (۷) غالب ایک مطالعہ (۸) کیفی اعظمی کی شاعری (۹) یاس یگانہ کا فن (۱۰) اردو ادب میں رام چندر کا ذکر (۱۱) انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ شخصیات کے ضمن میں (۱۲) مولانا عبدالسلام ندوی (۱۳) شاہ معین الدین احمد ندوی (۱۴) پروفیسر نجیب اشرف ندوی (۱۵) عبدالرزاق قریشی مرحوم (۱۶) ایک مثالی زندگی انوارالحق مرحوم۔

میری تمام سابقہ کتابوں کے نسخے دریابرد ہوگئے۔ اس کی ایک کاپی

میرے پاس رہ گئی ہے جوکسی معتبر شخص کے ذریعہ آپ کو ارسال کروں گا۔آپ اس کی زیراکس کرا لیجئے گا اور کتاب مجھے واپس کر دیجئے گا۔ ہندی میں ایک مختصر سا کتابچہ ۱۹۷۷ء میں اقبال کی راشٹر یہ چیتنا شائع ہوا، جس کا ترجمہ اقبال اور حب الوطنی اس مجموعہ میں شامل ہے۔مولانا آزاد پر شاہ صاحب نے کہا تھا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ لوگوں کو یہ گمان گذرے کہ یہ مضمون شاہ صاحب کا ہے۔ یاس یگانہ پر مضمون بہت پسند کیا گیا اور شیرازہ سری نگر اور دہلی کے ایک معیاری رسالہ نے اسے نقل کیا تھا۔انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قریشی صاحب کی نگرانی میں تحقیق کی روشنی میں لکھا گیا تھا، جس کے سارے سرکاری حوالے مجھے ان سے ملے تھے۔ پھر دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات دو جلدوں میں آپ کے سامنے ہے۔ ''فکر ونظر'' کے بعد ۱۹۹۲ء میں ''عرفان آگہی'' شائع ہوئی، جس کا نسخہ آپ کو مل چکا ہے۔اس وقت بھی پندرہ بیس مضامین جو کہ سمیناروں اور کانفرنسوں میں لکھے گئے ہیں اور کچھ شائع بھی ہو چکے ہیں تیار ہیں، مگر ان کو نقل کرنا اور پبلشر کی تلاش میرے بس کے باہر ہے۔ جب ضیاء الدین صاحب مرحوم زندہ تھے جی چاہتا تھا کہ ان کی خدمت میں عرض کروں کہ انہیں ایک دو جلدوں میں دارالمصنفین ہی سے شائع کر دیں مگر چونکہ مضامین کے مجموعے وہاں سے غالباً کبھی چھپے نہیں اس لئے ہمت نہیں پڑی۔اب وہ نہیں رہے تو یہ آسرا بھی نہیں رہا۔

بمبئی میں لوگوں نے یہ ستم ظریفی کی کہ مجھے تبصرہ لکھنے پر لگا دیا۔اس تبصرے بازی نے میری تخلیقی قوت کو سخت نقصان پہنچایا۔ چونکہ بامروت آدمی ہوں اس لئے انکار کسی سے نہیں کرسکتا۔عرصہ سے تین کتابیں لکھنے کی خواہش بھی ہے اور تمنا بھی اور جو بآسانی ہوسکتی ہیں۔

ا۔میرے ننیہالی بزرگ حضرت شیخ احمد نوشہ رودولوی جو کہ انتہائی برگزیدہ صوفی اور مشائخ چشت میں سے ہیں، ان پر کتاب لکھوں۔

۲۔حضرت شیخ صفی الدین (میرے داد ہالی بزرگ) جو کہ علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے اور جن کے پوتے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی ہیں، ان پر ایک کتاب میرے پیش نظر ہے۔عملاً کوئی کام نہیں ہوا ہے۔

۳۔مشاہیر رودولی۔رودولی زمانہ دراز سے علم ومعرفت کی بستی رہی ہے۔مندرجہ بالا بزرگوں کے علاوہ اور بھی بزرگان دین ہوئے ہیں۔پھر چودھری محمد علی رودولوی، چودھری آفتاب احمد، شاہ صاحب، مولانا عبدالعلیم اسعدی، مسعود اختر جمال، مجاز، شارب اور دوسرے بہت سے بزرگ وشعراء جو کہ گمنامی میں سو گئے۔

افسوس کہ وقت نکلتا جا رہا ہے اور کوئی..............

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پاؤں ہیں رکاب میں

یہ اقتباس اگر چہ بہت معلوماتی ہے اور مستند بھی، مگر اس میں ان کی سوانح حیات کی کئی اہم باتیں لکھنے سے رہ گئی ہیں۔انہوں نے اپنے بارے میں اپنی کتاب دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات میں بھی دو پیرا لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''میں ۱۹۳۶ء میں رودولی کے مردم خیز قصبہ میں پیدا ہوا۔میرا خاندانی سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت شیخ مخدوم صفی الدین نعمانی جد حضرت اسماعیل اور حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور والدہ کی طرف سے حضرت شیخ احمد عبدالحق نوشہ رودولوی سے ملتا ہے۔یہ دونوں بزرگ اپنے علم وفضل اور تصوف ومعرفت میں انتہائی ممتاز جانے جاتے ہیں۔

میری ابتدائی تعلیم مخدومیہ اسکول، انٹرمیڈیٹ مہاراج سنگھ کالج بہرائچ بی اے اور بی ایڈ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ سے ہوئی۔ایم اے (اردو وفارسی) اور ایم اے تاریخ اور پی ایچ ڈی (اردو) کی ڈگریاں بمبئی یونیورسٹی سے ملیں۔ ۱۹۶۲ء میں انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی اور ۱۹۶۶ء مہارشی دیانند پوسٹ

گریجویٹ کالج پریل بمبئی میں شعبہ اردو وفارسی میں ملازمت کی، جہاں سے ۳۰؍جون ۱۹۹٦ء کو سبکدوش ہوا۔ کالج کی ملازمت کے علاوہ بمبئی یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ۱۹۷۲ء سے ایم اے اردو کے کلاسز پڑھاتا رہا۔ ۱۹۸۲ء سے یونیورسٹی کا پی ایچ ڈی گائڈ اور ۱۹۸٦ء سے ایم فل کے کلاسز آج بھی پڑھاتا ہوں۔ میری نگرانی میں تین طلبہ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اب تک میری تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

(دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات حصہ اول ص ۱۳۴)

پروفیسر خورشید نعمانی صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں۔ وہ اہل قلم ہیں، مصنف ہیں، مبصر ہیں، محقق ہیں، ادیب ہیں، نقاد ہیں، دانشور ہیں، استاذ ہیں، مربی ہیں، حقیقت شناس ہیں، باریک بیں ہیں، مگر اس مجموعہ اوصاف کا نمایاں ترین وصف ان کی شرافت و مروت ہے۔ ان کا سینہ، کینہ و کدورت، تعصب، نفرت اور بغض وحسد کی آلائشوں سے یکسر پاک اور صاف شفاف ہے۔ اس مادی دور میں، مہر و مروت، محبت اور انکسار و تواضع کا ایسا پیکر شکیل و جمیل مشکل ہی سے ملے گا۔

جیسا کہ اوپر گذرا خورشید صاحب کا تعلق قصبہ رودولی ضلع بارہ بنکی کے مشہور صوفی بزرگ شیخ احمد عبدالحق نوشہ رودولوی کے خانوادے سے ہے۔ جو اپنے اور اوصاف و کمالات کے ساتھ شرافت اور نیک نفسی میں بھی ممتاز ہے۔ گویا نیک نفسی، پاک طینتی، حلم وعفو، درگذر، محبت و شفقت اور وضع داری خورشید نعمانی صاحب کو ورثے میں ملی ہے۔

راقم کا دارالمصنّفین آنا جانا ہوا تو اور بڑے ناموں کے ساتھ پروفیسر خورشید نعمانی کا نام بھی سنا۔ ان کی شرافت، مروت و محبت، علم دوستی اور اہل قلم کی قدر دانی کا ذکر بھی بارہا سنا۔ دارالمصنّفین کے ارباب حل وعقد اور رفقاء و ملازمین سب کے سب ان کے بڑے شیدائی اور قدرداں نظر آئے۔ دارالمصنّفین کے سابق ناظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ان کے بزرگ تھے۔ انہی کی سرپرستی میں انہوں نے اعظم گڑھ میں تعلیم حاصل کی اور کئی برس تک شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ میں زیر تعلیم رہے۔ پھر یہیں روڈویز میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس لئے اعظم گڑھ سے انہیں بے پناہ محبت

ہے۔ وہ اعظم گڑھ میں دس برس رہے۔ اس کو یاد کرتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

''میری زندگی کے دس بیش قیمت سال [۱۹۵۳-۱۹۶۳ء] دارالمصنّفین اعظم گڑھ میں اپنے مشفق و مربی بزرگ شاہ معین الدین احمد ندوی کے ساتھ گذرے۔ اسے دارالمصنّفین کا دورِ زریں کہا جاسکتا ہے۔ سوائے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے جن کا انتقال ۱۹۵۳ء میں کراچی میں ہوا۔ دارالمصنّفین کے صف اول کے تمام بزرگ مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولوی عبدالباری، جناب یحییٰ اعظمی اور آخر میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی صحبتوں سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا اور تمام عمائدین ملک جن میں مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید محمود، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی وغیرہ سے بھی شرف ملاقات رہا۔

میں اگر یہ لکھوں کہ میری تحریروں میں دارالمصنّفین کے اثرات نمایاں ہیں، خاکم بدہن ایسا کچھ نہیں ہے، مگر یہاں دس سال کے طویل عرصہ قیام میں ان بزرگوں کی شخصیت اور تالیف و تصنیف کے نقوش ضرور جاگزیں ہوئے اور ان سے میں نے زندگی میں تہذیب و ترتیب کا سبق لیا اس لئے لہولگا کر شہیدوں میں داخل ہونے کی جرات کر رہا ہوں، کیونکہ میری زندگی اور تحریروں کا محور دارالمصنّفین بطور ادارہ اور وہاں کی تمام ممتاز علمی و ادبی شخصیات ہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں، اس لئے اگر میں میر کی زبان میں یہ لکھوں:

کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے

تو غلط نہ ہوگا۔'' (دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات حصہ اول ص ۱۳۵)

ضلع اعظم گڑھ کے احباب و معاصرین اور اہل علم و دانش کے علاوہ اعظم گڑھ کے عام باشندوں سے بھی محبت کرتے ہیں۔ راقم کو بھی بے پایاں محبت حاصل ہے۔ خطوط کے ذریعہ برابر حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ ''محبت نامے'' میں ان کے متعدد خطوط شامل ہیں، ان خطوط میں ان کی زندگی کے متنوع نقوش ثبت ہیں۔

وہ میری تحریروں کو پڑھتے ہیں اور مفید مشورے دیتے ہیں۔ میری تقریباً ہر کتاب پر بطور تعارف وتبصرہ اور دیباچہ کے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا ہے اور ہر دفعہ حوصلہ افزائی کا نیا انداز سامنے آیا ہے۔ ایک انداز ملاحظہ ہو۔ مکتوبات شبلی کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا کہ:

''متعلقات شبلی، کتابیات شبلی، شبلی سخنوروں کی نظر میں اور آثار شبلی کے بعد اب مکتوبات شبلی، قیامت دم لے یا نہ لے لیکن ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ہیں کہ شبلی شناسی کی راہ میں سفر مدام میں مبتلا ہیں۔ اہل علم ابتک غالب شناسی اور اقبال شناسی تک محدود ہو کر رہ گئے تھے، لیکن مولانا شبلی ان بزرگوں سے کم نہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ شبلی پر بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے، لیکن جس جوش وجذبہ اور خلوص کے ساتھ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شبلی شناسی کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے وہ قابل صد تحسین وآفریں ہے اور اس شعر کا معنوی مصداق بھی:

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

شاید یہ انداز ان کی سرشت میں شامل ہے۔ میری طرح اور بھی بہت سے افراد ہیں جو پروفیسر خورشید نعمانی صاحب کی شفقتوں، عنایتوں اور مہربانیوں سے شادکام ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں اعظم گڑھ میں ہر شخص ان کی شرافت، نیک نفسی اور سلیم الطبعی کا معترف ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی دارالمصنّفین سے ہجرت کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے دارالمصنّفین کی زمام کار سنبھالی اور ایک بڑے پرآشوب دور (تقسیم ہند) میں کشتی دارالمصنّفین کو بھنور سے بچا کر ساحل مراد تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کے لئے انہوں نے اپنی سب صلاحیتیں لگا دیں۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی جو تقریباً دو درجن بلند پایہ علمی اور سوانحی کتابوں کے مصنف، مؤلف، مترجم اور نامور ادیب وانشاء پرداز ہیں، ان پر کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا، ان کے سوانح زندگی بھی قلم بند نہیں ہو سکے تھے۔ اس احساس کے پیش نظر راقم نے ان پر ایک مفصل مقالہ ''شاہ معین الدین احمد ندوی حیات وخدمات'' لکھا جسے اشاعت کے لئے ممبئ کے مشہور ادبی رسالے ''نوائے ادب'' میں بھیجا۔ اس کے لائق مدیر ڈاکٹر آدم شیخ نے پروفیسر

خورشید نعمانی کے مشورے سے اسے کتابی صورت میں شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی ۔ چنانچہ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ کے شاہ معین الدین احمد ندوی نمبر سے نامور اہل قلم کے چند مضامین کو شامل کر کے اسے کتابی صورت میں ''شاہ معین الدین احمد ندوی، علم و حلم کی شمع فروزاں'' کے نام سے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئ نے شائع کیا۔ اس سلسلے میں خورشید صاحب سے خط و کتابت رہی ۔ ان کا خیال تھا کہ اسی بہانے شاہ صاحب پر ایک عمدہ کتاب شائع ہو جائے گی اور ایک بار شاہ صاحب کی یادیں تازہ ہو جائیں گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کوشش اصلاً خورشید صاحب کی شاہ صاحب اور پھر راقم سے محبت کا نتیجہ تھی ۔

اس کوشش کے بعد راقم نے شاہ صاحب کی زندگی اور خدمات پر ایک مستقل کتاب لکھی اور طباعت کے لئے بعجلت خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ بھیجنا چاہا۔ خورشید صاحب کو خط لکھا کہ اس پر مقدمہ آپ ہی کے قلم سے جچے گا، لیکن وقت کم ہے اور اسے از جلد طباعت کے لئے بھیج دینا ہے ۔ چنانچہ خورشید صاحب نے ایک ہفتہ کے اندر انتہائی شاندار علمی دیباچہ لکھ کر بھیجا اور میرے اس کام کو جرأت رندانہ سے تعبیر کیا ۔ یہ محض ان کی شرافت اور محبت تھی کہ اپنے سے ایک انتہائی کمتر طالب علم کی فرمائش کو بعجلت پورا کیا۔ افسوس کہ یہ کتاب ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی نظر میں قابل وقعت نہ ٹھہری اور وہاں سے شائع نہ ہوسکی۔ البتہ ایک سال بعد ادبی دائرہ اعظم گڑھ نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ الحمدللہ کتاب نے مقبولیت پائی اور ایک سال کے اندر اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اس کے دوسرے اضافہ شدہ ایڈیشن کی اشاعت کے لئے حالات ابتک سازگار نہ ہوسکے ۔

ڈاکٹر آدم شیخ کی کتاب ''شاہ معین الدین احمد ندوی علم و حلم'' جس سال شائع ہوئی، اس سال انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئ کے حارث میموریل لکچر کے لئے دارالمصنّفین کے ناظم مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کو منتخب کیا گیا تھا۔ اسی تقریب میں اس کتاب کی رونمائی بھی ہونی تھی ۔ ڈاکٹر آدم شیخ اور خورشید نعمانی صاحب نے اس تقریب میں میری شرکت کو ضروری قرار دیا اور خطوط کے ذریعہ اس کی اہمیت جتائی ۔ چنانچہ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کے ساتھ میں نے بھی بمبئ کے لئے رخت سفر باندھا اور اس تقریب میں شرکت کی، مگر بعض ناگریز حالات کی وجہ

سے خورشید صاحب کو اپنے وطن رودولی جانا پڑا۔ اس کا انہیں بہت دکھ ہوا کہ ہم لوگ بمبئی آئے اور وہ ضیافت بھی نہ کر سکے۔ کئی خطوط میں اس کا ذکر کیا اور زبانی بھی بار بار کہتے رہے۔ ایسی ٹوٹ کر محبت کرنے والے کہاں ملتے ہیں۔

اس کے بعد بمبئی کے مولانا عبدالسلام ندوی سمینار میں شریک ہوا تو وہ موجود تھے، مگر وقت کی کمی کی وجہ سے ہماری جلد واپسی ہوگئی۔ البتہ ایک روز خورشید صاحب کے یہاں چائے پر حاضر ہوا۔ ان کا انداز میزبانی دیدنی تھا۔ خورشید صاحب یکے بعد دیگرے ہر شخص کے سامنے چائے سے پہلے کے لوازمات پیش کرتے رہے۔ پیالیوں میں چائے انڈیل انڈیل کر اس طرح پیش کرتے رہے گویا وہ میزبان نہیں بلکہ اس مجلس کے سب سے چھوٹے فرد ہوں۔ اس خاکساری تواضع اور وضع داری کے لوگ اب آہستہ آہستہ ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خورشید صاحب کو طویل عمر وصحت عطا فرمائے۔

گذشتہ سال بمبئی جانا ہوا تو ان سے بار ہا ملاقاتیں رہیں اور ہر ملاقات میں ان کا جوشِ محبت یہ احساس دلاتا رہا کہ جیسے ہر ملاقات پہلی ملاقات ہو۔ میں جب ان کے یہاں پہنچا تو وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے۔ چھوڑ کر باہر آ گئے۔ مجھے دیکھ کر اس قدر خوش ہوئے کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایسے اوقات میں ان کی شرافت اور خاکساری کے تمام دروازے وا ہو جاتے ہیں۔ اس سفر میں انہوں نے اس حقیر کی دعوت کی، جس کی تفصیل میں نے اپنے سفرنامہ [ساحلوں کے شہر میں] میں لکھی تھی، وہ ملاحظہ ہو:

> ''۷؍جون کی شام کو ان کے یہاں کھانے پر حاضر ہوا۔ خورشید صاحب بڑی شاندار اور معلومات افزا گفتگو کرتے رہے۔ وہ دیر تک علم و ادب کے مختلف موضوعات پر روشنی ڈالتے رہے۔ میں چاہتا تھا کہ ان کی گفتگو جاری رہے، اس لئے کہ مجھے ان کے کھانے سے زیادہ لطف و لذت اور حلاوت ان کی باتوں میں مل رہی تھی مگر رات کے دس بج چکے تھے، گو بمبئی کے لحاظ سے ابھی شام ہی ہوئی تھی مگر ہمارے لئے برسوں کی عادت چھوڑنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ دس بجے کھانا کھایا گیا اور اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ خورشید صاحب کی گفتگو میں حلاوت زیادہ

تھی یا ان کے کھانے میں۔''

خورشید صاحب بمبئی کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا اہم حصہ ہیں۔ وہاں کے ہر حلقے میں وہ مقبول اور ہر پروگرام میں مدعو ہوتے ہیں اور اپنی حصہ داری نبھاتے ہیں۔ ہر شہر اور ہر قصبہ کی طرح بمبئی کا ادبی حلقہ بھی مختلف گروہوں میں تقسیم ہے، مگر خورشید صاحب کا کوئی مخصوص حلقہ نہیں۔ وہ سب کے ہیں اور سب ان کو اپنا ہی خیال کرتے ہیں۔ اس سے ان کی مرنجاں مرنج شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی کی آمد پر بمبئی یونیورسٹی نے ایک ادبی شام کا اہتمام کیا تھا چونکہ یہ پروگرام فوری طور پر طے پایا تھا، اس لئے فون سے اہل علم کو مدعو کیا گیا۔ خورشید صاحب نے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کو بمبئی میں میری موجودگی کی اطلاع دی اور کہا کہ میں ان کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے فون کر کے کہا کہ کل آپ آجائیں تو اس پروگرام میں شرکت کی جائے، اچھا لگے گا۔ متعدد اہل علم سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔ چنانچہ اس پروگرام میں شرکت محض خورشید صاحب کی محبت تھی۔ ان کی وضع داری اور مہر و وفا کی تصویر کا حسن اس وقت دیدنی تھا جب میں اس پروگرام سے واپس آیا خورشید صاحب نے کہا کہ چائے پی کر جائیں۔ میری بالکل خواہش نہ تھی، اس لئے انکار کیا مگر ان کی محبت غالب رہی۔ انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور پلا کر ہی اٹھنے دیا۔ احساس ہوا کہ بمبئی جیسے ہماہمی شہر میں ایک ایسا چراغ بھی روشن ہے جو اپنے بزرگوں کی قدیم روایات کی اس قدر پاسداری میں منہمک رہتا ہے۔ خوردوں کے ساتھ اس قدر مہذب، شگفتہ اور خوب صورت انداز زندگی کی آئینہ داری کرنے والے کم از کم بمبئی میں تو مشکل ہی سے ملیں گے۔

بمبئی سے واپسی کے موقع پر انہوں نے جس طرح افلاطون کے پیکٹ احباب و معاصرین کے لئے پیش کئے اب بمبئی میں بہت سے لوگ اپنے قریبی عزیزوں کے لئے بھی نہیں کرتے۔ اعظم گڑھ کے بعض سمیناروں میں وہ آئے تو نہ صرف راقم کے لئے بلکہ اپنے بہت سے احباب کے لئے تحفے لائے۔ حالانکہ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ خورشید صاحب کا ان سے دور کا بھی رشتہ نہیں بلکہ یہ محض محبت اور تعلق کا کرشمہ ہے۔

خورشید صاحب کا ذوق ادب دارالمصنّفین میں پروان چڑھا۔ ان کا موضوع تحریر و تصنیف بھی یہی ادارہ ہے۔ گوانہوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں وہی رکھ رکھاؤ ہے جو دبستان شبلی کا امتیاز ہے۔ یہاں یہ واضح کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دبستان شبلی کا بنیادی وصف یہ ہے کہ تحقیق وتنقید میں تنقیص کے عناصر کا گذر نہیں ہوتا، اپنا موقف صاف اور شستہ انداز میں پیش کردیا جاتا ہے۔ اگر بہ غائرنظر دیکھا جائے تو اسے اسلوبی شرافت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ خورشید صاحب کی تحریروں میں بھی اس شرافت کی جلوہ گری ہے۔ متانت، وقار اور سنجیدگی ان کی تحریر کی دوسری خوبیاں ہیں۔ عبدالرزاق قریشی مرحوم سابق ایڈیٹر نوائے ادب ممبئی نے بھی ان کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔

خورشید صاحب کی تحریروں کو وہ مقبولیت نہیں ملی جو ملنی چاہئے تھی۔ ہمارے شعروادب کا بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ مثبت انداز کی تحریروں کو وہ حسن قبول نہیں ملتا جو منفی تحریروں کو ملتا رہا ہے۔ سستی، جذباتی اور جارحانہ تحریروں میں لوگوں کو کچھ زیادہ ہی لطف ولذت اور مزہ ملتا ہے، لیکن جب مزاج اور زمانہ بدلے گا تو خورشید صاحب اور اس طرز کے دوسرے ادیبوں کی تحریروں ہی کی قدر کی جائے گی۔

خورشید صاحب نے دوجلدوں میں دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات قلم بند کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس ادارے سے ان کو جو محبت اور لگاؤ ہے یہ کتاب اس کا خوب صورت مظہر ہے۔ اور حق یہ ہے کہ انہیں اس موضوع پر قلم اٹھانے کا حق تھا۔ راقم الحروف نے بھی ''دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے۔ اس لئے بلامبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ خورشید صاحب کی کتاب آئندہ حوالے اور ماخذ کا کام دے گی۔

ایک موضوع پر کام کرنے کے باوجود خورشید صاحب تمام تعصّبات سے پاک رہے۔ حالانکہ عموماً ایسا دیکھا گیا ہے کہ ایسے مواقع پر کم از کم ایک دوسرے کی تنقیص عام بات ہوجاتی ہے اور ایک دوسرے کے کام کو ہلکا کرکے پیش کیا جاتا ہے، مگر خورشید صاحب کا دل ان آلائشوں سے پاک ہے۔ خوردنوازی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری بعض تحریروں کو انہوں نے بہت سراہا۔ مجموعی طور سے خورشید صاحب ہر دل عزیز شخصیت کے مالک ہیں، علم وفن اور تصنیف و

تالیف کے میدان میں ممکن ہے وہ بعض معاصرین سے فائق نہ ہوں، مگر شرافت، محبت، مروت، عزم وحوصلہ، نیک نیتی، وضع داری، خاکساری اور پاکبازی میں ان کا کوئی ہمسر شاید ہی مل سکے۔ ایسے شریف الطبع اور پاک طینت شخص کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے کہ:

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے دن ہوں ہزار برس

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ پابندی سے یونیورسٹی جاتے اور تعلیمی سرگرمیوں میں حصہ لیتے۔ اپنے اور دوسرے اساتذہ کے زیرنگرانی ریسرچ کرنے والے طلبہ کی مدد کرتے۔ ان کے زیرنگرانی کئی طلبہ نے پی. ایچ ڈی. کے مقالات لکھے۔ ان میں ظہیرانور مرحوم بھی تھے۔ آخری طالب علم جس نے ان کے زیرنگرانی اقبال سہیل کی شاعری پر مقالہ لکھا وہ وصی احمد ہیں۔ ان کا تعلق اعظم گڑھ ہی سے ہے۔

کئی برس ہوئے ان کی اہلیہ نادرہ بیگم علیل ہوئیں، بعدازاں وہ خود بیمار پڑے، چونکہ ان دونوں کے علاوہ ساتھ میں کوئی اور نہیں رہتا تھا، اس لئے خورشید صاحب نے عروس البلاد بمبئی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے وطن رودولی یوپی چلے آئے اور اپنے گھر کو ایک بار پھر سے آباد کردیا جوان کے اور ان کے بھائی کے ترک وطن سے غیر آباد تھا۔ میں ان کے اس فیصلے سے مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے کہ ایک بڑا عرصہ حیات بمبئی میں گذارنے کی وجہ سے ان کا حلقہ احباب وہیں تھا۔ اب وہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں یعنی ممبئی میں کم ازکم یونیورسٹی چلے جاتے تھے اور طلبہ واساتذہ کے ساتھ وقت گذر جاتا تھا، مگر یہاں یعنی رودولی میں تو اب کوئی نہیں ہے۔ تمام احباب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں بلکہ ہم عمروں میں بھی کوئی نہیں بچا ہے۔ دن بھر گھر میں مقید رہنا ہوتا ہے۔

بہرحال اب وہ اوران کی اہلیہ نادرہ بیگم جو اسی قصبہ رودولی کے مشہور بزرگ شیخ احمد عبدالحق توشہ رودولوی کے خانوادہ کی چشم وچراغ ہیں رودولی میں مقیم ہیں۔ دونوں متعدد عوارض میں مبتلا اور لکھنو کے ڈاکٹروں کے زیرعلاج ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگی اپنی منزل کی طرف رواں ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی انہیں صحت کاملہ، عاجلہ اور مستمرہ عطا فرمائے اوران کا سایہ شفقت تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین۔

حصہ دوم

تقدیم،تقریظ،دیباچے

[۱]

کلیاتِ نشور واحدی

جن ادباء و شعراء اور اربابِ کمال نے اردو شعر و ادب کو آبرو بخشی ان میں ایک بہت اہم اور نمایاں نام مولانا نشورؔ واحدی مرحوم [۱۹۱۲ء-۱۹۸۳ء] کا بھی ہے۔ وہ ایک عبقری اور یگانہ عصر شاعر تھے۔ ان کا مذاق شعر و ادب فطری اور وہبی تھا۔ دورِ طفولیت ہی میں موزوں طبعی کے جوہر نمایاں ہونے لگے تھے۔ بیس بائیس سال کی عمر میں باقاعدہ طبع آزمائی کا آغاز ہوا۔ پھر دمِ واپسیں تک وہ صہبائے شعر و سخن سے مخمور و سرشار رہے۔

ان کی تعلیم مدارس میں ہوئی۔ وہ سند یافتہ عالم اور علوم مشرقیہ میں مہارت رکھتے تھے۔ مذہبی افکار و خیالات پر گہری نگاہ اور مشرقی فکر و فلسفے پر باریک نظر تھی۔ بالخصوص عربی و فارسی زبان وادب پر دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ قدیم ادبی ذخیرے سے واقفیت اور شعرِ عجم کی اداشناسی نے ان کی شاعری کو استحکام بخشا۔ ان کا جمالیاتی شعور بھی اسی مشرقی اندازِ نظر کا آئینہ دار ہے۔

نشورؔ صاحب نے پہلے مدارس میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا، پھر کالج میں حلیم مسلم کالج میں استاد ادب رہے۔ ان سے متعدد افراد و اشخاص نے استفادہ کیا اور اصلاح سخن لی، لیکن خود انھوں نے کسی سے اصلاح نہیں لی اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ خود ہی کہا اور خود ہی اصلاح کی۔ اس سے ان کی بالغ نظری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ان کی پہلی تخلیقی کاوش ''صہبائے ہند'' ۱۹۳۹ء میں منظرِ عام پر آئی، جو ایک مفکرانہ کوشش تھی۔ اس میں نشورؔ صاحب مفکر شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو جامِ رومی سے لبریز یہ مثنوی فکرِ اقبالؔ کی توسیع تھی۔

ہے کمال زندگی تکمیل کردار و صفات
بے صفاتِ کاملہ ناقص ہے خود روحِ حیات

بے صفات کاملہ یکساں ہے انساں اور خاک
بے صفاتِ کاملہ مہمل ہے عشقِ دردناک
ہے صفت کے ارتقا سے ملّتوں کا ارتقاء
ہے صفت ہی کے تنزل سے تنزل قوم کا

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:

جذب وحدت آتش عقل و نظر دانش گداز
عشق ظالم عقل خیز و عقل ریز و عقل ساز
جذب وحدت بے وساطت بے رسالت بے پیام
عشق ظالم پر توسل پر تعلق پر کلام
جذب وحدت بے نیاز رہنما منزل بدست
عشق ظالم راہ گیر و راہ جو، رہبر پرست
جب نگاہ جلوہ توحید حاصل ہوگئی
عبدیت بے واسطہ خالق سے واصل ہوگئی

''صہبائے ہند'' ان کی پہلی کاوش تھی۔ اس سے ان کی اٹھان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد متعدد منظوم و منثور تخلیقات نے ان کی شاعرانہ عظمت، انفرادیت اور بلند پایگی کا لافانی نقش قائم کیا۔ شورِ نشور [۱۹۴۲ء] آتش و نم [۱۹۴۶ء] فروغِ جام [۱۹۵۷ء] دانشِ آخر الزماں [۱۹۶۶ء] سوادِ منزل [۱۹۶۸ء] گل افشانیٔ گفتار [۱۹۷۷ء] تاریخ فلسفۂ خودی [۱۹۷۹ء] اشکِ چکاں سے سے عصرِ رواں تک [۲۰۰۰ء] وغیرہ، اقلیم شعر و ادب پر ان کی کشور کشائی کے ایسے نمونے ہیں جو انھیں بقائے دوام کی دولت عطا کرتے ہیں۔

ان کی نثری کاوشیں دانش آخر الزماں [۱۹۶۶ء] تاریخ فلسفۂ خودی [۱۹۷۹ء] ہندوستان میں فلسفۂ خودی کا ارتقاء [۱۹۹۲ء] اور رمزِ معانی [۲۰۰۸ء] نہ صرف ان کے گہرے ادبی، تاریخی اور فلسفیانہ شعور اور وسیع النظری کا نمونہ ہیں بلکہ اپنے موضوع پر معرکۃ الآرا تصانیف بھی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین جو انھوں نے شعر و ادب کے مختلف موضوعات اور شعری مجموعوں پر بطور تقدیم و

تبصرہ لکھے وہ قدیم مشرقی طرزِ تنقید کا نمونہ ہیں۔ راقم کا خیال ہے کہ مشرقی ادب پاروں اور تخلیقات کے تجزیئے کے لیے یہی قدیم اسلوب و انداز تنقید ضروری ہے۔ ورنہ لاطائل قیاسات اور دور از کار تصورات سے حقیقت تک رسائی ناممکن ہو جائے گی اور یہی ہمارے جدید تنقیدی ذخیرے کی بنیادی کمزوری بھی ہے کہ مغربی نقطۂ نظر کو اہمیت دی گئی۔ مشرقی انداز تنقید کو وسعت دینے کے بجائے اس سے اغماض برتا گیا اور مغرب کی خشک وادیوں سے بیدار موز تنقید سے شیفتگی کے اظہار نے متعدد مشرقی تخلیقات کا چہرہ مسخ کر دیا۔ بہر حال نشؔور صاحب قدیم مشرقی روایات کے دلدادہ و شیدا تھے۔ انھوں نے جو نثری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے وہ اپنی متنوع خصوصیات کی وجہ سے اس درجہ بلند ہے کہ اس کا ذکر اہتمام سے کیا جائے۔ خاص طور سے ان کا دلکش اسلوبِ نگارش اور شستہ و شگفتہ نثر ان کے رچے ہوئے تاریخی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں۔ علم الکلام اور فلسفیانہ افکار و خیالات پر علامہ شبلی کے بعد خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ ورنہ نشؔور واحدی کے مقام و مرتبہ کی تعیین اور ان کے افکار و نظریات کی تفہیم میں اہل علم کو دشواری نہیں پیش آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ نشؔور صاحب نثر کے میدان میں بھی بلند رتبہ شخص تھے۔ ان کی نثری کاوشوں کے پس منظر میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ نثر کی طرف مائل ہوتے اور فلسفہ خودی کی تاریخ کے بجائے ادبی و تنقیدی تحریریں ان کے قلم سے نکلتیں تو ان میں بھی انھیں وہی امتیازات حاصل ہوتے جو ان کی شاعری نے انھیں عطا کیے ہیں۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ قدرت نے انھیں شعر و شاعری کا مثالی نمونہ بنا کر پیدا کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نشؔور واحدی کی ''گل افشانی گفتار'' مثالی قرار پائی اور ان کے ''عزم محکم'' نے ''سوادِ منزل'' تک پہنچایا اور یہی وہ منزل ہے، جہاں نشور واحدی ''اشک چکاں'' کے بعد پہنچے اور ان کے ممتاز معاصرین نہ پہنچ سکے۔

واحدی صاحب کا عہد نظم نگاری کا عہد ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر نظم نگاری نے جو رخ متعین کیا وہ قابلِ تحسین ہو یا نہ ہو لیکن یہ تو ضرور ہوا کہ نظم کا سفر تیز گام، ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہوا۔ واحدی صاحب کی بعض نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ نظم جدید کی تیز گامی اور ہمہ جہتی سے بخوبی واقف تھے۔ تاہم شعوری طور پر انھوں نے اپنی راہ الگ نکالی تھی اور ان کی نظمیں وغزلیں دبستانِ شبلی کے آرگن ماہنامہ معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوتیں۔ دراصل وہ اسی دبستان کے

نقطۂ نظر کی ترجمان تھیں۔ خود واحدی صاحب اسی دبستان سے نظریاتی ہم آہنگی رکھتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اور اقبال احمد خاں سہیل ان کے بڑے مداح وقدرداں تھے۔ سید صاحب ان کی تخلیقات شورِ نشور کے عنوان سے ماہنامہ معارف میں نہایت اہتمام سے شائع کرتے تھے۔ غرض نشؔور صاحب نے نظم نگاری میں بھی انفرادیت قائم کی۔ بطور نمونہ ایک بند ملاحظہ ہو:

میں تکبیر لا الٰہ سے نظام ہستی کو توڑتا ہوں
میں اپنی محشر نوا اذانوں سے خواب ہستی کو توڑتا ہوں
میں تیغ رحمت کی لالہ کاری سے تنگ دستی کو توڑتا ہوں
میں زر پرستی، وطن پرستی، شکم پرستی کو توڑتا ہوں
مری رگوں میں تمام عالم کے باغیوں کا لہو رواں ہے

علامہ شبلی جدید نظم کے بانیوں میں ہیں۔ اقبال سہیل نے اپنی نظموں سے اس روایت کو نہ صرف استحکام بخشا بلکہ اسے بڑی ترقی دی۔ یہاں تک کہ وہ دبستان شبلی کے گل سرسبد قرار پائے۔ جگؔر اور اصغؔر نے ان سے فیض پایا تھا۔ جگؔر تو مرزا احسان احمد ہی کی دریافت تھے۔ اصغر کا پہلا مجموعہ کلام ''نشاط روح'' انہیں کے مقدمہ کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ یحییٰ اعظمی اور حبیب احمد صدیقی وغیرہ اس دبستان کے اہم نظم نگار تھے۔ یہ اور بعض دوسرے شعراء نے بھی ان کی ہم نوائی کی۔ نشؔور صاحب کی نظمیں دراصل اسی مکتبۂ فکر کی ترجمان ہیں اور اپنی انفرادیت کی وجہ سے اس دور کی نظم نگاری میں ممتاز مقام کی حامل ہیں۔

نظم نگاری میں یہ ان کی مہارت ہی کی مثال ہے کہ جہاں انھوں نے مناظرِ قدرت اور کائنات کی صناعیوں کو وقت کے دھاروں اور نظامِ فکر کو نظم کا قالب عطا کیا، وہیں ''پھولوں کی انجمن'' بھی سجائی۔ بچوں کے لیے انھوں نے جو نظمیں لکھیں ہیں اس میں ان کی نفسیات اور ذہنی کیفیتوں کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ ادب اطفال میں یہ نظمیں اپنا جواب آپ ہیں۔

نشؔور واحدی نے قطعات، رباعیات، سہرے اور دیگر اصناف میں بھی دادِ سخن دی ہے۔ لیکن اصلاً وہ غزلوں کے شاعر تھے۔ اس میں وہ اپنے عہد کے ممتاز ترین شاعر تھے۔ ان کا غزلوں کا سرمایہ فکری اور فنی دونوں لحاظ سے انفرادیت کا حامل ہے۔ عروضی لحاظ سے راقم بے بضاعت کو

کوئی سقم نہیں ملا۔ شاید ہی ان کا کوئی شعر بحر و وزن سے خارج ہو۔ یہ ان کی فنی چابک دستی اور کمال دسترس کا نتیجہ ہے۔ بڑے بڑے شعراء کے یہاں یہ عیوبِ سخن راہ پا گئے ہیں ۔ بہرحال نشؔور صاحب نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

فکری لحاظ سے بھی انھوں نے غزل کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ پامال موضوعات سے کسی کو مفر نہیں۔ نشؔور صاحب نے پامال موضوعات میں بھی اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔ دوسرے متعدد معاصر شعرا کی طرح ان کے موضوعات بھی متنوع ہیں۔ اسرارِ حیات و کائنات، زندگی کی بے ثباتی، حسن و عشق، محبت و شیفتگی، خودی و وارفتگی اور بے قراری، رازِ زندگی، تہذیب و تمدّن ان کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔ کہیں کہیں انھوں نے شاعری میں پیمبری بھی کی ہے۔ البتہ اس میں بھی انھوں نے اپنی راہ لگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ شبابیات و خمریات بھی ان کے موضوعِ شعر کا حصّہ بلکہ بنیادی حصّہ ہیں، لیکن وہ محض شاعرِ شبابیات و خمریات نہیں۔

وہ اپنے خیالات نئے اور دلکش اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ جسے خود انھوں نے

تخیل پاک بازانہ، مگر انداز رندانہ

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ وصف جاذبِ نظر اور ذوق و وجدان کی تشنگی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ انہیں زبان و بیان، الفاظ و محاورات اور استعارات و کنایات کے استعمال پر بھی بڑا درک حاصل تھا۔ تشبیہات میں جدّت و اختراع اور ندرتِ بیان بھی ان کی شعری خوبیاں ہیں۔

رُخ بدلتے ، راہ چلتے ، گل عذاروں کو نہ چھیڑ
اے چمن نا آشنا رنگین بہاروں کو نہ چھیڑ
ہم نہ برگ گل نہ شبنم نے خس و خار چمن
اے نسیم صبح جا ہم خاکساروں کو نہ چھیڑ

قامت دل ربا پر شباب آ گیا
یا سوا نیزے پر آفتاب آ گیا
آیئے آیئے اس طرف وہ نشؔور

شاعر یادگارِ شباب آ گیا

نشوؔر صاحب کا رنگ تغزل ان کے معاصرین سے انھیں ممیّز اور ممتاز کرتا ہے۔ متعدد نقادوں نے ان کے تغزل پر روشنی ڈالی ہے اور تقریباً سبھی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ نشوؔر صاحب کا تغزل دراصل ان کی شاعری کا خوبصورت باب ہے۔ ان کی غزلیں اگر چہ ان کے تغزل، شعریت، نغمگی، بانکپن اور حسنِ ادا کی وجہ سے روح شاعری ہو گئیں اور ذوق و وجدان پر چھا گئیں لیکن اصلاً ان کے اشعار بالخصوص غزلوں میں وہ گھن گرج، آہستہ روی، سبک خرامی، سکوتِ دریا اور پھر اس میں موج و طغیانی کی کیفیت اور قاری کے ذہن و دل کو مسحور کرنے کی جو فضا پنہاں ہے۔ گو وہ ان کے معاصرین میں بھی کسی قدر پائی جاتی ہیں، تاہم اس کا مکمل پرتو نشوؔر صاحب کی غزلیں ہیں۔

شبِ غم مری شبِ غم سرِ شام لوٹ آنا
نہ کہیں ترا ٹھکانہ نہ کہیں مرا ٹھکانہ

کوئی آج تک نہ سمجھا کہ شباب ہے تو کیا ہے
یہی عمر جاگنے کی ، یہی نیند کا زمانہ

دیا خاموش ہے لیکن کسی کا دل تو جلتا ہے
چلے آؤ جہاں تک روشنی معلوم ہوتی ہے
نشور آلودہ عصیاں سہی پھر کون باقی ہے
یہ باتیں راز کی ہیں قبلہ عالم بھی پیتے ہیں

اے رہبر منزل خرد ایسی بھی کیا ترقیاں
ہونٹ سے گر پڑے ہنسی، آنکھوں سے پیار چھوٹ جائے

ہم ان کو بلائیں کیوں، اچھا ہے خفا ہیں وہ

آئیں تو قیامت ہے جائیں تو قیامت ہے

ان کی غزلوں کے متعدد اشعار قدیم شعراء کے مقابلے میں فخریہ پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جس میں انھوں نے انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ نشؔور صاحب کے بعض اشعار فنی چابک دستی اور موضوعاتی تنوع کے لحاظ سے ان شعرا سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ان میں ذوق، مومؔن اور فراؔق و فیضؔ کا خاص طور سے نام لیا جا سکتا ہے۔ فراؔق جو ان کے ہم عصر ہیں، اسی لیے ان کے مداح تھے۔

وہ تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے اور یہی وہ شے ہے جس نے ان کی شاعری کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ ان کی مخمور نگاہیں اور ان کی غزلیں دونوں جامِ معرفت سے لبریز ہیں۔

دیا ساقی نے اوّل روز وہ پیمانہ مستی میں
کہ میں نا آشنا پی کر ہوا دیوانہ مستی میں
قدم رکھتا کہیں ہوں اور پڑتا ہے کہیں جا کر
نشؔور اس وقت ہوں کچھ ہوش سے بیگانہ مستی میں

تصوف کا ایک اور نمونہ یہ ہے:

نورِ قمر نے میرے لیے اِک رشکِ قمر کو روک لیا ہے
اوّل شب سے آخر شب تک جس نے نظر کو روک لیا ہے
تم نے بنائے لاکھوں شیشے عکس کسی میں بھی نہیں ٹھہرا
دل نے بنا کر آئینۂ غم ، آئینہ گر کو روک لیا ہے
اپنا نشؔور انداز جدا ہے، فکرِ حسیں سے آہِ رسا تک
ہم نے فضائے لالہ وگل میں برق وشرر کو روک لیا ہے

وہ اپنی وضع قطع، رہن سہن، طرزِ معاشرت، سادگی، شائستگی، زندگی اور زندہ دلی کے لحاظ سے بھی منفرد تھے۔ ان کی سادہ و دلکش زندگی، ان کی غزلوں میں بھی جلوہ گر ہے۔ یعنی ان کے کلام میں سادگی، صفائی، برجستگی کے جوہر نمایاں طور پر موجود ہیں۔ روز مرہ اور سہل ممتنع کی مثالیں بھی ان کی غزلوں کے نمایاں اوصاف ہیں:

بتاؤں کیا تجھے حاصل فریب زندگانی کا
جو پایا تھا وہ کھو آئے، جو جیتا تھا وہ ہار آئے

مرے آنسوؤں کی ادا کون سمجھے
گلوں کا تبسم نہ سمجھا زمانہ

کہاں فلک کے شرارے کہاں زمیں کے نجوم
وہ کچھ دنوں ابھی مشق تجلیات کرے

سحر کا لطف بھی جاتا ہے جلد لا ساقی
فضا تو دیکھ ستاروں کے جھلملانے کی

ہولیے ہم زندگی کے ساتھ
یہ نہیں پوچھا کہاں سے آئی ہے

ترقی پسندی کا بنیادی وصف جدید افکار وخیالات کی ترسیل قرار دیا گیا ہے۔نشورؔ صاحب بھی اس معنی میں جدّت پسند بھی تھے۔ان کی غزلوں میں بہتیرے اشعار عہدِ گل کی داستانِ خوں چکاں ہی پر مبنی نہیں، حالات حاضرہ اور وقت کی آہنی زنجیروں، نارسائیوں اور نامرادیوں کی داستان بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔لیکن اصلاً وہ محبت کے شاعر تھے۔ان کی محبت صرف شباب ہی سے نہیں، وقت کے دھاروں، چمکتے ہوئے ذرّوں اور تہ خاک تڑپتے ہوئے انسانوں سے بھی ہے۔حسن کی مست ادائیں، دلکش نظارے،عشق کی دلفریب ادائیں، زندگی کے لطف ولذت ہی کا نام نہیں بلکہ بے ثبات زندگی کے استعارے وکنائے بھی ہیں۔موجِ دریا اور طلاطم محض طوفان ہی کا پیش خیمہ نہیں ہوتیں بلکہ نامراد کو ساحل کا پتہ بھی دیتی ہیں ۔نشور صاحب اسی شعورِ بےشعوری کے شاعر تھے۔

سب کے لیے کشش مرے طرزِ سخن میں ہے
کیا جانے کیا ادا مرے دیوانہ پن میں ہے

پیراہن رنگیں سے شعلہ سا نکلتا ہے
معصوم ہے کیا جانے دامن کہیں جلتا ہے

حقیقت جس جگہ ہوتی ہے تابانی نہیں جاتی
کوئی پردے میں ہوتا ہے تو چلمن جگمگاتی ہے

واقعہ یہ ہے کہ نشورؔ صاحب اپنے عہد کے شعراء میں نہ صرف اپنے تغزل کی وجہ سے ممتاز ہیں بلکہ فکری وفنی لحاظ سے، شعور کی بالیدگی کے لحاظ سے اور مترنم پیش کش کے لحاظ سے بھی فائق و برتر ہیں۔ صحیح یہ ہے کہ نشورؔ صاحب کے کلام کو اب تک سمجھنے کی کوئی بھرپور کوشش نہیں کی گئی اور نہ ان کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔ اسے ہم ایک ادبی المیہ ہی قرار دے سکتے ہیں۔

خواجہ حافظ شیرازی سے پہلے ایران اور فارسی شعرا نے تصوف کے زیر اثر ان استعارات کو جو میخانوں اور مےخواروں کے لیے استعمال ہوتے تھے، انھیں تصوف کے مزاج میں ڈھال کر شعر و ادب کو میکدہ بنا دیا۔ مثلاً خانقاہ کے لیے میخانہ ومیکدہ، طالب ومطلوب کے لیے ساقی و میخوار، تعلیمات تصوف کو جام و مینا وصہبا وغیرہ سے تعبیر کیا۔ چنانچہ ان الفاظ کا رواج و استعمال کثرت سے ہوا۔ نشورؔ صاحب ادبیات فارسی پر گہری نظری رکھتے تھے۔ فارسی ادب کا یہ مزاج انھیں پسند آیا تو اسے انھوں نے اپنی اردو شاعری میں برتا۔ دیگر شعرائے اردو کے یہاں بھی اس کے نقوش ملتے ہیں، لیکن اسے اردو میں نشورؔ صاحب نے معراج کمال تک پہنچایا۔ ان کی غزلوں کے ایک ایک شعر میں اس کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔ شبابیات وخمریات نشورؔ دراصل اسی شعوری کوشش کا حصّہ ہیں۔ اسے ممکن ہے مبالغہ سمجھا جائے مگر حقیقت یہی ہے کہ نشورؔ صاحب اردو شاعری کے حافظ شیرازی تھے۔ ان کے تغزل کی رنگینی ودلکشی ان کے ممتاز معاصرین سے مختلف ہے۔ سوز و گداز، درد وتڑپ اور ہجر وفراق میں بھی وہ وہی طرز وادا جو فارسی شعراء میں متاخرین کا وصف

خاص تھا، استعمال کرتے ہیں۔ لیکن یہ فضا وہ بالقصد تیار نہیں کرتے بلکہ وہ ان کے دل و دماغ اور ذوق و وجدان میں رچی بسی تھی۔ ان کے اس کلیاتِ غزلیات میں ہر طرح کے جلوے موجود ہیں، جنھیں اوراق آئندہ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ نشؔور صاحب کی غزلوں کا یہ کلیات ان کے بلند رتبہ شاعرانہ کمالات اور عظمت شاعری کا ایک گنجینہ ہے۔

کلیات نشور کی ترتیب و تہذیب اور طباعت و اشاعت کے لیے ادبی دنیا کو جناب نیاز واحدی صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیے۔ وہ نشؔور صاحب کے لائق اور قابلِ فخر فرزند ہیں۔ انھوں نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایک شعر اور ایک ایک سطر زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے محفوظ کر دیا ہے۔ وہ خود کو غیر اردو داں خیال کرتے ہیں اور اکثر اعتراف کرتے ہیں، حالانکہ انھوں نے نشؔور صاحب کے حوالے سے جو خدمات انجام دی ہیں وہ انھیں ایک ادیب اور محقق کا درجہ عطا کرتی ہیں۔ خاص طور سے عرضِ ناشر کے تحت انھوں نے جو تقدیم لکھی ہے، اس سے راقم نشوریات پر ان کی گہری نظر اور جمع و ترتیب و تحقیق کی ان کی صلاحیت کا مداح اور دل سے معترف ہے۔ اس دور میں ایسے قابل رشک فرزند کم ادیبوں اور شاعروں کو نصیب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں صحت و تندرستی اور طویل عمر عطا فرمائے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شورِ نشؔور کو بانگ درا اور ضربِ کلیم بنا دے۔

[۲]

برمی بول چال

مولانا سید ابوظفر ندویؒ

اردو میں لسانیاتی تحقیق کے آغاز وارتقاء کے ذکر میں اہل قلم اور محققین نے اردو کی وسعت، ہمہ گیری، طرفگی، لسانی ہم آہنگی، اردو کے اثرات دیگر زبانوں پر اور دوسری زبانوں کے اردو پر اثرات کی نشاندہی میں بڑی محنت اور دل و دماغ صرف کئے۔ اس کے نتیجے میں لسانیاتی تحقیق وتنقید کا ایک بڑا ذخیرہ وجود میں آیا۔

''پنجاب میں اردو'' اور'' گجرات میں اردو'' جیسے موضوعات کے بعد محققین لسانیات نے لسانی رشتوں کی تلاش وتحقیق کی طرف توجہ دی اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ترکی، ازبک، تاجک، آذری، سندھی، پشتو اور بعض دوسری علاقائی زبانوں کی طرف نگاہ تحقیق ملتفت کی۔ البتہ پڑوسی ملک برما کی برمی زبان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور نہ اس کے مطالعے کی کوئی مثبت کوشش سامنے آئی، حالاں کہ ہندی زبان کی طرح برمی زبان کا بھی پالی سے بڑا گہرا رشتہ ہے اور وہ گویا اس کی روح کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو میں برمی زبان پر پہلی کتاب پروفیسر سید ابوظفر ندوی نے ''برمی بول چال'' کے نام سے ۱۹۲۴ء میں لکھی، جو غالباً اپنے موضوع پر نقش اول کا درجہ رکھتی ہے۔

پروفیسر سید ابوظفر ندوی علامہ شبلی کے شاگرد، ندوہ کے نامور فرزند اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بھتیجے تھے۔ مارچ ۱۸۸۹ء میں دیسنہ بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ندوہ لکھنو آئے اور تکمیل کی۔ وہ بڑے ذہین اور طباع شخص تھے۔ انہیں تاریخ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اس فن میں انہوں نے اس قدر مہارت پیدا کی کہ ان کا شمار ملک کے نامور ترین مورخین میں ہوتا تھا۔ خاص طور سے گجرات کی تاریخ کے وہ اتنے بڑے ماہر تھے کہ ان کا ثانی آج تک پیدا نہیں

ہوا۔ انہوں نے تاریخ گجرات، تاریخ اولیائے گجرات، مختصر تاریخ گجرات، گجرات کی تمدنی تاریخ، گجراتی بادشاہوں کے سکے، گجراتی زبان وادب جیسی اہم کتابیں اور مقالات لکھے۔ گجرات کے علاوہ ملک کے دیگر علاقوں کی بھی بعض تاریخیں لکھیں۔ مختصر تاریخ ہند، تاریخ بوہرہ، تاریخ سندھ، تاریخ خاندان غزنہ، سفرنامہ برہما جیسی اہم کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ اسی سلسلے کی ان کی ایک اہم کتاب ''برمی بول چال'' بھی ہے۔

سید ابوظفر ندوی کی زندگی کا بیشتر حصہ احمد آباد گجرات میں گذرا۔ وہ گاندھی جی کے قائم کردہ مہاودیالیہ احمد آباد میں عربی کے برسوں استاد رہے۔ چند سال دارالمصنّفین میں بھی رفیق کی حیثیت سے کام کیا۔ یہاں انہوں نے کئی اہم کتابیں اور مقالات لکھے۔ اپنے وطن دیسنہ بہار میں ۲۸ رمئی ۱۹۵۸ء کو انتقال کیا اور وطن ہی کی خاک کا پیوند ہوئے۔(۱)

سید ابوظفر ندوی کو سیر وسیاحت سے بڑی دلچسپی تھی۔ چنانچہ تحصیلِ علم کے بعد وہ ملتان گئے اور وہاں سے ۱۹۲۲ء میں رنگون برما کا سفر کیا۔ برما میں انہوں نے پھر سیام، ساترا، جاوا، نیوگنی، فلپائن، ہانگ کانگ، چین، تاتار اور کابل وغیرہ کے سفر کا پروگرام بنایا، لیکن اس وقت کے سیاسی حالات اور اقتصادی کی مشکلات کی وجہ سے سیاحت کا ان کا یہ طویل منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔(۲)

اپنے سفرنامہ برما میں انہوں نے اس سفر کے چشم دید حالات وواقعات کے ساتھ برما کی اخلاقی، معاشرتی، تجارتی، تعلیمی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا احوال تفصیل سے قلم بند کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برما میں انہیں برمی زبان سے بڑی دلچسپی پیدا ہوئی اور اسے انہوں نے نہ صرف محنت ودلچسپی سے سیکھا بلکہ اس کا بڑی گہرائی وگیرائی سے مطالعہ کیا۔ اس کے آغاز وارتقاء کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ

> ''برمی زبان دراصل ان زبانوں میں سے ہے جو آرین زبان سے نکلی ہیں۔ یہ بات ابھی تک پردۂ خفا میں ہے کہ برمی زبان قدیم قوم کی اصل زبان کیا تھی۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ بہت پہلے ہندی اقوام کے اختلاط سے برما زبان پیدا ہوئی اور قوم میں بدھ مذہب پھیلنے سے پالی زبان کا اس پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ملکی حکومت کے ایام میں برمی زبان کی حالت ٹھیک ہندی بھاشا کی تھی۔ یہ صرف عام بول

چال میں مستعمل تھی، ورنہ تمام مذہبی کتب اور اعلا پایہ کی تصنیفات تمام پالی میں ہیں۔خود پالی زبان صوبہ بہار کی پراکرت زبانوں میں شامل تھی اور بدھ مذہب کی توسیع کے ساتھ ان کی مذہبی وعلمی زبان بن گئی اور ہند میں اس مذہب کے زوال پر لنکا اس کا مرکز بن گیا۔''(۳)

سید ابوظفر ندوی نے پالی کے اثرات اور برمی زبان کی ترقی اور اس کے ارتقاء کے ذکر کے ساتھ برمی زبان کے کما حقہ ترقی نہ کرنے کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''پالی زبان نے اگر چہ برما زبان پر بڑا اثر کیا اور تحریری زبان بنانے میں بڑی مدد کی تاہم اس کے اصل عروج کا زمانہ 'الوپھیا' نے اپنی وصیت کے ذریعے تمام برما میں جبری تعلیم کی بنیاد رکھی۔یہی وہ زمانہ ہے جب سے زبان برما کا عملی دور شروع ہوا مگر خواص کی توجہ آخری برمی راجوں کے وقت سے شروع ہوئی۔یہ وہ وقت تھا کہ برمی سلطنت کے شجر بارآور کو زوال کا گھن لگ چکا تھا، اسی سبب سے برمی زبان میں نے وسعت پیدا ہوئی اور نہ اس کی تشنگی مانڈلے کی محدود چار دیواری سے باہر جاسکی۔اسی کا اثر ہے کہ مانڈلے کے لوگ ابھی تک غیر مانڈلہ کو ''تودو'' یعنی جنگلی کہتے ہیں اور اسی باعث سے ابھی تک تعلیم یافتہ برمی بھی اکثر غیر فصیح برمی میں گفتگو کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔حالاں کہ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کو فصیح اور شگفتہ برمی میں گفتگو کرنی چاہیے۔''(۴)

اس کے بعد ندوی صاحب نے برمی کے حروف ابجد کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ برمی زبان کے حروف ابجد ۳۳ ہیں۔جس میں سات پالی حروف بھی شامل ہیں۔گویا پالی اگر چہ دنیا سے ناپید ہوگئی، مگر اس کے حروف برمی زبان میں محفوظ ہیں۔

حروف ابجد کے بعد برمی صرف ونحو کا ذکر ہے۔ندوی صاحب نے لکھا ہے کہ چوں کہ برمی زبان مکمل نہیں اس لیے اس کی صرف ونحو بھی ناقص ہے۔پھر ضمائر اور اشارات، افعال واسماء اور تذکیر وتانیث کا لسانی جزئیات کے ساتھ ذکر ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برمی زبان کے ایک ایک خدوخال سے سید ابوظفر ندوی واقف تھے۔اس مبسوط اور جامع مقدمے کے بعد علامات و

اشارات کی نشاندہی کی گئی ہے اور مختلف فصول میں مفرد الفاظ، مرکب الفاظ، افعال، ماضی، حال، مستقبل اور مفرد و جمع کے اصول و قواعد بیان کیے گئے ہیں اور ان کے نمونے بھی دیے گئے ہیں جو اردو اور برمی دونوں زبانوں میں ہیں۔ نیز اصل برمی رسم الخط بھی درج کیا گیا ہے۔ ان فصول میں برمی زبان کے قواعد، خصوصیات، دیگر زبانوں سے تفریق و مماثلت، وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوں کہ اس کتاب کا بنیادی مقصد تصنیف برمی زبان کی تدریس اور برما میں مقیم ہندوستانیوں کو برمی سیکھنے میں سہولت پہنچانا ہے، اس لیے ملاقات، مکان اور اس کے متعلقات، اعداد و شمار، پیسہ، آنہ، روپیہ، اوزان، مدارس اور اس کے متعلقات، لباس، رنگ، مطبخ اور طعام کے سامان، سیر و تفریح، آسمان، زمین، موسم، سمت، اوقات، اعضائے انسانی، رشتہ دار، حیوانات، چرند پرند، ملازمت وغیرہ اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات اور ضروریات کے متعلق برمی زبان کے استعمال کی مثالیں دی گئی ہیں۔ اس میں الفاظ، معنی و مفہوم اور تلفظ اصل برمی زبان کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ یقیناً اس سے برمی زبان سیکھنے اور بولنے میں آسانی ہوگی۔

یہ کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ اس میں محض برمی زبان میں بول چال کی مشق کرائی گئی ہے۔ اس کا مقصدِ تصنیف بیان کرتے ہوئے سید ابوظفر ندوی صاحب لکھتے ہیں:

> ''برما کے متعلق جو کچھ اس کتاب میں درج ہے، صرف وہ حصہ ہے جس کا تعلق بولنے سے ہے۔ لکھنے کے متعلق ایک الگ رسالہ لکھا ہے جو اس کا دوسرا حصہ سمجھنا چاہیے۔ اس کتاب میں برمی زبان کو بھی قائم رکھا ہے، جس سے میرے دو منشاء ہیں۔ اول یہ کہ اس سے برمی مسلم حضرات زیرآبادی بھی اردو کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور برما کے ذریعے اردو کے جملات اور فقرات کا استعمال صحیح طور پر کر سکتے ہیں۔ دوم یہ کہ جو ہندی ہیں ان کو برما حروف کی اگر شناخت ہے تو اردو میں اس کا صحیح تلفظ برما سے مطابق کر کے معلوم کر سکتے ہیں۔ نیز عوام ہندوستانی میں غلط تلفظ کے ساتھ یا خود زیرآبادیوں میں غلط الفاظ مستعمل ہو گئے ہیں، ان کی تصحیح بآسانی ہوسکتی ہے۔''(۵)

سید ابوظفر صاحب نے جس دوسرے رسالے کا ذکر کیا ہے، غالباً وہ شائع نہ ہوسکا۔ اس

لئے کہ ہر ممکن تلاش و تحقیق کے بعد بھی اس کا کچھ سراغ نہیں لگا۔ اگر کسی کو شخص کو اس کا کچھ سراغ لگے تو اس کی تفصیل سے راقم کو مطلع فرمائیں گے۔

ہندوستان سے برما کا بڑا گہرا تعلق رہا ہے بلکہ وہ اس کے زیر نگیں بھی رہ چکا ہے۔ وہاں کئی لاکھ مسلمان آباد ہیں۔ ان میں ہندی مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد آباد ہے۔ مگر فاضل مصنف نے برمی زبان پر ان کے اثرات کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ اسی طرح اردو اور برمی کے لسانی روابط پر بھی پوری کتاب میں ایک حرف نہیں ہے۔ دوسرے حصے میں کچھ ذکر ہو تو ہو، مگر یہ حصہ اس بحث سے خالی ہے۔

دنیا میں مسلمانوں کے قدم جہاں پہنچے وہاں کے تمدن و معاشرت پر ان کے اثرات ضرور مرتب ہوئے۔ یقیناً برما میں بھی ہوئے ہوں گے، مگر اس کتاب میں اس طرح کے کسی اثر کی نشاندہی نہیں ملتی۔ البتہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ۱۹۲۱ء میں پروفیسر سید ابوظفر ندوی نے اپنا ''سفر نامہ برہما'' شائع کیا تھا، اس میں برمی زبان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس میں مذکورہ دونوں باتوں کی تفصیل سپرد قلم کی ہے۔ اس وجہ سے یا غالباً قواعد کی کتاب ہونے کی وجہ سے ''برمی بول چال'' میں انہوں نے اردو برمی روابط اور لسانی رشتوں کو نظر انداز کیا ہے۔ حالاں کہ اس کی تفصیل سفر نامہ میں موجود ہیں۔ برما میں بولی جانے والی زبانوں کے ضمن میں اردو کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''برما میں ایک اور زبان بھی ہے جو عمر کے لحاظ سے بہت چھوٹی مگر اثر کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ یہ اردو زبان ہے جو نہایت سرعت کے ساتھ ملک میں پھیل رہی ہے اور قدرتی اسباب کچھ ایسے جمع ہو گئے ہیں جو اس کے لیے بڑے مدد و معاون بن گئے ہیں۔ برمی، چینی، جاپانی، یورشین، یورپین، غرض ملکی و غیر ملکی قومیں بوقت ضرورت اسی زبان کو استعمال کرتی ہیں۔ گو اس اردو زبان کو جو ملک برما میں رائج ہے بلیغ اور گلابی اردو سے کچھ تعلق نہیں، تاہم ہندوستان کے گورہ شاہی اردو کی طرح رنگونی اردو منجمد نہیں ہے۔ اردو آہستہ آہستہ مگر استقلال کے ساتھ جس طرح ملک میں پھیل رہی اسی طرح خود برمی زبان میں بھی وسعت

پیدا ہو رہی ہے۔''(۶)

برما میں اردو کی رفتار اور انداز ترقی سے پروفیسر سید ابوظفر ندوی کو یہ توقع پیدا ہوئی کہ برمی اردو ایک دن اس قدر ترقی کرے گی کہ یہاں فصیح اللسان شاعر پیدا ہوں گے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مختلف قسم کے الفاظ اس میں داخل ہو گئے ہیں، جیسے بن سال (کارخانہ) تالی (سینکڑہ) وغیرہ۔ اگر چہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ وہ الفاظ کانوں کو ابھی نہ صرف غیر مانوس بلکہ بعض دفعہ کریہہ معلوم ہوتے ہیں۔ لفظ کچڑا (میلا اور خراب کے معنی میں ہے) لیکن یقیناً زندہ دلان پنجاب کی طرح مسلمانان برما کو جب اس کا احسا ہوگا کہ اردو کو مادری زبان بنانے ہی پر مسلمانان برما کا انحصار ہے تو ان بن گڑھے ٹھوس پتھروں کی تراش خراش میں خود مصروف ہو جائیں گے اور خدا نے چاہا تو ایک زمانہ آئے گا کہ پنجاب کی یہاں کے اصل باشندوں میں بھی فصیح اللسان شاعر پیدا ہوں گے۔''(۷)

مولانا سید ابوظفر ندوی نے سفرنامہ میں برمی زبان پر اردو کے اثرات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو زبان نے نہ صرف یہ کیا کہ غیر ملک میں اپنے آپ کو روشناس کرایا بلکہ مہمان کی حد سے نکل کر میزبانی کی دعویدار ہوگئی۔ اس نے ثابت کر دیا کہ لنگوئج آف فرنگا (عام زبان) بننے کی طاقت صرف یہی رکھتی ہے۔ اس نے جب اپنا قدم جما لیا تو مکمل زبان برما پر بھی اثر ڈالنا شروع کیا اور آج برما زبان اپنے بہت ضروری الفاظ کے لیے اردو زبان کی ممنون ہے۔ میں نے اس قسم کے بہت سے الفاظ نوٹ کیے ہیں۔ طوالت کے لحاظ سے ان کو قلم انداز کر کے صرف چند الفاظ پر اکتفا کرتا ہوں۔ مثلاً نمونہ، نامے (نام)، شال، آلو قینچی، لیموری (لیمو)، شربت، قلی، پیسہ، باجا، طبلہ وغیرہ۔ مذہبی الفاظ بھی بکثرت موجود ہیں، مگر ان کا زیادہ تر استعمال صرف برمی مسلم کرتے ہیں۔''(۸)

آزادی سے پہلے وہاں کے مسلمان بڑے سرگرم تھے اور تحریک خلافت اور ترک موالات

وغیرہ میں انہوں نے بڑا حصہ لیا، مگر چوں کہ اب وہ ہندوستان میں نہیں رہا، اس لیے اس کے حالات سے بھی بہت کم آگاہی ہے۔ معلوم نہیں رنگونی اردو کا کیا بنا۔ سید ابوظفر صاحب نے برمی اردو سے جو توقعات وابستہ کی تھیں معلوم نہیں وہ پوری ہوئیں کہ نہیں۔

تکمیل بحث کے پیش نظر ''سفرنامہ برہما'' سے مذکورہ مباحث نقل کیے گئے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سید ابوظفر ندوی کی تصنیف ''برمی بول چال'' اردو میں پہلی ایسی کتاب ہے، جس میں برمی زبان کے اصول وقواعد قلم بند کیے گئے ہیں۔ غالباً ان کے بعد آج تک پھر اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔ اس لحاظ سے یقیناً یہ کتاب اردو میں سید ابوظفر ندوی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔

حوالے

(۱) عظمت کے نشاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ۔ ۲۰۰۵ء
(۲) سید ابوظفر ندوی: سفرنامہ برہما ص۳، دہلی ۱۹۲۱ء
(۳) مقدمہ برمی بول چال، دہلی ۱۹۲۴ء
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً
(۶) سفرنامہ برہماء ص۱۵
(۷) ایضاً ص۱۵-۱۶
(۸) ایضاً ص۱۶

[۳]

متاعِ رفتگاں

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے سابق ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ مایہ ناز اہل قلم، ممتاز مصنف اور نامور ادیب و انشا پرداز تھے۔ ان کے قلم سے مختلف موضوعات پر سیکڑوں مضامین و مقالات اور تقریباً دو درجن بلند پایہ کتابیں نکلیں، جس میں تاریخ اسلام (چار جلدیں) تابعین، اور دین رحمت خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے دارالمصنّفین کے سلسلہ سیر الصحابہ کی تدوین میں بھی حصہ لیا اور اس کی دو جلدیں سپرد قلم کیں۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ندوۃ العلماء کے ممتاز فرزند تھے۔۱۹۲۴ء میں وہاں سے فراغت کے بعد دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ آئے اور پھر پوری زندگی اسی ادارہ کی رفاقت اور خدمت میں گذاری۔ معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی کی ہجرت پاکستان کے بعد ان کے جانشین اور دارالمصنّفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر مقرر ہوئے اور یہ ذمہ داریاں انہوں نے آخری سانس تک بڑی خوش اسلوبی سے نبھائیں۔ یہ ان کی علمی زندگی کا بڑا اہم، تابناک اور روشن پہلو ہے۔

ماہنامہ معارف کو انہوں نے آخر دم تک اسی روش پر قائم رکھا، جس پر ان کے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے جاری کیا تھا۔ اس کی تمام روایات کو انہوں نے برتا اور نبھایا۔ اسی انداز سے شذرات و مقالات شائع کئے۔ اسی انداز سے وفیات اور مطبوعات جدیدہ کے سلسلے کو بھی قائم رکھا اور معارف کو اس کے بلند معیار سے گرنے نہیں دیا۔ وفیات و شذرات لکھنے کا آغاز انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی ہی میں کر دیا تھا، جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار کیا اور ان کو لکھا کہ ''تم نے س [سید سلیمان ندوی] اور میم [معین الدین احمد ندوی] میں فرق نہیں آنے دیا۔''

شاہ معین الدین احمد ندوی پختہ مشق ادیب ونقاد تھے۔ ان کے قلم سے متعدد ادبی وتنقیدی مضامین نکلے۔ جن کا مجموعہ ''ادبی نقوش'' کے نام سے ادارہ فروغ اردو لکھنو سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔

انہوں نے ماہنامہ معارف میں وفیات کے تحت سیکڑوں افراد کی وفات پر ماتم کیا۔ اس کا آغاز ۱۹۴۴ء میں ہوا اور یہ سلسلہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل اگست ۱۹۷۴ء تک جاری رہا۔ انہوں نے ہر طبقہ، ہر مسلک اور ہر مکتب فکر کے افراد کی وفات پر وفیاتی مضامین لکھے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی، انگریز بھی ہیں اور یہودی بھی، عربی بھی ہیں اور عجمی بھی، عالم وفاضل بھی ہیں اور عامی بھی، پیر و مرشد بھی ہیں اور صوفی وزاہد بھی، وزیر بھی ہیں اور وزیر اعظم بھی، ادیب وانشا پرداز بھی ہیں اور شاعر ومزاح نگار بھی، مرد بھی ہیں اور خواتین بھی، شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی، غرض ہر طبقہ اور ہر فکر وخیال کے اہل علم اور اصحاب کمال کی وفات پر شاہ صاحب نے بڑا دلدوز ماتم کیا ہے اور اس انداز سے کیا ہے کہ ان کی سوانح زندگی کے ساتھ ان کی بنیادی خصوصیات اور خدمات بھی اجاگر ہو گئی ہیں۔ زیر نظر کتاب انہیں وفیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔

یہ کتاب صرف وفیاتی خاکوں کا مرقع ہی نہیں بلکہ اس میں ۱۹۴۴ء سے ۱۹۷۴ء تک کے ہندوستان کی تاریخ کے اہم حالات وواقعات کا بھی ایک مرقع آ گیا ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے بھی بعض اہم اور تاریخی گوشے اجاگر ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر ان کے عہد کے ہندوستان کا ایک علمی، ادبی اور سیاسی منظر نامہ سامنے آ جاتا ہے۔

شاہ صاحب مرحوم نے جہاں اہل علم اور ارباب کمال کا ذکر کیا ہے، وہیں خاص طور پر نیشنلسٹ مسلمانوں اور ہندوؤں کی بھی وفیات لکھی ہے۔ ان میں بعض ایسے اشخاص کا ذکر خیر بھی ہے جنہوں نے فرقہ پرستی کے خلاف آواز بلند کی اور ان کا بھی ذکر ہے، جنہوں نے ہندو ہوتے ہوئے اردو زبان وادب کی بے انتہا خدمت کی اور اسے بنانے سنوارنے میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں۔ شاہ صاحب نے ان کے بارے میں سچ لکھا ہے کہ اب ہندوستان میں ایسے اشخاص کے پیدا ہونے کی بظاہر امید نہیں۔

اس کتاب کی جمع وتدوین کے کام کا آغاز دس برس پہلے ہوا تھا۔ اس وقت ماہنامہ

معارف کے اشاریے بھی شائع نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ایک ایک شمارہ سے ایک ایک مضمون جمع کر کے یہ کتاب تیار کی گئی تھی، مگر بوجوہ اس کی اشاعت کی اب نوبت آئی ہے۔ اس کے لئے راقم دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کا بےحد ممنون ہے، جنہوں نے اس کی اشاعت پر نہ صرف زور دیا بلکہ اسے مفید بنانے کے لئے متعدد مشورے بھی دئے۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔

اس کتاب کے مضامین اسی ترتیب سے ہیں جس ترتیب سے یہ لکھے گئے تھے۔ البتہ آخر میں اشاریہ شامل کر کے یہ کوشش کی گئی ہے کہ اشاریہ کی مدد سے الف بائی ترتیب بھی قائم ہو جائے اور استفادہ بھی آسان ہو جائے۔

ماہنامہ معارف کی اشاعت کے ۹۸؍سال ہو چکے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں اولاً مولانا سید سلیمان ندوی نے وفیات لکھی، جس کا مجموعہ ''یادرفتگاں'' شائع ہو چکا ہے۔ اس کے بعد مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس سلسلہ کو آگے بڑھایا، پھر وفیات لکھنے کی ذمہ داری جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم نے اٹھائی۔ ان کے وفیاتی مضامین بھی بزم رفتگاں کے نام سے دو حصوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ شاہ صاحب کی وفیات کی اشاعت سے گویا درمیان کی ٹوٹی ہوئی کڑی مربوط ہو جائے گی اور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۸۷ء کے درمیان وفات پانے والے اہل علم اصحاب فضل و کمال کا مرقع تسلسل کے ساتھ دارالمصنّفین کے سلسلہ اشاعت میں شامل ہو جائے گا۔ بعد کے ادوار میں یہ سلسلہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے دم سے قائم تھا۔ انہوں نے اس سلسلہ کو ۲۰۰۷ء تک جاری رکھا۔ ان کی اشاعت سے گذشتہ ۹۲؍برس کی مدت میں وفات پانے والی ہندوستان کی ممتاز شخصیات اور ان کے عہد کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا ایک جامع مرقع سامنے آ جائے گا۔ یہ دارالمصنّفین کے اہل قلم کا ایک مثالی کارنامہ ہے اور کسی رسالہ کے حوالہ سے تو یہ ایک بےمثال اور بےنظیر کارنامہ ہے۔

توقع ہے کہ ہندوستان کی تہذیبی اور تمدنی تاریخ لکھنے میں وفیات کے ان اوراق سے یقینی طور پر مدد ملے گی۔

---

[۴]

کاروانِ رفتگاں

مولانا مجیب اللہ ندویؒ

حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات مجموعہ اوصاف وکمالات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے فقیہ، دانشور، ادیب، مصنف، محقق، مفکر، خطیب، مصلح اور قائد کی حیثیت سے جو بے بہا خدمات انجام دیں انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

وہ ندوۃ العلماء کے نامور فرزند اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خصوصی فیض یافتہ تھے۔ان میں فکر شبلی وسلیمان کی ہر ادا موجزن تھی۔ان کا خیال تھا کہ اردو میں علم وتحقیق کی جو بہار آئی ہوئی ہے وہ پودا انہیں کی لگائی ہوئی ہے۔خاص طور سے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑے گرویدہ اور والہ وشیدا تھے۔علمی وتحقیقی کاموں میں انہیں کا طرز عمل اور طریقہ کی اقتدا ان کے فکر وعمل کا بنیادی محور رہا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک بڑا کارنامہ وفیات نگاری ہے۔علامہ شبلی کی وفات سے لے کر آخر وقت تک وہ مشاہیر اہل علم، معاصرین، احباب، اعزہ، قومی وسیاسی رہنماؤں، ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کی موت پر وفیات کی شکل میں ماتم کرتے رہے جو یادِ رفتگاں کے نام سے پہلے کراچی اور پھر دارالمصنّفین اعظم گڑھ سے شائع ہوئے۔

وفیات نگاری کا فن خاص مسلمانوں کی ایجاد واختراع ہے۔عربی میں اس موضوع پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔اردو میں اس کے آغاز کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔انہوں نے ماہنامہ الندوہ لکھنو میں اپنے استاذ مولانا فاروق چریاکوٹی اور نواب محسن الملک وغیرہ پر وفیاتی نوٹ لکھ کر اس کی داغ بیل ڈالی۔مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جولائی ۱۹۱۶ء میں ماہنامہ معارف جاری کیا تو

اپنے استاذ کے اس سلسلے کو بھی وسعت بخشی۔ بلاشبہ اردو میں یہ ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ ندوہ سے فراغت کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ کی خواہش پر دارالمصنّفین اعظم گڑھ آئے اور انہیں کی زیر نگرانی تصنیف و تالیف کا آغاز کیا۔ ''اہل کتاب صحابہ و تابعین'' اور ''تبع تابعین'' جیسی معرکۃ الآراء کتابیں دارالمصنّفین ہی میں ان کے نوک قلم سے نکلیں اور شائع ہوئیں۔ ماہنامہ معارف میں وہ مسلسل مضامین اور عرصہ تک مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ لکھتے رہے۔ ۱۹۴۵ء میں ان کے استاذ مولانا شبلی فقیہؒ [جیراج پوری] نے وفات پائی تو انہوں نے پہلا وفیاتی مضمون ماہنامہ معارف [دسمبر ۱۹۴۵ء] میں لکھا اور اسی سے ان کی وفیات نگاری کا آغاز ہوا۔

جامعۃ الرشاد کے قیام و استحکام کے بعد فروری ۱۹۸۱ء میں انہوں نے ماہنامہ الرشاد بڑی آب و تاب سے جاری کیا۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک مختلف رسالہ تھا۔ بلند علمی و ادبی خاص طور سے فقہی تحقیقات کی وجہ سے یہ بہت جلد علمی حلقوں میں درجہ استناد پر پہنچ گیا۔ بے شبہ حضرۃ الاستاذ نے اس کے ذریعہ ملک و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ علمی و دینی رہنمائی کے ساتھ خاص طور سے مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں بھی الرشاد کا بڑا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رشحات کا بڑی بے صبری سے انتظار ہوتا۔

ابتدا میں حضرۃ الاستاذ پورا پورا رسالہ خود ہی تیار کرتے۔ مضامین بھی لکھتے اور رشحات بھی۔ اخبار علمیہ بھی لکھتے اور تعارف و تبصرہ کتب اور وفیات بھی۔ پھر لوگ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا اور الرشاد آسمان صحافت پر نیر تاباں بن کر چمکا۔

الرشاد میں رشحات کے بعد وہ خاص طور پر وفیات لکھنے کا اہتمام کرتے۔ وہ کوئی کام رسمی اور سرسری کرنی کے عادی نہ تھے بلکہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اسے اپنے اوپر طاری کر لیتے اور ڈوب کر لکھتے۔ خود فرماتے تھے کہ جس موضوع پر لکھنا چاہتا ہوں اسے اپنے اوپر ''طاری'' کر لیتا ہوں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے وفیاتی مضامین میں سوز و گداز، رنج و غم، درد و الم، یاس و حسرت اور وفور جذبات کا ایک دریا موجزن ہے۔ جس میں نہ صرف مرنے والوں کی پوری شخصیت اور خدمات نمایاں ہوتی ہیں بلکہ ملی و معاشرتی زندگی میں اس کی وفات سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کی

نشاندہی بھی ہے۔حضرۃ الاستاذ کے یہ مضامین مختصر بھی ہیں اور طویل بھی ،لیکن پڑھنے والوں کوکسی قسم کا اضطراب نہیں بلکہ تشفی کا احساس ہوگا۔

حضرت مرحوم کےقلم سے ماتم گساری کی دولت جن لوگوں کے نصیب میں آئی ان میں عالم بھی ہیں، دانشور بھی۔خطیب بھی ہیں امام بھی۔فقیہ بھی ہیں شاعر بھی۔سیاسی رہنما بھی ہیں اور گوشہ نشیں بھی۔استاذ بھی ہیں اور شاگرد بھی۔معاصر بھی ہیں اور محبوب بھی۔غیر بھی ہیں اور عزیز بھی۔عربی بھی ہیں اور عجمی بھی۔لیکن اخلاص ومحبت کا ابر ہر طرف یکساں برسا ہے۔

یہ مضامین محض فضل وکمال اور اخلاق وشرافت کا مرثیہ نہیں بلکہ گذشتہ ڈیڑھ سو برس کی مسلمانوں کی ایک اجمالی تاریخ بھی ہیں۔اس میں ندوۃ العلما، دارالعلوم دیو بند،علی گڑھ، جامعہ ملیہ، دارالمصنفین ،ندوۃ المصنفین ، دینی تعلیمی کونسل ، جماعت اسلامی ،تبلیغی جماعت ،ملی کونسل غرض ماضی قریب کی مسلمانوں کی متعدد اہم علمی وتعلیمی اورقومی وملی کوششوں اور کاوشوں کا بھی ضمناً ذکر آ گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں خود حضرۃ الاستاذ کی تابناک زندگی اور ان کے افکار و خیالات کے نقوش ثبت ہیں۔

حضرت مرحوم مختلف اسلامی تنظیموں اور جماعتوں سے مختلف ادوار میں وابستہ رہے۔ خاص طور سے دینی تعلیمی کونسل کے ذریعہ انہوں نے خطہ پورب میں تعلیمی بیداری کا جوعظیم الشان کارنامہ انجام دیا اس کی کسی قدر تفصیل بھی ان مضامین میں ملے گی۔تصوف وسلوک اور تزکیہ نفس کے لئے وہ اس راہ کے سالکوں کے دربار سے بھی وابستہ رہے۔ چنانچہ مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ ،مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندویؒ اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تذکروں میں سلوک ومعرفت اور اہل دل کی باتیں بھی آ گئی ہیں۔غرض یہ مضامین ہماری تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا ایک اہم مرقع ہیں۔

کاروان رفتگاں دراصل انہیں وفیاتی مضامین کا مجموعہ ہے۔اسے مرتب کر کے شائع کرتے ہوئے دل اس احساس مسرت سے لبریز ہے کہ بالآخر استاذ مرحوم کی ایک خواہش کی تکمیل کی سعادت ملی، جسے وہ اپنی زندگی ہی میں میرے ذمہ کر گئے تھے۔

اس اسلوب وانداز کی اردو میں متعدد کتابیں مرتب کی گئی ہیں۔ان میں مولانا سید

سلیمان ندوی کی یادِرفتگاں کے علاوہ مولانا ماہرالقادری کی یادِ رفتگاں [دوجلدیں] جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کی بزمِ رفتگاں [دوجلدیں] مولانا تقی عثمانی کی نقوشِ رفتگاں، مولانا علی میاں ندویؒ کی پرانے چراغ [۳ جلدیں] محمد ایوب واقف کی ذکرِرفتگاں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ان کے علاوہ مولوی عبدالحق کی ''چند ہم عصر'' سے لے کرآل احمد سرور کے ''نئے پرانے چراغ'' تک اس موضوع پر اردو میں بڑا قابل قدر ذخیرہ ہے۔تاہم حضرۃ الاستاذ کے اس مجموعے ''کاروانِ رفتگاں'' کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں دبستانِ شبلی کا اسلوب و انداز اختیار کیا گیا ہے اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے۔یقیناً یہ آئندہ مورخ کے لئے تاریخ کے بنیادی اور مستند ماخذ کا کام دے گی۔

مولانا مرحوم کی وفات [۱۲رمئی ۲۰۰۶ء] کے بعد ان کے شاگرد خاص گرامی قدر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ نے استاذ مرحوم کی یادوں کے چراغ روشن رکھنے کے لئے ایک طباعتی منصوبہ بنایا ہے، جس کے تحت ذکرمجیب، مقالات مجیب، سیاحت مجیب، رشحات مجیب، تبصرہ مجیب، نقوش زندگی اور بعض ادھورے علمی کاموں مثلاً خواجہ میر درد وغیرہ کی اشاعت پیش نظر ہے۔ زیرنظر کتاب کی اشاعت دراصل اسی منصوبے کا آغاز ہے۔اللہ تعالی اسے قبولیت بخشے اور دوسرے کاموں کی توفیق عطا فرمائے۔

''کاروانِ رفتگاں'' کی اشاعت کا خیال گرامی قدر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی صاحب کو استاذ مرحوم کی زندگی ہی میں آیا تھا۔انہوں نے اس کی طرف توجہ بھی دلائی۔راقم نے بھی اس کی تائید کی تھی، مگر مولانا مرحوم ہر بار ٹال جاتے۔البتہ آخر میں وہ راضی ہوگئے تھے اور نظرثانی کا وعدہ بھی کرلیا تھا۔چنانچہ راقم نے تمام وفیاتی مضامین کا عکس ان کی خدمت میں مرتب کر کے پیش کیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور نظرثانی کا کام بھی شروع کردیا، مگر پھر جلد ہی وہ دوسرے کاموں میں اس طرح مصروف ہوئے کہ پھر اس کی طرف توجہ نہ کرسکے۔ان کی وفات کی بعد وہ مسودہ بھی نہ مل سکا، جس پر انہوں نے نظرثانی کی تھی۔

اب بھی یہ کتاب ترتیب و اشاعت کی منزل سے نہ گذرتی اگر میرے کرم فرما گرامی قدر ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی اس کی اشاعت کے لئے بار بار متوجہ نہ کرتے۔انہیں حضرۃ الاستاذ سے

بے پناہ قرب و تعلق اور والہانہ لگاؤ ہے۔ مولانا مرحوم بھی انہیں بے حد عزیز رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ خود ایک بڑے دلدوز سانحے سے دوچار ہوئے۔ ۱۱ر مئی ۲۰۰۷ء کی شب واقعی شب تاریک ثابت ہوئی اور ان کی اہلیہ نے اچانک وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ بڑی نیک، صالحہ اور رابعہ صفت خاتون تھیں۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور اعلی علیین میں جگہ دے۔ قارئین سے بھی درخواست ہے کہ وہ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔

اس غم انگیز واقعے سے میں بھی بے حد افسردہ اور ملول تھا، تاہم ڈاکٹر صاحب اس دور حزن و ملال میں بھی کاروان رفتگاں کی اشاعت پر مصر رہے اور گراں قدر پیش لفظ بھی تحریر فرمایا۔ اللہ تعالی انہیں صبر و استقامت بخشے اور ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے۔

کتاب کا نام میں نے علامہ شبلی کے اس شعر

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام ونشاں کب تک

سے ''نشان رفتگاں'' رکھا تھا، مگر مولانا مرحوم نے اسے پسند نہیں کیا۔ پھر کئی ماہ بعد انہوں نے مکتبہ الرشاد کی فہرست شائع کی تو اس کا نام ''کاروان رفتگاں'' رکھا اور اب یہ کتاب اسی نام سے شائع کی جارہی ہے۔ کتاب کی ترتیب بھی حضرۃ الاستاذ کی منشاء کے مطابق زمانی ترتیب کے لحاظ سے ہے۔ الف بائی ترتیب زیادہ مفید خیال کی جاتی ہے، تاہم حضرۃ الاستاذ کی خواہش راقم کے نزدیک اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ آخر میں اشاریہ شامل کیا گیا ہے۔ امید ہے اس سے الف بائی ترتیب کی تلافی ہوجائے گی۔

خیال تھا کہ ان مضامین کا انتخاب شائع کیا جائے، مگر ایک ادنی شاگرد کو استاذ مرحوم کی ہر تحریر سونے کی ڈلی نظر آئی۔ ممکن ہے اہل نظر اس سے اتفاق نہ کریں، تاہم اس سلسلے میں مجھے معاف فرمایا جائے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور حضرۃ الاستاذ کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین

[۵]

اسفارمجیب

مولانا مجیب اللہ ندوی

استاذی حضرت مولانا مجیب اللہ ندویؒ [۱۹۱۸-۲۰۰۶ء] کی ۶۲ رسالہ علمی وعملی جدو جہد کی ایک طویل داستان ہے۔ جو بصائر وعبر کے متعدد واقعات، علمی ودینی تحقیقات، گراں قدر تصنیفات وتالیفات، تعلیم اور تعلیمی خدمات، مذہبی حمیت وغیرت کے جذبات، جرأت وبیبا کی اور حق گوئی کے نادر واقعات اوراخلاص وللہیت سے عبارت ہے۔ مگر افسوس کہ ان پراب تک کوئی علمی وتحقیقی کام نہ ہوسکا اوران کے کارناموں کونئی نسل کے لئے محفوظ کرنے کوشش نہ ہوئی۔ حالانکہ مولانا مرحوم کی سیرت وشخصیت کے متنوع پہلوؤں میں چند پہلو بڑے اہم اور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کا ذکر انشاءاللہ کسی اور موقع پر آئے گا۔

حضرت مولانا مجیب اللہ ندویؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے شاگرد اور جلیل القدر مصنف تھے۔ مختلف موضوعات پر ان کے قلم سے تقریباً دو درجن بلند پایہ علمی وتحقیقی کتابیں اور کتابچے نکلے۔ جن کے نام یہ ہیں:

۱۔ اہل کتاب صحابہ وتابعین
۲۔ تبع تابعین (حصہ اول)
۳۔ اجتہاد اور تبدیلیٔ احکام
۴۔ فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل
۵۔ سرمد اوران کی رباعیاں
۶۔ فتاویٰ عالمگیری اوراس کے مؤلفین
۷۔ عبادت وخدمت

۸۔اسلامی قانون اجرت
۹۔اہل دل کی باتیں
۱۰۔اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات
۱۱۔دینی مدارس اوران کی ذمہ داریاں
۱۲۔مسئلہ کفائت
۱۳۔اسوۂ حسنہ
۱۴۔قرآن پاک کی تعلیم اوراس کی عظمت
۱۵۔ریاض الحدیث
۱۶۔اسلامی فقہ (۳رجلدیں)
۱۷۔ثبوت رجم
۱۸۔خدمت حدیث میں خواتین کا حصہ
۱۹۔خواجہ میر درداوران کی شاعری (غیر مطبوعہ)
۲۰۔انوار محمدی ترجمہ شمائل ترمذی
۲۱۔اسلامی تعلیم (۴رحصے)

ان تصنیفات و تالیفات کے عناوین سے ان کے مشمولات کے ساتھ ان کی اہمیت، افادیت، انفرادیت اور عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ان میں چند ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جن پر ان سے پہلے قلم نہیں اٹھایا گیا تھا، باوجود اس کے مولانا مرحوم نے تحقیق وتدقیق اور تلاش و جستجو سے ان موضوعات پر مستقل کتابیں لکھیں۔اہل کتاب صحابہ وتابعین، فتاویٰ عالم گیری اور اس کے مؤلفین، اجتہاد اور تبدیلی احکام وغیرہ ان کی ایسی ہی اہم اور معرکۃ الآراء تصنیفات ہیں۔

فقہ میں انہیں اختصاص حاصل تھا۔فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل، اسلامی قانون اجرت، اجتہاد اور تبدیلی احکام اور اسلامی فقہ وغیرہ سے ان کی بالغ نظری اور فقہی بصیرت پورے طور پر نمایاں ہوتی ہے۔فقہ اسلامی اور اس کا دائرہ کار کے موضوع پر انہوں نے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں جو خطبہ دیا تھا وہ فقہ پر ان کی مجتہدانہ نظر کا ایک نمونہ ہے۔ان کی فقہی

بصیرت کی داد ان کے بزرگ معاصرین مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا محمد منظور نعمانی نے بھی دی اور بعض دیگر ہم عصر مثلاً مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی اور مفتی ظفیر الدین صاحب نے بھی فقہ پر غیر معمولی نظر کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک اہم پہلو اسلامی تعلیم کے لئے ان کی فکر مندی اور جدوجہد ہے۔ جامعۃ الرشاد کا قیام، دینی تعلیمی کونسل سے وابستگی اوراعظم گڑھ کے گاؤں گاؤں میں مکاتب و مدارس کا قیام ونظام، جلسوں میں شرکت اور خطاب، یہ تمام تگ و دو مسلمانوں کی صلاح وفلاح بالخصوص بچوں میں اسلامی تعلیمات ذہن نشین کرانے کی غرض سے تھی۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے پرائمری درجات کے لئے چار حصوں میں ''اسلامی تعلیم'' کے نام سے کتاب لکھی۔ ان کی کتاب بچوں کے لیے سیرت نبویؐ بھی اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے۔ اس پہلو سے وہ پوری زندگی جدوجہد کرتے رہے۔

مسلمانوں پر ہونے والے ہر ظلم کے خلاف مولانا ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ یہ مظالم چاہے ہندوستان میں ہوں یا دنیا کے کسی خطے اور علاقے میں ہوں۔ یہی نہیں وہ یورپ وامریکہ اور اسرائیل کے ظلم و بربریت کے خلاف مدۃ العمر سراپا احتجاج رہے اوران کی سازشوں کو مسلسل بے نقاب اور اس سے مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہے۔ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی آواز لگاتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر ہم اسلام دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی غرض سے ملی کونسل کے لیے قیام میں وہ تن من سے لگے۔ اسی طرح انہوں نے الرشاد کے ذریعہ مسلمانوں کی مسلسل فکری رہنمائی کی۔ یہ ان کی کتاب زندگی کے بڑے کارنامے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں کے تمام اہم اور بنیادی مسائل سے انہوں نے گہری دلچسپی لی۔ مسلمانوں کے تشخص کی بقا کا مسئلہ ہو یا مسلم کش فسادات۔ اردو کے ساتھ ناانصافی کا معاملہ ہو یا مسلم یونیورسٹی کے حقوق کی بازیابی کی جدوجہد۔ بابری مسجد کا قضیہ ہو یا شاہ بانو کیس۔ سب پر انہوں نے نہ صرف اظہار خیال کیا، مفید مشورے دئے بلکہ عملی جدوجہد بھی کی۔ حتیٰ کہ گرفتار ہوئے، جیل کی صعوبتیں برداشت کیں، مگر آخری سانس تک ان کے عزم وحوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ افسوس:

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

مولانا کے سانحہ وفات [۱۲ مئی ۲۰۰۶ء] کے بعد ان کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور ان کے فکر و خیال کی تدوین و اشاعت کا ایک علمی منصوبہ زیر غور تھا۔ جس کے تحت حیات مجیب، افکار مجیب، مقالات مجیب، سیاحت مجیب، رشحات مجیب، تبصرہ مجیب، نقوش زندگی اور بعض ادھورے علمی و ادبی کاموں مثلاً ''مسلمان سلاطین کی تصانیف''، ''خواجہ میر درد اور ان کی شاعری'' وغیرہ کی ترتیب و تدوین اور تکمیل و اشاعت پیش نظر تھی۔ مولانا کے وفیاتی مضامین کے مجموعہ ''کاروان رفتگاں'' کی ترتیب و اشاعت سے اس کا آغاز ہوا، مگر بوجوہ یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ ان کی یاد میں ماہنامہ الرشاد کا خصوصی شمارہ شائع کرنے کا خیال تھا وہ بھی پورا نہ ہوسکا۔ ملک کے دوسرے رسائل و جرائد نے بھی اس کام کی طرف توجہ نہ دی۔ مولانا مرحوم ندوہ کے ممتاز فرزند تھے، اس نے بھی ان سے اغماض برتا۔ آل انڈیا ملی کونسل جس کے لئے ایک زمانہ میں انہوں نے اپنا سب کچھ تج دیا تھا اور ملک کے مختلف علاقوں میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کے ساتھ مارے مارے پھرے، اس کونسل کے رسائل نے بھی مولانا کو یاد نہیں رکھا۔ غرض مولانا مرحوم کی مثالی شخصیت اور گراں قدر خدمات سے اہل قلم نے آنکھیں بند کرلیں اور اب تک ان پر کوئی بھرپور کام سامنے نہ آسکا۔ حالات کی ستم ظریفی دیکھیں کہ خود میں نے بھی گویا قلم اٹھالیا تھا۔

مولانا کی یاد میں ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ نے ''یادوں کا چمن'' کے عنوان سے ماہنامہ الرشاد میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جو بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ ۲۰۱۲ء میں مولانا مجیب اللہ ندوی دوروزہ سمینار کے موقع پر انہوں نے اسے کتابی صورت میں شائع کرایا، مگر پھر کسی مصلحت سے اسے عام نہیں کیا۔ چنانچہ اس سے بھی مولانا مرحوم کے قدر دانوں کو محروم ہی رہنا پڑا، حالانکہ وہ ایک بڑی عمدہ کتاب ہے۔ اس سے مولانا مرحوم کی کتاب زندگی کے مختلف ابواب سامنے آجاتے ہیں۔ خاص طور پر جامعۃ الرشاد کے قیام و استحکام کی جدوجہد اور ان کی عظیم الشان علمی و دینی خدمات کا ایک عمدہ مرقع سامنے آجاتا ہے۔

۲۰۱۲ء میں مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبداللہ عمار صاحب نے ان کی یاد میں دوروزہ قومی سمینار منعقد کیا جس میں ملک کے متعدد ممتاز اہل قلم اور مولانا مرحوم کے

قدردانوں نے شرکت کی اور مولانا مرحوم کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پیش کئے۔ اس موقع پر ڈاکٹر عبداللہ عمار صاحب نے مولانا مرحوم کی خودنوشت ''نقوش زندگی'' کی قسطوں کو ماہنامہ الرشاد سے یکجا کر کے شائع کیا۔ کاروان رفتگاں (مطبوعہ: ۲۰۰۸ء) کی اشاعت کے بعد مولانا مرحوم کی یہ دوسری تحریر تھی جو شائع ہو کر مولانا کے قدردانوں تک پہنچی۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی تیسری کوشش ہے۔ اس میں ان کے سفرنامے یکجا کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ''کاروان رفتگاں'' کی اشاعت کے وقت مرتب ہوگئی تھی۔ مولانا مرحوم کے محبّ خاص ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ مدیر مسئول ماہنامہ الرشاد کی خواہش تھی کہ اسے بھی شائع کر دیا جائے، مگر پھر وہ خاموش ہو گئے اور میں نے انہیں یاد دلانا مناسب خیال نہیں کیا اور میں دوسرے کاموں میں مشغول ہو گیا اور علامہ شبلی کے متعلق کئی کتابیں لکھیں، لیکن ان سفرناموں کی اشاعت کا خیال دل سے نہ گیا۔ اس دوران برادر مکرم ڈاکٹر عبداللہ عمار صاحب بار بار ادھر متوجہ کرتے رہے اور اب کئی برس بعد وہ اسے ''مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ'' سے شائع کر رہے ہیں جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کی بطور یادگار قائم کیا ہے۔ دعا ہے کہ استاد مرحوم کی یاد میں قائم یہ ادارہ بھی پروان چڑھے اور ترقی کرے۔

مولانا مرحوم کی متعدد یادگاروں میں ایک یادگار ندوۃ التالیف والترجمہ بھی ہے۔ مولانا اسے ایک تصنیفی و تحقیقی مرکز بنانا چاہتے تھے، جس میں کچھ رفقاء ہوں جو زمانے کے تقاضوں کے مطابق تصنیف و تالیف کا کام کریں اور انہیں اہتمام سے شائع کیا جائے اور جو کتابیں ندوۃ التالیف والترجمہ نے شائع کی ہیں وہ مسلسل شائع ہوتی رہیں، مگر افراد کی کمی اور مالی دشواریوں کی وجہ سے وہ اسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ ضرورت ہے کہ مولانا مرحوم کی خواہش کی تکمیل کی کوشش کرتے ہوئے اس کی اشاعتی سرگرمیاں تیز کی جائیں اور کم از کم مولانا مرحوم کی کتابوں کو نئے سرے سے شایان شان شائع کیا جائے اور انہیں قارئین تک پہنچانے کا بھی نظم کیا جائے۔ یہ کوشش مولانا مرحوم کی خدمات اور ان کی فکر و نظر سے نئی نسل کو متعارف کرانے میں یقینی طور پر معاون ہوں گی۔ زیر نظر کتاب اصلاً اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے۔

مولانا مرحوم نے ملک و بیرون ملک کے متعدد سفر کئے۔ انہیں سفر سے بڑی دلچسپی تھی اور

وہ سفر کی خواہش بھی رکھتے تھے اور ملک و بیرون ملک ان کی برابر مانگ بھی رہتی تھی، مگر جامعۃ الرشاد کی نظامت کے فرائض اور علمی و تصنیفی مشغولیات بالخصوص ماہنامہ الرشاد کی وجہ سے اس کے کم مواقع آتے تھے۔ البتہ حج بیت اللہ کا موقع آجاتا تو ان کا شوق سفر لائق رشک ہوتا۔ وہ سب کچھ چھوڑ کر اس کی تیاریوں میں والہانہ لگ جاتے۔ انہیں چار مرتبہ حج و زیارت حرمین شریفین کی سعادت ملی۔ پہلی بار ۱۹۶۸ء میں حج کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانہ میں ماہنامہ الرشاد جاری نہیں ہوا تھا، اس لئے شاید اس کا سفرنامہ نہ لکھ سکے۔ بعد کے ادوار میں انہوں نے تین بار زیارت حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی اور ان کے سفرنامے لکھے۔ یہ تینوں سفرنامے زیرنظر کتاب میں شامل ہیں اور زائرحرم کے جذبات کے آئینہ دار ہیں۔

ان کے علاوہ ان کے تمام اسفار علمی و تعلیمی ہیں۔ مصر وہ ایک کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ ساؤتھ افریقہ کا سفر بھی بعض اہل علم خاص طور پر پروفیسر سید سلمان ندوی مدظلہ اور مولانا عبدالحق عمرجی مرحوم کی دعوت پر ہوا تھا۔ پٹنہ کا علمی سفر دراصل ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی خواہش پر توسیعی خطبہ پیش کرنے کے لئے ہوا۔ بھاگل پور کا سفر اس کے قیامت خیز فسادات سے متاثرین سے ملنے اور تعاون کی غرض سے کیا گیا تھا۔ وہ ٹیپو سلطان کے شہر میسور میں آل انڈیا ملی کونسل کے اجلاس میں شرکت کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ بمبئی کے متعدد اسفار اقدام امت کانفرنس، اتحاد ملت کانفرنس اور بعض دوسرے اجلاسوں میں شرکت کے لئے کئے گئے تھے۔ کئی اسفار اسلامی فقہ اکیڈمی، ملی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر اداروں کے اجلاسوں میں شرکت کے لئے کئے گئے۔ ان اسفار کے سفرناموں میں ان کی مفصل روداد شامل ہے۔

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ ندوہ کے زمانہ طالب علمی میں ان کے ساتھ ایک سفر بھی کیا تھا، اس کی رداد بھی انہوں نے لکھی ہے۔ ایک بار ندوہ میں ان سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے تو اس کی ''چند گھنٹے دیار علم و فضل میں'' کے عنوان سے رپورٹ لکھی۔ غرض ان کے تمام اسفار ملت کے لئے ہوتے تھے اور ان میں ملت ہی کا طرح طرح سے ذکر ہے۔ ان تمام اسفار کی انہوں نے ماہنامہ الرشاد میں بڑی پراثر رودادیں لکھیں۔

جنہیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا گیا۔انہوں نے ملیشیا کا بھی ایک سفر کیا تھا جو جامعۃ الرشاد کے مالی استحکام کے لئے تھا،مگر اس کا سفرنامہ وہ نہیں لکھ سکے۔یہ ان کا پہلا بیرون ملک سفر تھا۔اس میں وہ سنگاپور بھی گئے تھے۔اس سفر کے بہت سے واقعات وہ سنایا کرتے تھے۔اسی سفر میں وہ پھسل کر گر پڑے تھے،جس سے ان کا ایک پاؤں فریکچر ہو گیا تھا۔

مولانا مرحوم نے دارالمصنّفین سے وابستگی کے بالکل ابتدائی دور میں بمبئی اور گجرات وغیرہ کا سفر مولانا سید سلیمان ندویؒ کی معیت میں کیا تھا۔اس کی کسی قدر تفصیل انہوں نے اپنی ناتمام خودنوشت ''نقوش زندگی'' میں لکھی ہے۔چونکہ یہ پہلا اور علمی حیثیت سے بڑا اہم سفر تھا اور انھیں متعدد اہل علم سے شرف ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا،اس لئے اسے بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

مولانا مرحوم نے جو سفرنامے لکھے ہیں ان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر طرح کی رطب و یابس درج نہیں کی گئی ہیں اور نہ طول بیانی سے کام لیا گیا ہے بلکہ ان کی ساری توجہ اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان امور کی طرف ہے جس سے کسی خاص مسئلہ پر روشنی پڑتی ہو۔سفر کی غرض و غایت اور اس کے مقاصد کی توضیح کے ساتھ انہوں نے ملاقات کرنے والوں،ضیافت کرنے والوں اور تعاون کرنے والوں کے نام اور ان کے کام کی بھی تفصیل درج کی ہے۔اہل علم اور ارباب کمال کے علاوہ عام لوگوں کا ذکر بھی انہوں نے اسی اہتمام سے کیا ہے، جس طرح خاص لوگوں کا کرتے ہیں۔انہوں نے جن شہروں کے سفرنامے لکھے ان کی تاریخی حیثیت کا بھی ذکر کیا ہے۔بعض شہروں کی تہذیبی وتمدنی تاریخ بھی لکھی ہے۔

مولانا مرحوم نے جن مقامات کے سفر کئے اور سفرنامے لکھے، ان میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ،مصر،ساؤتھ افریقہ، نیپال، دہلی،مہاراشٹر،بمبئی،اورنگ آباد، پٹنہ، بھاگل پور،مونگیر،رانچی، علی گڑھ،کشی نگر، گجرات، راجستھان، میسور،لکھنؤ، دیوریا وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ان تمام مقامات کے سفرنامے دلچسپ،معلومات افزا اور تاریخی ہیں۔ان کے مطالعہ سے ان مقامات کا علمی و تعلیمی اور تہذیبی منظرنامہ بھی سامنے آجاتا ہے۔خاص طور پر گجرات اور ساؤتھ افریقہ کے سفرنامے بے حد معلوماتی اور سبق آموز ہیں۔

مولانا مرحوم کا ایک خاص اسلوب نگارش ہے۔ جس میں سادگی، شائستگی، متانت اور بڑی پرکاری ہے۔ ایجاز و اختصار اور جامعیت ان کی نثر دوسری بڑی خصوصیت ہے۔ اس منفرد اسلوب بیان کی وجہ سے ان سفر ناموں میں ایک خاص قسم کی دل کشی، رعنائی اور جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ جسے ہم بیانیہ نثر کا ایک عمدہ نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان سفر ناموں کی اشاعت سے مولانا مرحوم کے نہ صرف افکار و خیالات اور خدمات کے سمجھنے میں مدد ملے گی بلکہ ہمارے ادبی ذخیرے بالخصوص سفر ناموں میں ایک قیمتی اضافہ بھی ہوگا۔

مولانا مرحوم کو ملت اور ملت کے مسائل سے کس درجہ دلچسپی تھی، ان سفر ناموں سے اس کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ ملی مسائل کے حل کے لئے ان کے ذہن میں کیا تدبیریں تھیں؟ اور انہیں وہ کس نظر سے دیکھتے تھے اور وہ کیا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تعلیم کیا تھا۔ اتحاد ملت کے لئے ان کے کیا منصوبے تھے۔ اس طرح کی تقریباً تمام تفصیلات ان سفر ناموں میں کسی نہ کسی نوع سے آگئی ہیں۔ ان کا مطالعہ بہر صورت افادیت کا ضامن ہے۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب زمانی ہے، یعنی جس تسلسل کے ساتھ یہ سفر نامے لکھے گئے اور شائع ہوئے، اسی ترتیب سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ البتہ اس میں ایک استثنا ہے۔ ان کا پہلا سفر گجرات جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کی معیت میں ہوا تھا اس کی روداد انہوں نے سب سے آخر ''نقوش زندگی'' میں لکھی تھی، اسے سب سے اول درج کیا گیا ہے۔ حج کے سفر ناموں کو یکجا شامل کرنے کا خیال تھا، مگر اس سے ارتقائی تسلسل ٹوٹ جاتا، اس لئے انہیں بھی زمانی ترتیب کے مطابق رکھا گیا ہے۔ اس ترتیب کی ایک افادیت یہ بھی ہے کہ اس سے مولانا مرحوم کی علمی و فکری جہات تسلسل کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں۔

ان سفر ناموں میں جن اشخاص، مقامات اور کتابوں کا ذکر آیا ہے افادیت کے پیش نظر ان کا ایک اشاریہ درج کیا گیا ہے۔ مولانا نے اپنے بزرگوں، احباب، معاصرین اور خوردوں کا جس محبت سے ذکر کیا ہے، اس اشاریہ سے فوری طور پر اسے تلاش کیا جاسکتا ہے۔

مولانا مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر عبداللہ عمار رشادی صاحب نے مولانا کے علمی کاموں کی اشاعت کی غرض سے ''مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ'' قائم کیا ہے۔ میں

ان کا بے حد شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ سے منظور کی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور ان کے انسٹی ٹیوٹ کو ترقیات سے نوازے اور مجھے حق شاگردی ادا کرنے کی توفیق بخشے۔

---

[۶]

مرزا سلامت علی دبیر

از: مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ [۱۹۳۷ء-۲۰۰۸ء] مایہ ناز عالم ومصنف، محقق اور ادیب وانشاء پرداز تھے۔ مختلف موضوعات پر داد تحقیق وتصنیف وتالیف دی۔ کئی اہم کتابیں مثلاً ''ہندوستان عربوں کی نظر میں'' [دوجلدیں] ''تذکرۃ المحدثین'' [تین جلدیں] ''چند ارباب کمال''، ''ایضاح القرآن''، ''مولانا ابوالکلام آزاد''، ''مشاہیر کے خطوط''، ''انتخاب کلام اقبال سہیل''، ''مسلمانوں کی تعلیم'' اور ''الاصلاح ایک تعارف'' وغیرہ ان کے قلم سے نکلیں۔ انہوں نے تقریباً ڈھائی سو مقالات اس سے زائد وفیاتی مضامین، ڈھائی سو کے قریب شذرات، ہزاروں کتابوں پر نقد تبصرہ اور دو درجن کتابوں پر مقدمے اور دیباچے لکھے۔ ۵۱-۵۲ برس تک وہ مسلسل تصنیف وتالیف میں مصروف رہے۔ اردو کے اس قدر طویل المدت خدمت کم گزرے ہیں۔ ان مطبوعہ تحریروں کے علاوہ انہوں نے اپنے کوائف نامے میں تیرہ غیر مطبوعہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ جو درج ذیل ہیں:

(۱) ایضاح القرآن جلد دوم (۲) تذکرۃ المحدثین جلد چہارم (۳) علامہ شبلی نعمانی (۴) یہودیت اور نصرانیت کی حقیقت (۵) حدیث کی اہم عربی شرحیں (۶) عربی کی اہم تفسیریں (۷) علامہ شبلی کے علمی و ادبی افکار (۸) مولانا آزاد کے تفسیری افکار (۹) مالک رام: ماہر غالبیات و ابوالکلامیات (۱۰) ہندوستان کی عظمت کہنہ (۱۱) جانے والوں کی یادیں (۱۲) اردو کے ممتاز ہندو محسنین (۱۳) سوئے حرم۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنی جن غیر مطبوعہ کتابوں کے نام لکھے ہیں وہ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھیں۔ البتہ وہ ان کے پیش نظر ضرور تھیں اور وہ غالباً اپنے

مطبوعہ مضامین ومقالات سے انہیں مرتب کرنے کا خاکہ ذہن میں رکھتے تھے۔ ان کے مطبوعہ مقالات کوترتیب دے کر مذکورہ کتابوں کی شکل میں پیش بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک اور کتاب کا ذکر کیا جاتا ہے، جس کا ان کے کوائف نامے میں ذکر نہیں ہے۔ گویا یہ کتاب کوائف نامے کے بعد قلم بند ہوئی۔

مولانا مرحوم کے دلدوز سانحۂ وفات کے بعد ان کے ذاتی مطالعہ کی میز پر بکھرے کاغذات کی ترتیب وجمع آوری میں ایک اور کتاب ''مرزا سلامت علی دبیر'' کے متفرق اوراق ملے۔ راقم نے جب انہیں یکجا کیا۔ صاف اور ناصاف مسودہ کو ملایا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مکمل کتاب ہے۔ دیباچہ اور کتابیات کی دستیابی کے بعد اس کے پایۂ تکمیل کو پہنچ جانے میں شبہ نہیں رہا۔

مولانا مرحوم نے یہ کتاب ایک شیعہ عالم مولانا سید عقیل الغروی کی فرمائش پر قلم بند کی ہے جن سے ان کے بڑے گہرے مراسم اور تعلقات تھے۔ مولانا مرحوم نے دیباچہ میں لکھا ہے:

> ''کتاب مکمل کرنے کے بعد خیال ہو رہا ہے کہ علامہ شبلی نے میر انیس پر معرکہ آراء کتاب لکھی تھی، راقم کو ان کے معاصر اور ہم پایہ مرزا دبیر پر یہ حقیر کتاب پیش کرنے کا موقع ملا۔ یہ کام نہ ہو پاتا اگر مولانا سید عقیل الغروی صاحب کی پیہم تحریک واصرار نہ ہوتا۔ میں اس کے لیے ان کا ممنون ہوں۔ جن لوگوں کی میں بہت قدر کرتا ہوں ان میں مولانا بھی ہیں۔ ان کی کسی خواہش کو رد کرنا میرے امکان میں نہیں۔ اس لیے یہ کام جس کو وہ مجھ سے بہتر کر سکتے تھے مجھے یہ کہہ کر کرنا پڑا کہ:

غبار راہ کو بخشا گیا ذوق جمال
خرد بتا نہیں سکتی کی مدعا کیا ہے

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مرزا دبیر کے حالات اور کمالات کا ذکر ہے۔ نام، تخلص، ولادت اور خاندان، تاریخ ولادت اور مولد، تعلیم اور اساتذہ، میر ضمیر سے تلمذ اور بے لطفی، علمی پایہ، شاعرانہ کمالات، مرثیہ خوانی کا انداز، دین داری اور مذہبیت، اخلاق وعادات، شادی، اسفار، وفات، اولاد واحفاد، لباس، غذا، اس باب کے ذیلی عنوانات ہیں۔ ان سے اندازہ

لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم نے کس قدر محنت و تحقیق اور تلاش و تفحص سے ان کے حالات و سوانح قلم بند کیے ہیں۔

دوسرے باب میں مرزا دبیر کی تصنیفات کا تعارف و تجزیہ ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مرزا صاحب نے عربی فارسی اور اردو میں کتابیں اور کتابچے لکھے۔ حتیٰ کے سورۃ یوسف کی تفسیر بھی لکھی۔ اس باب میں مولانا نے ان کی چھوٹی بڑی، منظوم و منثور دس کتابوں کا ذکر کیا ہے، جس میں ان کی مثنویات اور مراثی کے مجموعے بھی شامل ہیں۔ ان کی متعدد اشاعتوں کی بھی تفصیل قلم بند کی ہے۔ الحاق مراثی کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ دراصل یہ باب مولانا کی تلاش و تفحص اور تحقیق و جستجو کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

تیسرے باب میں مرثیہ کی تعریف، اجمالی تاریخ اور آغاز و ارتقاء کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ بعض قدیم مرثیہ نگاروں کی کاوشوں کا بھی ذکر ہے۔ چوتھے اور آخری باب میں مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کے بعض نمایاں پہلوؤں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان کے شاعرانہ کمالات اور فنی خصوصیات فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی، جوش، روزمرہ کے استعمال اور صحت الفاظ وغیرہ پر ان کے کلام سے استدلال کیا گیا ہے۔

یہ کتاب مولانا مرحوم کے قلم سے ۹۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو کتابت میں ۲۰۰ صفحات سے کم نہ ہوں گے۔ البتہ پہلے باب کا ایک صفحہ دستیاب نہیں ہے۔ مرتب کرنے والے کو اس خلا کو پر کرنا ہوگا۔

مولانا مرحوم نے ان چار ابواب میں مرزا سلامت علی دبیر کے حالات و سوانح اور شاعرانہ کمالات کا شاید ہی کوئی پہلو تشنہ چھوڑا ہو۔ راقم کے خیال میں یہ مرزا دبیر پر ایک بھرپور اور مکمل کتاب ہے۔ ان پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اور جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سب کا نچوڑ اس میں آ گیا ہے۔ ایک نوٹ میں مولانا نے دبیر پر لکھی جانے والی تحریروں کی حیثیت پر بھی بحث کی ہے۔ سچ یہ ہے کہ کئی حیثیتوں سے مطبوعہ کتابوں سے یہ ایک بہتر کتاب ہے۔ اس کی اشاعت سے ہمارے ادبی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ علامہ شبلی کی ''موازنہ انیس و دبیر'' کے بڑے مداح تھے۔ واقعہ

یہ ہے کہ شبلی نے میر انیس کے محاسن اور شاعرانہ کمالات اور مرزا دبیر کے مقابلہ میں ان کی برتری ثابت کر کے اقلیم شعر وادب میں ہمیشہ کے لئے ان کا سکہ رائج کر دیا۔ بلاشبہ انہوں نے جو کچھ لکھا اس کی صداقت میں حرف نہیں، لیکن اس کا یہ اثر بھی ہوا کہ مرزا دبیر کے شاعرانہ کمالات کی طرف وہ توجہ نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ موازنہ کے جواب میں جو کتابیں لکھی گئیں مثلاً المیزان، ردالموازنہ، اور تردید الموازنہ وغیرہ ان میں اگرچہ دبیر کی طرف داری اور حمایت کی گئی تھی اور ان کے محاسن شعری کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن وہ ''موازنہ انیس و دبیر'' کے ہم پلہ نہ تھیں مولانا مرحوم کی یہ کتاب اس کا ازالہ تو نہیں کر سکتی، تاہم میر انیس کے مد مقابل کے اوصاف اور شاعرانہ کمالات کو بخوبی اجاگر ضرور کرتی ہے۔ مولانا نے انیس کا ذکر جا بجا کیا ہے، لیکن انیس سے موازنہ یا برتری ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔

ادبی وتنقیدی حیثیت سے مولانا مرحوم کی یہ ایک اہم کاوش ہے۔ اس سے ان کی سوانح نگاری اور تنقید نگاری پر کمال دسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔ البتہ یہاں یہ کہنے میں عار نہیں کہ مولانا نے جدید تنقیدی افکار ونظریات سے کام نہیں لیا ہے اور نہ ہی اس حیثیت سے ان پر بحث کی ہے۔ راقم کے خیال میں مشرقی شاعرانہ کمالات کے تجزیے اور تفہیم میں مشرقی انداز تنقید ہی بہتر رویہ ہے اور غالباً مولانا نے بھی اسی پس منظر میں یہ کتاب لکھی ہے۔ بلاشبہ مولانا مرحوم کی یہ ایک اہم ادبی وتنقیدی کاوش ہے۔ اس کی اشاعت ایک اہم ادبی خدمت ہوگی۔

[۷]

متاعِ نقد و نظر

مولانا مستقیم احسن اعظمی

یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کے پیکر مجسم، ہمارے بزرگ مولانا مستقیم احسن اعظمی صاحب مدظلہ صدر جمعیۃ علماء مہاراشٹر بڑے عالم و فاضل اور بالغ نظر شخص ہیں۔ وہ ایک عرصہ سے قوم وملت کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ انتہائی خاموشی سے اللہ کی رضا کے لئے وہ ملت بالخصوص مہاراشٹر کے مسلمانوں کے رفاہی اور سماجی کاموں میں سرگرم ہیں۔ ان کے دکھ درد کا مداوا تلاش کرتے ہیں اور اپنا سب کچھ اس پر نچھاور کر دیتے ہیں۔ ضعف اور پیرانہ سالی بھی ان کے کاموں میں سدراہ نہیں ہوتے۔ ذاتی اور گھریلو مسائل کو بھی یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور انجام کار کی بھی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسے محسن و مخلص اشخاص مشکل سے ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی کے ساتھ ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔

مولانا محترم نے مدرسۃ الاصلاح، ندوہ اور دارالعلوم دیوبند ہندوستان کی تین عظیم درس گاہوں میں اپنی علمی تشنگی بجھائی ہے۔ ان کا علم و مطالعہ بہت وسیع اور گہرا ہے۔ مسلمانوں کے علوم و فنون، تاریخ و تہذیب، بالخصوص ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کے نشیب و فراز پر ان کی عمیق نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات میں بڑی اثر انگیزی اور روح میں بالیدگی پیدا کرنے والے واقعات کا ایک انقلاب آفریں سلسلہ ہوتا ہے۔ جذب و اثر میں ڈوبے ہوئے ان کے خطبات فکر و عمل کا ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ خود راقم الحروف کئی بار ان کی سحر البیانی میں اپنی آنکھیں بھگو چکا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک بڑے خطیب ہیں اور اگر ان کے خطبات کو محفوظ کر دیا جائے تو بلاشبہ ایک بہت مفید اور معلومات افزاء کتاب ہوگی۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا محترم ایک پختہ مشق اہل قلم بھی ہیں۔ بمبئی کی پرشور اور

ہنگامہ خیز زندگی اور جمعیۃ علماء کی عملی سرگرمیوں میں مسلسل سرگرم رہنے کے باوجود کاغذ وقلم سے رشتہ استوار رکھنا یقیناً دشوار گذار عمل تھا، مگر مولانا اعظمی کی یہ بڑی خوبی ہے کہ انہوں نے کسی نہ کسی نوع سے لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھا، بلکہ یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ انہوں نے بڑے اہم اور متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا اور حق تو یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔ اور ایسے معلومات افزاء اور علمی وادبی اور دینی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو وسیع مطالعہ وتحقیق اور باریک بیں نظر کے بغیر مکمل طور پر پیش نہیں کیے جاسکتے تھے۔ دراصل مسلمانوں کی تاریخ، ان کے علوم وفنون اور ان کی تہذیب وتمدن پر مولانا محترم کی مجتہدانہ نگاہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین ومقالات اور خطبات قلب ونظر کو روشن کر دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی دلکش، دلآویز اور ادب وانشاء سے لبریز خوب صورت نثر ذوق ووجدان پر اثر انداز ہوجاتی ہے۔

مولانا محترم کا پہلا مضمون مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے ۱۹۶۰ء میں البلاغ بمبئی میں شائع کیا تھا۔ بعض مضامین ماہنامہ معارف اور دیگر مؤقر رسائل میں شائع ہوئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہا ہوتا تو آج ہم نظم حسرت کو بے مزہ کرنے والے ایک اہل قلم، ایک ادیب اور ایک انشا پرداز کے افادات سے محروم نہ ہوتے۔

باوجود اس کے مولانا مستقیم احسن اعظمی کے جو مقالات وخطبات شائع ہوئے وہ کم اہمیت کے حامل نہیں۔ ان میں موضوعات کا تنوع اور طرفگی بھی ہے اور فکر ونظر کی جلوہ سامانی بھی۔ ہم ان کے بے حد ممنون وشکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنے ان بکھرے نقوش کو یکجا کرنے اور ان کی اشاعت کی اجازت بخشی۔ برادر مکرم ڈاکٹر محمد عارف عمری صاحب جو ان کے بڑے لائق فرزند ہیں انہوں نے اس کام کو بڑی خوبی سے انجام دیا اور یہ خوان علمی انہیں کی بدولت سجایا گیا ہے۔

''متاع نقد ونظر'' مولانائے محترم کے مذہبی، تاریخی، علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین و مقالات اور چند خطبات کا مجموعہ ہے۔ یہ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جس کا عنوان اشخاص وافکار ہے، اس میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید سعد مدنیؒ اور مولانا حامد الانصاری غازیؒ جیسے یگانہ روزگار علماء و فضلاء، ملک وملت کے رہنما اور ہندوستان میں اسلام کی سربلندی کے مینارہ نور کا ذکر خیر، ریشمی

رومال تحریک اور جدوجہد آزادی میں ان بزرگوں کی مساعی جمیلہ کی داستان ہے۔ مولانا شبلی نے ندوہ اور تحریک ندوہ کے لئے جو جدوجہد کی ایک مقالہ میں اس کی تفصیل بڑے عمدہ انداز میں قلم بند ہوئی ہے۔ اس سلسلے کے آخری مضمون میں ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی ڈائرکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی کی کاوشوں کا ذکر ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ بحث ونظر ہے۔ اس میں چند ملی اور مذہبی مضامین ہیں۔ اس میں ایک اہم مضمون مولانا ابوالکلام آزاد کے انانیتی ادب پر بھی شامل ہے۔ اس منفرد موضوع پر شاید ہی کسی اہل قلم نے اس قدر عمدہ اور فکر انگیز مضمون لکھا ہو۔ ایک مضمون ''یوم الفرقان'' عربی سے ترجمہ ہے جو مولانا محترم کی عربی زبان سے واقفیت اور ترجمہ نگاری پر دست رس کا پتہ دیتا ہے۔ قوم سبا کا تاریخی تجزیہ بھی بے حد عمدہ مضمون ہے۔ غرض یہ حصہ بحث ونظر بڑے اہم گوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ آخری حصہ میں تین استقبالیہ خطبات ہیں، جن میں دو کا تعلق بیت الحجاج کی تعمیر و تاسیس کے لئے منعقدہ مجالس سے ہے جو مولانا محترم کی زندگی کے اور بہت سے عملی کارناموں کی طرح ایک بڑا کارنامہ ہے۔

متاع نقد ونظر میں بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کی تین عظیم الشان تحریکوں دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوہ اور تحریک علی گڑھ کا پس منظر، مقاصد اور خدمات کا اجمالی تذکرہ اوران کی عظیم الشان خدمات کا ایک مرقع آ گیا ہے۔ ان تحریکوں کے چند ارباب کمال اوران کے روشن کارناموں کا تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ اس سے بھی آگے ان لوگوں نے جدوجہد آزادی میں جو سرفروشانہ کوششیں اور قربانیاں دیں، ان کا ذکر جمیل بھی ہے۔ دیوبند، دہلی، بمبئی اور اعظم گڑھ بلکہ اتر پردیش کے متعدد اہل علم اور ارباب کمال اوران کے بنیادی امتیازات وخصوصیات کی تفصیل بھی اس میں آ گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ''متاع نقد ونظر'' میں ملت کی متفرق تاریخ، علماء وصلحا کا تذکرہ اوران کی فکر ونظر کے جلوؤں کے ساتھ خود فاضل مصنف کی فکر ونظر کے تابندہ نقوش آنکھوں کو خیرہ کرتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک مفید اور معلومات افزا کتاب ہے۔ اسی افادیت کے پیش ادبی دائرہ اعظم گڑھ اسے اہتمام سے شائع کر رہا ہے۔ امید ہے مولانائے محترم کی تحریروں کا یہ مجموعہ شوق کی نگاہوں سے پڑھا جائے گا۔

[۸]

نوائے مشتاق

مشتاق احمد مشتاق

اعظم گڑھ میں جن لوگوں نے انتہائی خاموشی کے ساتھ شعروادب کے گیسو سنوارے اور صلہ وستائش کی پرواہ نہیں کی، ان میں ایک ممتاز نام ہمارے بزرگ شاعر جناب مشتاق احمد مشتاقؔ مرحوم کا بھی ہے۔ انہوں نے مدۃ العمر دادِ سخن دی۔ نظمیں لکھیں، خوب صورت غزلیں کہیں، قطعات ورباعیات میں جولانی طبع دکھلائی، تاہم ان کا مجموعہ ''نوائے مشتاق'' ایک مختصر سا مجموعۂ کلام ہے۔ دراصل اعظم گڑھ کے بہت سے شعراء مثلاً اقبال احمد خاں سہیل، مرزا احسان احمد، مولوی محبوب الرحمٰن کلیم، امجد غزنوی وغیرہ کی طرح مشتاق احمد مشتاق بھی کچہری کی نذر ہوئے اور ان کے شعری کمالات پورے طور پر اجاگر نہیں ہوسکے۔ باوجود اس کے انہوں نے جو مجموعہ کلام یادگار چھوڑا ہے وہ ہمارے شعری سرمائے میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے:

ارے کس نے جلا کر گلشن دل خاک کر ڈالا
چھپی بیٹھی ہے شاید برق خانہ زاد خرمن میں

اچھا لگتا ہے آپ کے منہ سے
کہئے! ہاں کہئے! بے وفا کہئے

زندگی کیا ہے اور موت ہے کیا
یہ اسیری ہے وہ رہائی ہے

مشتاق احمد مشتاق مرحوم موضع کوئیلا ڑی بزرگ ضلع اعظم گڑھ میں فروری ۱۹۲۴ء میں پیدا

ہوئے۔ بچپن میں ہی والد کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگئے۔ پرورش و پرداخت اور تعلیم و تربیت ان کے چچا نے کی اور اس لاڈ پیار سے کی کہ برسوں مشتاق صاحب کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہیں۔

۱۷ سال کی عمر میں ورناکیولر فائنل اگزامینیشن پاس کرنے کے بعد گھریلو حالات کے سبب محرری کا پیشہ اختیار کیا اور امجد غزنوی ایڈوکیٹ مرحوم کے جو خود بھی بہت اچھے سخن سنج اور دلدادہ شعر و ادب تھے، اس طرح محرر بنے کہ زندگی بھر ان کے دست راست اور یارِ غار بنے رہے۔ ذوق و مزاج کی ہم آہنگی، ہم مشربی اور فکر و نظر کی یکسانیت، دونوں کے تعلقات پر اس طرح غالب رہی کہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ٹھہرے:

پتہ جو مشتاق کا وہ پوچھیں تو ان سے آہستہ سے یہ کہنا
کہیں وہ امجد کے میکدے میں پڑا سراپا خمار ہوگا

ہے مشتاق سخنور ، خوشہ چینِ خرمنِ امجد
جو اس کی شاعری بھی شاعری معلوم ہوتی ہے

بہت مدت سے وہ میخانۂ امجد میں رہتا ہے
تعجب کیا، اگر مشتاق بھی مے خوار ہوجائے

دونوں کچہری، عدالت، مقدمہ، مسل، تاریخ اور پیشی کی لامتناہی پیچیدگیوں کے باوجود مشقِ سخن کے لیے فرصت نکال ہی لیتے تھے۔ غزنوی صاحب شہر اعظم گڑھ کی بزم شعر و ادب کے روح رواں تھے۔ اکثر شعری نشستیں منعقد کرتے۔ مصرعہ طرح دیتے اور شعراء ان پر طبع آزمائی کرتے۔ ان کی زندگی تک اس بزم سخن میں بڑی تب و تاب تھی، مگر ان کے بعد یہ بزم پھر آراستہ نہ ہو سکی۔ بزم ادب کی محفلوں میں مشتاق احمد مشتاق شاعر ہونے کے باوجود جناب امجد غزنوی کی غزلیں سناتے۔ ان کے خاص انداز اور مترنم لب و لہجہ کی وجہ سے یہ غزلیں غور سے سنی جاتیں۔ کم لوگوں کو معلوم تھا کہ جناب مشتاق بھی طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مرزا احسان احمد جو دبستان شبلی کے

ایک اچھے غزل گو تھے اور جنھوں نے جگر مراد آبادی کو ادبی حلقوں سے متعارف کرایا تھا، ان کی خواہش پر پہلی بار مشتاق احمد مشتاق نے ایک محفل میں اپنا کلام سنایا اور لوگوں کو معلوم ہوا کہ جناب مشتاق احمد مشتاق کا شعری ذوق پختہ اور زبان و بیان پر دست رس ہے اور وہ شاعری کے رموز و آداب سے بخوبی واقف ہیں:

گل چاک جگر چاک گریباں ہوئے آخر
دیکھا نہ گیا نکہت برباد کا عالم

آرزوئے ممات کون کرے
مار ڈالا تیری تمنا نے

تمہیں لو سنبھالو دل مضطرب کو
سنبھلتا نہیں ہے، ہمارے سنبھالے

بڑا فرق ہے نیک اور بد میں
اندھیرے اندھیرے، اجالے اجالے

جناب مشتاق احمد مشتاق فطری شاعر تھے۔ وہ امجد غزنوی سے مشورہ سخن کرتے رہے۔ ابتدا میں چند غزلوں پر اقبال احمد خاں سہیل اور مرزا احسان احمد سے بھی اصلاح لی تھی۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بڑی لطافت، سنجیدگی، متانت اور رکھ رکھاؤ ہے۔ ان کی شاعری ان کے شعور فن کا احساس دلاتی ہے۔ بار بار کے حک و اصلاح کی وجہ سے ان کے اشعار شعری عیوب سے عموماً پاک ہیں اور یہ ان کی شاعری کی ایک بڑی خوبی ہے۔

شاعری کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اچھی شاعری وہ ہے جسے بآسانی نثر کیا جا سکے۔ مشتاق اعظمی کا کلام اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو کھرا اترے گا۔ انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ حمد، نعت، نظم، غزل، قطعات و رباعیات، سہرے وغیرہ اصناف میں ان کی

تخلیقات موجود ہیں اور اس لائق ہیں کہ شوق کی نظروں سے ان کا مطالعہ کیا جائے اور نگاہ و دل کو روشن کیا جائے۔

انہوں نے اگرچہ شاعری کی بساط ایک وسیع کینوس پر رکھی ہے، جس میں مختلف اصناف شامل ہیں، تاہم ان کی اصل جولان گاہ ان کی غزلیہ شاعری ہے، جو دل و دماغ اور ذوق و وجدان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ تاحیات زلف غزل کے اسیر رہے اور غزل کو غزل کے روایتی معیار سے ہٹنے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں سادگی و لطافت کے ساتھ شعریت، نغمگی اور تغزل کے عناصر سے عبارت ہیں۔ حسن و عشق، خال و خط، ہجر و فراق، جدائی و بے قراری، عشوہ طرازی، سنگ دلی، ہمدردی و موانست اور محبوب پر سو سو طرح سے جان چھڑکنے کی ایک ایک ادا اس خوبی سے شعر کے سانچے میں ڈھلی ہے کہ غزل سراپا غزل بن کے سامنے آجاتی ہے۔

مشتاق احمد مشتاق نے ایک طرف قدیم ادبی رویوں کی پاسداری میں خون جگر صرف کیا ہے تو دوسری طرف نئے شعور، نئے جذبات، انسانی فلاح و بہبود، ترقی و خوشحالی اور صالح فکر و خیال کو بھی اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشتاق اعظمی مرحوم نے اپنے مختصر و محدود دیوان میں فکر و خیال کی ایک دنیا آباد کر دی ہے:

کہاں گذر کسی سرکش کا بزم ہستی میں
فلک کو دیکھئے، وہ بھی ہے سر جھکائے ہوئے

زمیں پہ پارسا رہیں ملک تو پارسا کہوں
فلک پہ بے گناہ ہیں تو کون پارسائی ہے

ہے غم پیش خیمہ مسرت کا یارو
اندھیرے میں پوشیدہ جیسے اُجالے

نئے دور کی سب انوکھی ہیں باتیں

اندھیرے میں رکھا مجھے روشنی نے

آزادی کے بعد فرقہ واریت بڑھی تو مشتاق صاحب جیسے نیک دل نے کہا:

کل شانہ بہ شانہ تھے گویا کہ سگے بھائی
اور آج یہ عالم کہ باہم ہے صف آرائی

سہل ممتنع کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

دنیا اک سرائے فانی کوئی آئے کوئی جائے
آنکھ میں اشک نہ آنے پائے گھر کی بات نہ باہر جائے

کیسی دنیا ہے آج کی دنیا جس میں بندے خدا کو بھول گئے
کیوں امید بہشت رکھتے ہو جب حبیب خدا کو بھول گئے
روئی شبنم تو ہنس پڑے غنچے شاید اپنی فنا کو بھول گئے

''نوائے مشتاق'' کا اگر بالتفصیل جائزہ لیا جائے اور فن کی باریکیوں اور نزاکتوں کے لحاظ سے تجزیہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ وہ مرزا احسان احمد اور امجد غزنوی کی غزلیہ شاعری کے درمیان کی ایک نئی آواز ہے، جس میں ندرت نہ سہی لیکن جدت، فنکاری اور صناعی میں کوئی کمی بھی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہر ذوق و مزاج کے لطف ولذت کا سامان'' نوائے مشتاق'' میں موجود ہے۔ افادی ادب میں شمار کیے جانے کے لائق اس مجموعۂ کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اقبال اور اقبال سہیل کے ساتھ جوش، فیض، فراق اور مجاز کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ ان سے استفادہ کیا ہے۔ بعض مقامات پر مذکورہ شعراء کی تقلید کے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ''نوائے مشتاق'' ایک عمدہ اور لائق مطالعہ مجموعۂ کلام ہے۔

مشتاق احمد مشتاق کے لائق فرزند برادر مکرم جناب مولانا سہیل احمد اصلاحی پرنسپل شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڑھ لائق صد ستائش اور قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اپنے والد کے کلام کو ضائع ہونے سے بچایا، بلکہ ارباب ذوق کی ضیافت طبع کا سامان بھی کیا۔

---

[۹]

ظہور قدسی

مولانا عبدالجبار خاں رہبر اعظمیؒ

حضرت مولانا عبدالجبار خان صاحب رہبر اعظمیؒ بلند پایہ عالم دین، اہل قلم، مصنف اور شاعر تھے۔اعلیٰ اخلاق وکردار کے حامل تھے۔مدۃ العمر مذہب وملت اور علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔اپنی نیکی، شرافت، محبت، مروت اور سادگی وشائستگی کی وجہ سے ہر دل عزیز رہے، ۱۷/اکتوبر ۲۰۱۲ءکو وفات پائی۔

مولانا مرحوم ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں خالص پور [نزد جین پور] میں پیدا ہوئے۔ بچپن ہی میں یتیم ہوگئے۔والدہ نے پرورش وپرداخت کی اور تعلیم وتربیت سے آراستہ کیا۔انہوں نے مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کی۔مظہرالعلوم بنارس سے فراغت حاصل کی۔تحصیل علم کے بعد فوج میں مذہبی ملازمت کی اور پوری زندگی اسی عہدہ پر گذاردی۔اپنے فرائض کی ادائیگی اس خوبی سے انجام دی کہ انہیں آج بھی یاد کیا جاتا ہے۔انہوں نے فوج کے اندر اور باہر انتہائی اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ تبلیغ واشاعت اسلام کا فریضہ ادا کیا۔ان کے تدبر اور فہم وفراست کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ہاتھ پر متعدد افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔اس طرح انہوں نے وہ فریضہ انجام دیا جو سلف صالحین کی یاد تازہ کرتا ہے۔

مولانا مرحوم کو مذہبی علوم پر درک حاصل تھا۔خاص طور پر قرآن مجید پر ان کی بڑی عمیق نظر تھی۔انہوں نے قرآن مجید کا جو اردو ترجمہ کیا ہے، جسے راقم نے دیکھا ہے اور جو ابتک شائع نہیں ہوا ہے، وہ ان کی کلام الٰہی پر باریک نظر کا شاہد ہے۔

ایک خطیب کی حیثیت سے بھی ان کے جوہر نمایاں ہوئے، مگر تصنیف وتالیف کے

میدان میں بھی وہ بلند رتبہ تھے۔ان کی تصنیفات وتالیفات ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکیں، ورنہ دنیا دیکھتی کہ وہ کس درجہ بلند اہل قلم تھے۔انہوں نے چند مختصر رسائل کے علاوہ ایک مفصل اور ضخیم سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لکھی ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے اور اس لائق ہے کہ اسے فخر سے پیش کیا جائے۔

مولانا مرحوم پختہ مشق اور بلند پایہ شاعر تھے۔ان کا دیوان ان کی سخن سنجی اور قادر الکلامی کا نمونہ ہے۔انہوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔غزلیں، نظمیں، قطعات وغیرہ سب ان کے دیوان میں موجود ہیں۔قدیم کلاسیکل روایتوں پر مبنی ان کا کلام کیف واثر میں ڈوبا ہوا ہے۔مولانا مرحوم زندگی بھر حب نبویؐ میں سرشار رہے۔خطابت ہو یا تصنیف وتالیف ہر جگہ ان کا یہ وصف نمایاں ہے۔اس کا بہترین نمونہ ان کا رسالہ ''ظہور قدسی'' ہے۔یہ دراصل عاشق رسول مولانا احمد رضا خاں بریلویؒ کے مشہور سلام ''مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام'' پر ان کی تضمین ہے۔حب نبویؐ میں بے خود و سرشار ہوکر کہی گئی یہ تضمین کیف واثر میں اصل سے کم نہیں۔وہی انداز و ادا، وہی رعنائی وزیبائی، وہی بانکپن، وہی لب ولہجہ اور عشق نبویؐ میں وہی سوز وگداز جو اصل سلام کے امتیازات میں شامل ہے۔اس پر متعدد تبصرے گذشتہ صفحات میں آچکے ہیں، لیکن اصل حلاوت تو اس کے مطالعہ ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

قابل مبارکباد ہیں ان کے لائق صاحبزادگان جنہوں نے اپنے والد مرحوم کی تحریروں کی حفاظت واشاعت کا تہیہ کیا ہے۔ضرورت ہے کہ مولانا مرحوم کی تحریروں کو اہتمام سے شائع کیا جائے اور ان کے علمی وادبی کارناموں کو اجاگر کیا جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ وہ کس درجہ بلند عالم واہل قلم تھے اور ان کے کارناموں کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔اس سلسلے کا آغاز ''ظہور قدسی'' سے ہو رہا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے صاحب زادگان کو نیک باپ کا حقیقی وارث اور جانشین بنائے۔

[۱۰]

کلیات رہبر

مولانا عبدالجبار رہبر اعظمیؒ

حضرت مولانا عبدالجبار رہبر اعظمیؒ ایک جامع کمالات شخص تھے۔ ان کا دائرہ کار وسیع اور متنوع ہے۔ قرآن وحدیث، فقہ وفتاویٰ، سیرت وسوانح اور شعر وادب پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ خاص طور پر شعر وادب سے ان کو بڑا والہانہ لگاؤ تھا۔ مدۃ العمر دادِ سخن دی اور شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑا، جسے ان کے لائق فرزند جناب ڈاکٹر محمد ارشد خاں سلیقہ سے مرتب کر کے ''کلیات رہبر'' کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔

رہبر اعظمی کو زبان وبیان پر بڑی قدرت ومہارت حاصل تھی۔ اردو تو اردو عربی وفارسی زبان میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی، جس کا نمونہ ''کلیات رہبر'' میں آپ کو بھی ملے گا۔ حالانکہ ''کلیات رہبر'' اصلاً ان کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں داد دی ہے۔ البتہ ان کی اصل جولان گاہ ان کی غزل گوئی ہے۔ جس میں بڑی سادگی، صفائی اور شائستگی پائی جاتی ہے۔ چھوٹی بڑی ہر طرح کی بحروں میں انھوں نے غزلیں کہی ہیں اور ہر طرح کے موضوعات ان کے قلم رو میں شامل ہیں اور حق تو یہ ہے کہ شاعری کا حق ادا کر دیا ہے۔

رہبر اعظمی کی غزلوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر طبقہ کے ذوق کا سامان ہے۔ روایتی حسن وعشق کی انھوں نے بڑی سچی تصویریں پیش کی ہیں اور اس انداز سے پیش کی ہیں کہ ذوق ووجدان پر اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب وبامراد ہیں۔ امید ہے اہل ذوق ''کلیات رہبر'' سے اپنی تشنگی بجھائیں گے۔

[۱۱]

یادوں کا چمن

از: ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی شخصیت میں بڑا تنوع تھا اور انہوں نے مختلف میدانوں میں مسلمانوں کی خدمت انجام دی۔ تصنیف و تالیف، درس و تدریس، تعلیم و تربیت، سیاست و معاشرت غرض اسلام اور مسلمانوں کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں سے وابستہ رہے اور مسلمانوں کی رہبری و رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ یہ ان کی زندگی کا بڑا روشن، زریں اور تابناک پہلو ہے۔

۱۲ر مئی ۲۰۰۶ء کو انہوں نے وفات پائی تو ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ اہل علم و قلم نے مضامین لکھ کر خراج عقیدت پیش کیا تو بعض شعراء نے نظمیں لکھ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ علمی، ادبی اور ملی تنظیموں نے تعزیتی جلسے کئے اور تعزیتی قراردادیں پیش کیں۔ ان سب کا مشترکہ خیال تھا کہ مولانا مجیب اللہ ندویؒ میں قومی و ملی حمیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی اور وہ ملت کے ایک عظیم رہبر و قائد تھے۔ مولانا مرحوم کو جس بات کا سب سے زیادہ دکھ تھا وہ یہ کہ مسلمان روز بروز زوال سے دوچار ہو رہے ہیں اور ان کا ہر قدم زوال کی طرف اٹھ رہا ہے۔ چنانچہ وہ اسی غم سے ہمیشہ رنجیدہ اور اسی کے تدارک کے لئے مدۃ العمر کوشاں رہے اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو دارالمصنّفین کی رفاقت کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا اس کے پس پشت ملت کو تباہی سے بچانے کا جذبہ کارفرما تھا اور اسی جذبے نے انہیں ہمیشہ رواں دواں رکھا اور وہ ملت کے ہر آڑے موقع پر سینہ سپر ہو جاتے۔ شاہ بانو کیس ہو یا بابری مسجد کا قضیہ، اردو کا مسئلہ ہو یا یوپی میں جبری تعلیم، مدارس و مکاتب کے خاتمے کی سازشیں ہوں یا مسلمانوں کے تشخص کا بقا۔ ملت کے ہر حساس مسئلے میں وہ بے خطر کود پڑتے اور اپنی سب صلاحیتیں لگا دیتے۔ ان کے انہی اوصاف و امتیازات نے انہیں ہر

دلعزیزی کے ساتھ اپنے عہد میں ممتاز رکھا اور آج بھی وہ ہماری روشن تاریخ کے ہیرو ہیں۔

حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ کی گونا گونی کا تقاضا تھا کہ ان کی حیات وخدمات کا مفصل جائزہ لیا جائے۔ کتابیں لکھی جائیں۔ سمینار کئے جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ دکھا جائے کہ ان کی انفرادیت اور عظمت کیا ہے۔ انہوں نے جو علمی وادبی اور تصنیفی کارنامے انجام دئے، ان کی حیثیت اور قدر و قیمت کیا ہے۔ انہوں نے جن علمی، تعلیمی اور ملی تنظیموں کو قائم کیا یا وہ جن جماعتوں سے وابستہ رہے، اس میں انہیں کس قدر کامیابی ملی اور انہوں نے کیا خدمات انجام دیں، چنانچہ ان کی وفات کے بعد متعدد اہل قلم کے مضامین اخبارات ورسائل میں نکلے اور شوق کی نظروں سے پڑھے گئے، جن میں یہ اعتراف کیا گیا کہ مولانا مرحوم جیسی شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر جو لوگ حضرۃ الاستاذ سے قریب سے واقف ہیں وہ اس بات کا اقرار کریں گے کہ جو کچھ لکھا گیا ان کی سیرت وشخصیت کی محض ایک سرسری جھلک تھی۔ اس لئے ضرور ہے کہ ان کے افکار وخیالات جو انہوں نے اپنی گراں قدر تصنیفات اور مضامین ومقالات میں پیش کئے ہیں ان کا مطالعہ اور تجزیہ پیش کیا جائے۔

چونکہ حضرۃ الاستاذ مرحوم نے طویل عمر پائی اور متنوع کارنامے انجام دئے ہیں۔ اس لئے ان کی سوانح لکھنے میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جو ان کے قریب تر رہا ہو اور ان کے فکر و خیال سے بخوبی واقف ہو۔ غالباً اسی بنیاد پر مولانا مرحوم نے اپنی سوانح کے لئے پروفیسر مشیر الحق مرحوم کا انتخاب کیا تھا، لیکن افسوس کہ خود مولانا کو ان کا مرثیہ لکھنا پڑا۔ اس لحاظ سے اگر کوئی دوسرا شخص اس کا مستحق تھا تو وہ ہمارے کرم فرما ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ العالی کی ذات گرامی ہے۔ حضرت الاستاذ کی گود میں ان کا عہد طفولیت گذرا ہے۔ ان سے شرف تلمذ بھی حاصل ہے۔ مولانا مرحوم کی آخری سانس تک ان کے بیچ کے تعلقات رہے اور وہ مولانا مرحوم، جامعۃ الرشاد اور ماہنامہ الرشاد کی تاریخ کے دیرینہ راز دار ہیں۔ اس لئے حق تھا کہ وہ مولانا مرحوم کی سوانح پر قلم اٹھاتے۔ چنانچہ انہوں نے یہ حق اس طرح ادا کیا کہ ۷ ارقسطوں میں ''یادوں کا چمن'' کے عنوان سے ماہنامہ ''الرشاد'' میں ایک سلسلہ مضامین لکھا۔ جس میں مولانا مرحوم کی زندگی کا ایک جامع مرقع سما گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی دبستان شبلی کے نامور اہل قلم اور صاحب اسلوب ادیب وانشا پرداز ہیں۔ان کے قلم سے متعدد محققانہ مقالات اور عمدہ کتابیں نکل کر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ان میں تبع تابعین، علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وخدمات، ایمان ویقین کی باتیں، ایمان کے تابندہ نقوش اور تازہ تصنیف حقیقت ایمان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زیر نظر کتاب ''یادوں کا چمن'' بھی ان کی ایک اہم کاوش ہے۔اس میں انہوں نے یادوں کے چمن سے ہر طرح کے پھولوں کا انتخاب کر کے ایک نئی چمن بندی کی ہے۔یقین ہے اس سے مرحوم حضرۃ الاستاذ کی عظیم شخصیت اور افکار وخیالات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔اس کاوش کے لئے ہم انہیں دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت بخشے۔

[۱۲]

حقیقت ایمان

ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی

بلاشبہ اسلام کے پانچ ستونوں میں ایمان (کلمۂ توحید) کو بنیادی واوّلین حیثیت حاصل ہے۔ دل سے اللہ کی ذات وصفات پر پختہ یقین کا نام ایمان ہے۔ یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ نے اس پوری کائنات کو صرف ایک کلمۂ کن سے پیدا فرمایا ہے اور وہی بلاشرکت غیرے اس کائنات کے نظام کو محض اپنے حکم وارادہ سے چلا رہا ہے۔ خالق وہی، مالک وہی، رازق وہی، سب کچھ وہی۔ یہ ہے حقیقتِ ایمان ہے اور واقعہ یہ ہے کہ قلب انسانی میں یہ یقین جس اعلیٰ درجہ کا راسخ ہوگا، اُسی کے مطابق باقی ارکان اربعہ [نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ] میں روح، قوت اور جان پیدا ہوگی اور اسی قدر احکام الٰہی پر عمل کرنا آسان ہو جائے گا۔

سب کو معلوم ہے کہ آغاز اسلام کی تیرہ سالہ مکی زندگی میں کسی اعمال واحکام کا وجود نہ تھا [احکام کا نزول سنہ دو ہجری سے شروع ہوا ہے۔] بلکہ ایک طویل مدت تک صحابۂ کرامؓ کے دلوں پر صرف رسوخ ایمان کی محنت ہوتی رہی، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور عظمت و کبریائی ان مردان حق آ گاہؓ کے رگ وپے اور فشار خون میں اس طرح رچ بس گئی تھی کہ اس راہ کے سارے کانٹے اور مصائب اُن کو لالہ وگل کی طرح راحت افزا اور فرحت بخش محسوس ہوتے تھے اور کفار قریش کی رونگٹے کھڑے کردینے والی اذیت رسانیوں میں بھی اُن کی زبانوں پر ''احد احد'' کا وظیفہ جاری رہتا تھا۔

اہل نظر سے مخفی نہیں کہ ابتدائے اسلام میں اصحابؓ رسول کو اپنے ایمان وعقیدہ کے تحفظ کی خاطر تاریخ انسانی کے ہولناک ترین ابتلاء وآزمائش کی موجِ خون سے گذرنا پڑا، لیکن تیرہ

سال کی ایمانی محنت نے ان حضرات کو عالم کفر کے تمام تر ظلم وتشدد اور استبداد و جبروتیت کے مدمقابل صلابت ایمانی کا ہمالیہ بنا دیا تھا۔ سیدنا بلال ابن ابی رباحؓ، خباب ابن الارتؓ، عمار بن یاسرؓ، اُن کے بوڑھے باپ یاسرؓ اور اسلام کی خاطر شہادت کا پہلا رتبہ بلند حاصل کرنے والی ان کی بوڑھی والدہ حضرت سُمیہؓ، ابوذرغفاریؓ، مصعب بن عمیرؓ اور صہیب رومیؓ ایسے ہی ابطال اسلام کے چند نام ہیں جو رزم گاہ کفر کی بھٹیوں میں تپ کر ایسے کندن بن گئے تھے کہ "رضی اللہ عنھم" کا ابدی تمغۂ امتیاز اُن کے سینوں پر آویزاں ہو گیا اور اب:

خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

پھر چند ہی سالوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان منتخب روزگار رجال شارانِ اسلام کی جانی و مالی ہر طرح کی قربانیوں کو شرف قبولیت عطا فرما کر آخرت سے قبل دنیا ہی میں انعام واکرام سے نوازنا شروع کر دیا۔ چنانچہ عہد فاروقی میں کثرت فتوحات نے مسجد نبویؐ کے صحن میں اموالِ غنائم کے انبار لگا دیے، لیکن یہ پاک طینت حضراتؓ، جنھوں نے عمرؓ کا بیشتر حصہ فقر وفاقہ اور شدید تنگ دستی کی حالت میں گزار رکھا تھا، یہ خوشحالی اور مادی فراوانی دیکھ کر فرطِ شادمانی سے نہال ہونے کے بجائے زاروقطار رونے لگے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ہماری پُراخلاص قربانیوں کا حساب آخرت ابدی میں بے حساب دینے کے بجائے اسی فانی دنیا میں بے باق کرنے کا فیصلہ فرما لیا ہے اور اب آخرت میں ہم خالی ہاتھ رہ جائیں گے۔ اللہ اکبر

سیدنا ابو ہریرہؓ جو کبھی غایتِ فقر وفاقہ اور کئی کئی دن کھانا نصیب نہ ہونے کے باعث اکثر بے ہوش ہو جایا کرتے تھے۔ اچھے دن آنے پر جب اُن کو اچھی رہائش، اچھا کھانا اور اچھا لباس نصیب ہوا اور سب سے زیادہ یہ کہ جس عورت کی وہ غلامی کرتے تھے اللہ کی قدرت سے وہی اُن کی شریکِ حیات بن گئی تو وہ اس پر کسی استکبار کے بجائے شب کی تاریکیوں میں پُرانے دنوں کو یاد کر کے اللہ کا شکر ادا کرتے اور اتنا روتے، اتنا روتے کہ محلّہ والوں کو ترس آنے لگتا تھا۔

سیدنا مصعب بن عمیرؓ کی پرورش ایک خوشحال گھرانے میں بڑے ناز ونعمت کے ساتھ ہوئی تھی۔ نوجوانی میں اُن کی والدہ دو دو سو درہم کا کرتا اپنے لاڈلے کو پہناتی تھیں۔ مشرف باسلام ہوئے تو گھر والوں کے تشدد سے جان بچا کر نازوں بھری زندگی کو لات مار دی اور دامنِ رسالت

مآب سے وابستہ ہو گئے۔غزوۂ احد میں شریک ہو کر جام شہادت نوش کیا۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا سر اپنے زانوئے مبارک پر رکھا اور دیر تک اُن کے عہد نو جوانی کی خوشحال زندگی کا ذکر فرماتے رہے۔ ایسے جلیل القدر صحابیؓ کو تدفین کے وقت پورا کفن دستیاب نہ ہو سکا۔ صرف ایک ناکافی چادر تھی۔ جس سے سر ڈھانپ کر پیروں پر گھاس ڈال دی گئی۔

جب سیدنا بلالؓ کو گردن میں رسی باندھ کر جلتے ریگستان میں گھسیٹا جاتا تو اس سے اُن کا نشہ ایمان کم ہونے کے بجائے دوآتشہ ہو جایا کرتا تھا۔ بلاشبہ اس صلابتِ ایمانی کے انعام میں اُن کو مسجد نبوی کا مؤذن ہونے کا شرف عطا کیا گیا۔ عشق رسول سے سرشار اور سنت نبوی کے دیوانے سیدنا ابوذر غفاریؓ اعلائے کلمۂ توحید کی پاداش میں کئی بار عین حرم کعبہ میں نیم جاں کر دیے گئے۔ اُن کی اس جاں باز قوت ایمانی اور جرأتِ حق گوئی کو اللہ تعالیٰ نے یوں شرف قبول عطا فرمایا کہ بقول سیدنا جبریل علیہ السلام ''ابوذرؓ زمین سے زیادہ آسمانی مخلوق (فرشتوں) میں اپنے نام کے ساتھ معروف ہیں۔''

حضرت صہیب رومیؓ مکہ کے ایک کامیاب تاجر تھے۔ نہایت شاندار رہائش، پُر راحت وشوکت زندگی، گھر میں نوکر چاکر اور باندیوں کی کثرت تھی، لیکن رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد وہ کفار مکہ کی ساری رکاوٹیں دور کرتے ہوئے صہبائے عشق رسول میں صرف بدن پر کپڑوں کے ساتھ دیوانہ وار مدینہ کی طرف دوڑ پڑے اور مکہ کے سارے مادی وسائل کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اُس وقت رسول کائنات صلی اللہ علیہ وسلم مسجد قبا میں تشریف فرما تھے۔ وہاں صہیبؓ کے پہنچنے سے قبل ہی اُن کی شان میں وحی آسمانی کا نزول ہو چکا تھا۔ ''رضائے الٰہی کی خاطر تم نے اپنی جان کا سودا تو بہت خوب کیا۔'' (**ومن الناس من يشری نفسه ابتغاء مرضات اللّٰه**)

جب کفار قریش کے تمام تر دردناک مظالم اور خونچکاں چیرہ دستیاں اصحاب رسولؐ کی ایمانی قوت اور نشہ توحید کو توڑنے میں ناکام رہیں اور وہ ابتلاء ومحن کی ہر طوفانی موج سے سرخ رُو گزر گئے تو پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو " اٰمنوا کمآ اٰمن الناس" کے فرمان سے تاقیامت ''آئیڈیل مومن'' کی سند اعزاز عطا فرما دی اور کائنات کے پورے نظام ہواؤں، سمندروں، وحشت ناک

جنگلوں اور وحشی درندوں سب کو اُن کے لئے مسخر کر دیا۔ غزوۂ بدر میں نصرتِ الٰہی کے جس معجزہ کا آغاز ہوا تھا اُس کا سلسلہ جنگ قادسیہ اور معرکہ جلولاء کے بعد تک قائم رہا۔

چنانچہ حضرت عقبہ بن نافعؓ نے شمالی افریقہ کی مہمات کے دوران تیونس پہنچ کر وحشی درندوں سے بھرے ایک وسیع جنگل کو کاٹ کر وہاں ایک فوجی چھاؤنی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو (اٹھارہ صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں) اُن کی ایک صدائے ایمانی پر پورا جنگل محیرالعقول طور پر دیکھتے دیکھتے ہر قسم کے وحوش سے خالی ہو گیا۔ مؤرخ بلاذری اور طبری کے قلم اس تاریخی واقعہ کی منظرکشی رقم کرنے میں وفور جذبات سے بے قابو ہو گئے ہیں۔ اسی طرح جنگ فارس میں جب ایرانیوں نے عساکر اسلامیہ کی پیش قدمی روکنے کے لئے دریائے فرات کا پُل توڑ دیا تو امیرالمومنین حضرت عمرؓ کی ہدایت پر صحابۂ کرامؓ نے دریا کی سطح آب پر اپنے گھوڑے اس طرح دوڑا دیے کہ اُن کے سُموں پر پانی کا نشان تک موجود نہ تھا۔ اللہ اکبر۔ یہ ہے حقیقت ایمان۔

سطور بالا میں صحابۂ کرامؓ کی صلابت ایمانی اور اس راہ کی قربانیوں کے یہ چند واقعات راقم کی نوک قلم پر برجستہ آ گئے ہیں۔ ورنہ اسلامی تاریخ کے مستند مآخذ میں اس طرح کے بصیرت افروز اور سبق آموز سیکڑوں واقعات بکھرے ملتے ہیں۔ آج کے مادی اور مغربی تہذیب کی یلغار کے دور میں ایمان ویقین کی قوت ضعف اور وہن کا شکار ہو کر رہ گئی ہے، ہر طرف ''دنیا کی محبت اور موت سے کراہیت'' کا دور دورہ ہے۔ جس کے نتیجہ میں آج دنیا کے ڈھائی سو کروڑ مسلمان ''غثاء السیل'' بن کر رہ گئے ہیں۔ اس لئے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ایمان ویقین کے روحانی واقعات وحکایات کی بازخوانی سے ایمان میں تازگی پیدا کی جاتی رہے۔

بلاشبہ میرے محترم بزرگ دوست مولانا محمد نعیم صدیقی صاحب ہمارے صد شکر وتبریک کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے وقت کی اس اہم ضرورت کے پیش نظر عربی مصادر تاریخ سے اردو داں طبقہ کے لئے منتخب ایمان افروز واقعات وحکایات کو سلیقہ کے ساتھ مرتب ومدون کر دیا ہے۔ راقم الحروف پوری دیانت داری اور صدق دلی سے اعتراف کرتا ہے کہ ان واقعات کے مطالعہ نے ہمیشہ راقم کی آنکھوں کو اشک آلود کیا ہے۔ محترمی نعیم صاحب کے اسلوب نگارش کے بارے میں راقم اپنی طرف سے کسی اظہار رائے کے بجائے مولانا علی میاں مرحوم اور مرشدی مولانا مجیب اللہ

ندویؒ جیسے اکابر کی متفقہ شہادت نقل کرنے پر اکتفا کرتا ہے کہ: نعیم صدیقی کا انداز تحریر دبستان شبلی کے نثر نگاروں کی طرح سنجیدہ اور شستہ وشگفتہ ہے۔'' راقم اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہے کہ ایمانیات کے موضوع پر نعیم صاحب کی دیگر تحریروں کی طرح پیشِ نظر کتاب بھی نفع بخش اور مقبول عام ہو۔ آمین

[۱۳]

جنبش لب

ڈاکٹرفخرالاسلام اعظمی

شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کے سابق صدر شعبہ عربی ڈاکٹرفخرالاسلام نازش اعظمی [پیدائش: ۱۵/اکتوبر۱۹۴۶ء] نے اردو کی تین نسلوں کی ذہنی آبیاری کی ہے۔انہوں نے طلبہ کے لئے جوادب پیش کیا ہے اس سے سیکڑوں نہیں ہزاروں نے اپنی تشنگی بجھائی ہے۔ان کی خدمات کا دائرہ شبلی نیشنل کالج کی فضاؤں تک محدود نہیں بلکہ ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیوں کے طلبہ نے ان کے چشمہ فیض سے سیرابی حاصل کی ہے۔ادب نما، ادبی زاویے، شعور فن اور نہ جانے کیسے کیسے گراں مایہ خزینہ ادب انہوں نے پیش کئے۔صلہ کی تمنا نہ ستائش کی آرزو، نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی ہیں اوراس طرح دار شخصیت میں بڑی تہہ داری اور بوقلمونی ہے جس کا اندازہ ان کے متنوع ادبی کارناموں کی طرفگی سے لگایا جاسکتا ہے۔جب کبھی شبلی نیشنل کالج کی ادبی تاریخ لکھی جائے گی تو ان کی ادبی کاوشوں کا ذکر سنہرے حرفوں میں کیا جائے گا۔اوراعظم گڑھ کی ادبی تاریخ تو ان کے شعروادب کے ذکر کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ہمیں بھی فخر ہے کہ ہم ایسے میر کارواں کی گرد راہ ہیں۔

ادبی دنیا شاید واقف نہیں کہ ڈاکٹرفخرالاسلام نازش اعظمی صاحب بلند رتبہ ادیب اور ناقد ہی نہیں خوش فکر اور قادرالکلام شاعر بھی ہیں۔خاموش طبع شاعر نے اپنی تخلیقات کو اپنے اور اپنے کالج کی فضا تک محدود رکھا، جس کی وجہ سے ان کے کلام کی خوشبو سے زمانہ معطر نہ ہوسکا۔لیکن ان کی شمیم انگیزیاں اور جولانی طبع کا دائرہ بے حد وسیع اور متنوع ہے اوراس میں فکر وفن کی ایک دنیا آباد ہے۔ان کے کلام میں اصولی محاسن کے ساتھ فکری اور خاص طور پر جمالیاتی عناصر کی بہتات

نے بے حد حسن پیدا کر دیا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان کی نظموں میں زیادہ جاذبیت اور رعنائی ہے یا غزلوں میں۔واقعہ یہ ہے کہ دریا کا بہاؤ کہیں کم نہیں ہوتا۔ انہوں نے ایسی نرم، شیریں اور مترنم زبان استعمال کی ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ایک آبشار آہستہ خرامی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہے اور راہ کے شجر و حجر سب کو سرسبز و شاداب کرتا جا رہا ہے۔غرض بلا کی ادبیت، شیرینی اور شگفتگی ان کے کلام کا حصہ ہے۔ ایسے ایسے خوبصورت اور دلآویز استعارے اور تشبیہات ہیں کہ ذوق و وجدان وجد میں آ جائیں۔ اشعار کی رومان پرور فضا نے شعریت اور تغزل میں بلا کی کشش پیدا کر دی ہے۔صداقت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں روایت اور جدت کا بڑا حسین اور خوب صورت امتزاج پایا جاتا ہے اور کہیں کہیں فکری و فلسفیانہ بحث مثلاً خودی و بےخودی کے جذبات ایسے سادہ لفظوں میں آ گئے ہیں کہ بے ساختہ زبان داد و تحسین سے پرشور ہو جاتی ہے۔

مدت ہوئی نازش سے ملا تھا کہیں لیکن
وہ کون ہے کیسا ہے کھڑا سوچ رہا ہوں

یہ مجموعہ کلام فکر کی بلندی اور جذبات و احساسات کے ترفع کے ساتھ شیریں بیانی اور لطافت حسن کی وجہ سے اپنے اندر بڑی اثر آفرینی رکھتا ہے۔حسن ادا کے ساتھ جدت ادا نے شعری حسن کو دوبالا کر دیا ہے۔یہی نہیں غزلوں میں حسن و عشق کی فضا پورے طور پر موجود ہے، مگر صرف فضا اور شعری ماحول، شاعر واردات قلبی کے بیان کرنے میں زمانہ کا کرب اور معاشرے کی زخمی روح اور درد کی لذت اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ اس کے خیالات قاری کو اپنی زندگی کا حصہ محسوس ہوتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تیری خواہش کچھ تھی لیکن پھر بھی ہم زندہ رہے
زندگی! اے زندگی! ہم تجھ سے شرمندہ رہے

زہر پی کر بانٹتے ہیں جو زمانے کو مٹھاس
ہم اسی دنیا کے اے نازش نمائندہ رہے

کسے نصیب محبت کی راہ کے کانٹے
چبھیں جو پاؤں میں کانٹے تو آہ مت کرنا

کون دے گا بھلا قاتل کو دعا میرے بعد
کند ہو جائے گی شمشیر جفا میرے بعد

کسی دل کو ہرگز دکھایا نہ جائے
یہ کعبہ ہے کعبہ کو ڈھایا نہ جائے

شاعر اگر چہ کہیں کہیں ناصح اور واعظ کی شکل میں سامنے آتا ہے، تاہم شاعر کی فکری بلندی ہر جگہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ نصیحتیں اور وصیتیں بھی کرتا ہے تو دوسری دنیا کی مخلوق نہیں بنتا بلکہ اخوت اور مساوات کے ساتھ خود معاشرتی زندگی کا علمبردار رہتا ہے۔ اس کا اندازہ غزلوں کے متعدد اشعار سے ہوتا ہے۔ بلکہ غزلوں میں شاعر واردات قلبی کو روایتی انداز بیان دینے کے باوجود اظہار فکر میں وسعت قلبی اور وسعت نظری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اور سیدھے، سچے اور سادہ الفاظ میں اظہار خیال کرتا ہے۔ دیکھیں سہل ممتنع میں کیسی پیاری پیاری باتیں آ گئی ہیں۔ فرماتے ہیں:

ضمیر و ذہن کی دولت تباہ مت کرنا
جو بے ضمیر ہیں ان سے نباہ مت کرنا

ان شیش محلوں میں لوگ رہتے ہیں پتھر کے
ان شیش محلوں پہ ہرگز نگاہ مت کرنا

سلامت رہے گا خود اپنا نشیمن
کسی کا نشیمن جلایا نہ جائے

یہ اپنے شہیدوں کی دھرتی ہے نازش
یہاں سے کہیں اور جایا نہ جائے

شاعر اپنے قاری کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ حسن ادب کا قائل اور اور رعنائی فن کا عاشق ہے۔سوسال کی شعری روایتیں اس کے حصہ میں آئی ہیں،جنہیں وہ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ اس کے خیالات دل کو چھوجاتے ہیں اور دماغ کو متاثر کر دیتے ہیں۔

چھاؤں جس کو پڑوسیوں کی ملے
پیڑ ایسا مکان میں رکھنا

تیرے دشمن بھی دوست ہوجائیں
وہ حلاوت زبان میں رکھنا

ایک روشن سی روح کی تصویر
جسم کے سائبان میں رکھنا

وہ میرے پاس سے گذرا تو یہ محسوس ہوا
پاس سے گذرا ہے خوشبو بھرا جھونکا کوئی

زباں چپ رہے گی تو بولیں گی آنکھیں
محبت کا جذبہ چھپایا نہ جائے

سارا قصور اپنا ہوا کی خطا نہیں
تاریکیوں میں ہم نے دئے کیوں جلائے ہیں

ڈاکٹر صاحب کی غزلوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ جہاں ان کے خیالات میں شستگی

شائستگی اور برجستگی پائی جاتی ہے، وہیں تسلسل اور نظم وضبط اور رکھ رکھاؤ بھی پایا جاتا ہے اور وہ غزل کے اشعار سے وہ سماں باندھ دیتے ہیں جو نظموں سے پیدا ہوتا ہے، تاہم غزل کے روایتی اوصاف پر حرف بھی نہیں آنے دیتے۔ مثلاً:

ایک بھی ذرہ نہ صحرا کا پیاسا ہوتا
اپنے ہاتھوں میں اگر وقت کا دریا ہوتا

شوق نظارہ خلاؤں میں بھٹکتا ہی نہیں
اس سے پہلے بھی جو میں نے تجھے دیکھا ہوتا

ٹوٹ جاتے ہیں بہت جلد خوشی کے رشتے
جاوداں ہوتا اگر درد کا رشتہ ہوتا

ذرہ، صحرا، پیاسا، دریا، شوق نظارہ، بھٹکنا اور درد کا رشتہ، اگر ان میں نہ صرف الفاظ بلکہ فکر وشعور کی ہم آہنگی سے کوئی معنی ومفہوم تلاش کیا جائے تو شاعر کے محبت آمیز اور محبت آموز تصورات، جذبات واحساسات، ذہنی کیفیت، زمانہ کے سرد وگرم، حالات کی ناسازگاری وغیرہ کیفیات اجاگر ہوتی ہیں اور یہ کمال شاعری ہے کہ اپنے محسوسات کو شعر میں اس طرح ڈھالا جائے کہ ان میں ایک زیریں لہر موجود ہو جو سب کو باہم مربوط کئے ہوئے ہو اور جو کہیں صداقت اور سچائی کی علمبردار ہو تو کہیں عشق بے محابا کو راہ راست دکھائے۔ کہیں معاشرے پر خندہ زن ہو تو کہیں شعور ودانش کی جوت جگائے۔ غرض اس مجموعہ کلام میں شاعری سے زیادہ ساحری سے کام لیا گیا ہے اور شاعری میں یہ قدریں اسی وقت پیدا ہوتی ہیں جب فن کو فن کے سانچے میں ڈھالا جائے اور تصورات میں خالص انس ومحبت کے جذبات پیوست ہوں۔ البتہ شاعر کے خیالات میں جو کہیں کہیں شوخی اور کسی قدر برجستگی آ گئی ہے، وہ دراصل حالات کی ستم ظریفی کا نتیجہ ہے۔

زمانہ سنگ سمجھتا ہے مجھ کو اے نازش
مگر وہ سنگ کہ شیشہ مری تلاش میں ہے

نہ جانے کتنے ہی فتنوں کو کر دیا بیدار
وہ دیکھنے میں فرشتہ دکھائی دیتا ہے

بے چہرگی کا کرب کبھی بے حسی کا کرب
مت پوچھ ہم نشیں میری اس زندگی کا کرب

مایوسیوں سے بچ کے گذر جانا چاہئے
خواہش ہو زندگی تو مر جانا چاہئے

اس مجموعہ کلام کی غزلوں میں سادگی و شائستگی شاعر کی سادہ اور پاکیزہ زندگی کی اگر نمائندگی کرتے ہیں تو سیکڑوں اشعار ان کی فکر کی بلندی، عظمت، اعلیٰ اخلاق اور اوصاف حمیدہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جس طرح شاعر کا دل پاکیزہ اور صاف وشفاف ہے، اسی طرح ان کی غزلیں بھی آئینہ در آئینہ ہیں۔ وہ زمانہ کی ہر روش اور ہر راہ کے اختیار کرنے کے قائل نہیں۔ وہ نئے زمانہ کو نیا مزاج، جس کا خمیر شرافت، مروت اور انسانیت سے تعمیر ہوا ہے دینا چاہتے ہیں:

یہ کیا کہ جیسا زمانہ ہو ویسے ہو جائیں
ہمیں زمانے کو اپنا مزاج دینا ہے

دکھے نہ دل کوئی ، ہر دل خدا کی بستی ہے
ہو دل کسی کا بھی ہر دل کا احترام کریں

اپنے لہو کو پی کے بجھائیں گے اپنی پیاس
اے تشنگی ! نہ مانیں گے تجھ سے کبھی شکست

شاعر ہر دل کو خدا کی بستی قرار دینے کے باوجود زمانہ کی نارسائیوں کا شکوہ نہیں کرتا بلکہ

اپنے عہد کے مسائل ومشکلات کو غزل کی زبان میں استعارات کے جلو میں اور الفاظ کی کہکشاں میں اس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے کہ اپنے عہد کے مسائل کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے، آنے والے حوادث اور طوفانوں کا پتہ بھی دے دیتا ہے۔ اس سے شاعر کی مفکرانہ شخصیت اور اس کے انقلاب آفریں جذبات کا پرتو بھی صاف نظر آتا ہے۔

اس مجموعہ میں نظمیں پہلے ہیں اور غزلیں بعد میں اور آخر میں متفرقات، لیکن میں نے شعوری طور پر نظموں کا ذکر بعد میں کیا ہے، اس لئے کہ شاعر نے روایتی انداز اختیار کرتے ہوئے انہیں پہلے جگہ دی ہے، تاہم ان کا مقام غزلوں کے بعد ہی ہے، لیکن اس میں چند ایسی نظمیں شامل ہیں جو ہمیں خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد دلاتی ہیں۔ وہی انداز، وہی لب ولہجہ اور وہی اسلوب، رفتار میں بھی گفتار میں بھی۔ مثلاً اداس نسلوں کے نام، آتش کدہ احساس وغیرہ۔ البتہ دو ایک نظمیں شاعر نے ایسی کہہ دی ہیں کہ وہ اپنے زمانہ سے بہت آگے ہیں۔ مثلاً پیدا نہ ہو سکنے والی نسل کے نام اور بوڑھا پیڑ وغیرہ۔ ان نظموں میں آفاقیت کے عناصر جاگزیں ہیں۔ ایک نظم بعنوان ''ایک سوال'' کے چند متفرق بند ملاحظہ ہوں:

کون سا شعر بتاؤ میں تری نذر کروں
پیار کا گیت ہو یا درد کا نغمہ ہو
قصہ وصل ہو یا درد کا افسانہ ہو
حسن کے ذکر سے ماحول منور کر دوں
دل کے ہر درد کو لفظوں میں اجاگر کردوں
کون سا شعر بتاؤ میں تری نذر کروں
عشق کی آنکھوں میں روشن ہیں ہوس کی شمعیں
ہیں جہاں گھات میں سیتا کے ہزاروں راون
عصمت سلمیٰ و رادھا ہے جہاں خطرے میں
حسن بک جاتا ہے ہر روز سیہ خانوں میں
خون معصوم چھلک جاتا ہے پیمانوں میں

کون سا شعر بتاؤ میں تری نذر کروں
پیار کے گیت سناؤں تو سناؤں کیسے
دل کے زخموں کو چھپاؤں تو چھپاؤں کیسے

اس مجموعہ کا آغاز حمد و نعت سے ہوا ہے۔ شاعر نے وحدانیت اور خدا کی حاکمیت بیان کرنے کے بعد شہنشاہ کونینؐ کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر پیش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جس جدت ادا کے ساتھ انہوں نے سرکار دو عالمؐ کی مدح کی ہے، اگر وہ اس میدان میں تسلسل کے ساتھ داد سخن دیتے تو عکس عقیدت کے نئے نئے جلوے نگاہوں میں ہوتے اور نعتیہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوتا، تاہم جو نعت درج مجموعہ ہے اس میں وارفتگی کا یہ عالم ہے کہ:

مرکز فکر و نظر ذات گرامی تیری
دل کا ہر جذبہ تیرے نام رسول عربیؐ

ہم ترے ہو کے زمانے میں کسی کے نہ ہوئے
اپنے سر پہ ہے یہ الزام رسول عربیؐ

شاعر کا مطالعہ بے حد وسیع ہے۔ اردو کے ممتاز قدیم شعراء میر و غالب اور اقبال کے ساتھ ترقی پسندوں فیض، فراق، جوش اور مجاز کا کلام ان کے پیش نظر رہا ہے۔ جدیدیت پسندوں میں خاص طور پر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کا انہوں نے بڑی گہرائی اور گیرائی سے نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ اخذ و استفادہ بھی کیا ہے۔ اس لئے روایت اور جدت کی آمیزش سے ان کے کلام میں ایک نئی فضا اور ایک نئی روح پیدا ہو گئی ہے جو یقینی طور پر شاعر کی اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی عظمت کا پتہ دیتی ہے اور قاری کو ایک نئے جہاں سے آشنا کرتی ہے۔ یہ منفرد مجموعہ کلام یقینی طور پر ہمارے شعر و ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

[۱۴]

توشۂ آخرت

ڈاکٹر محمد یونس غازی

ڈاکٹر محمد یونس غازی صاحب ایک جامع کمال شخص ہیں۔شعروادب کی تدریس میں زندگی گذاری ہے اور علم وفن کے مختلف اور متنوع میدانوں میں خدمات انجام دی ہیں۔ایک ادیب، شاعر، نقاداور محقق ومصنف کی حیثیت سے وہ اپنے ہم عصروں میں اعلانیہ ممتاز نظر آتے ہیں۔وہ جس کوچہ سے بھی گذرے ہیں نقش کف پا چھوڑ گئے ہیں اور جس دربار شعروادب کا رخ کیا ہے اسے گل وگلزار بنادیا ہے۔میری اس بات کی وہ تمام اہل علم اورارباب فہم ودانش شہادت دیں گے جنھوں نے ڈاکٹر یونس غازی کی کتابیں اوران کی تخلیقات کا مطالعہ وتجزیہ کیا ہے۔''انجمن ترقی اردو ہند کی تاریخ اور خدمات'' پران کی کتاب تحقیق وتدقیق کا ایک نمونہ ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی پران کی کتاب اپنے موضوع پر غالباً پہلی کتاب ہے اوراپنے اسلوب نگارش کے لحاظ سے تو قابل ذکر ہے ہی جمع وتدوین اور تلاش وجستجو کے لحاظ سے بھی ایک منفرد کتاب ہے۔ بلکہ یہ دونوں کتابیں سہل انگاری کے اس دور میں محنت وتحقیق ،اور تلاش وتفحص سے لکھی جانے والی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں اور ہمارے ذخیرۂ علم وادب میں قیمتی اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

تحقیق ایک انتہائی صبر آزما عمل ہے۔عجلت پسندی اورفوری تاثر کسی بڑی سے بڑی تحقیق کی حیثیت کم کردیتا ہے۔ڈاکٹر یونس غازی اس میدان کے بھی غازی ہیں۔انتہائی صبروتحمل، خاموشی اوراستقامت کے ساتھ انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کی تاریخ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اس کے ترجمان رسالہ تماہی''ہندوستانی''اور ماہنامہ الناظر لکھنو کی تاریخ، اشاریہ، عہد بہ عہد ارتقا اوراس کے تمام نشیب وفراز کو سلیقہ سے قلم بند کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے مستند ماخذ سے لکھا ہے۔عام

طور پر محققین کے بڑھے ہوئے جذبہ تحقیق سے ان کی نثر کی دلآویزی متاثر ہوجاتی ہے، مگر غازی صاحب میں یہ خوبی نمایاں ہے کہ وہ کہیں ادق سے ادق مضامین کی سنگلاخ وادی میں بھی اپنا اسلوب متاثر نہیں ہونے دیتے اور نہ ان کی نثر کہیں روکھی پھیکی اور بدمزہ ہوتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کا اسلوب نگارش سشتہ وشگفتہ اور سلاست وروانی کی خوبیوں سے متصف ہے۔

ڈاکٹر یونس غازی کا کمال یہ ہے کہ وہ نثر ونظم دونوں اقلیم میں یکساں کشور کشائی کررہے ہیں۔ جہاں انہوں نے نثری ادب کے سرمایہ میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، وہیں شاعری کی فضا بھی ان کی نغمہ سنجیوں سے پرشور ہے۔ غازی صاحب بیکار بیٹھنے کے قائل نہیں۔ ان کا ذوق ادب اور بے چین طبیعت انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ وہ یکے بعد دیگرے خوب صورت سوغاتوں سے اہل شوق کے ذوق ووجدان پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ خزینہ رحمت، لمحات اور خواب سمندر کے بعد اب توشہ آخرت، ان کے یہ شعری مجموعے دراصل ان کے شعری سفر کے پڑاؤ ہیں۔ خوب صورت نام، خوب صورت شاعری اور خاص طور پر دل ودماغ روشن کردینے والے اوصاف سے مزین شاعری دامن دل اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی شاعری میں دل کشی اور جاذبیت کے تو اتنے عناصر یکجا ہوگئے ہیں کہ مجموعہ کلام پڑھنے کے بعد تشنگی سرد نہیں ہوتی بلکہ دل ہل من مزید پکارنے لگتا ہے۔ شاید کسی شاعر کی کمال قدرت کا یہی سب سے بڑا پیمانہ ہے کہ اس کے جذب وکشش میں ماورائیت ہو اور اس میں انفس وآفاق گم ہوجائیں۔

توشہ آخرت ڈاکٹر یونس غازی کی تازہ پیش کش ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے چمن سخن میں کھلنے والا نیا اور تازہ گلاب ہے۔

ڈاکٹر یونس غازی کو شعر کہنے میں مہارت حاصل ہے۔ وہ اس کی باریکیوں اور نزاکتوں سے بھی واقف ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود شعر کہتے نہیں بلکہ اشعار ان پر نازل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ان کے جذبات میں حلاوت، شیرینی اور پاکیزگی ہے، وہیں فکر وفن کے جلووں کی بھی تابانی ہے۔ ان کا مزاج بنیادی طور پر دینی ہے۔ وہ اللہ، رسول، قرآن وحدیث اور شعائر اسلامی کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ادب وانشا اور شعر وشاعری کے میدان میں صالح قدروں کے علمبردار ہیں۔ اس لحاظ سے بھی ان کی شاعری خوب صورت کلام کا نمونہ

ہے۔دینی ادب پیش کرنے یا دینی انداز میں شعروادب کی خدمت کرنا کوئی نئی اور قابل ذکر بات نہیں ہے،مگر دین وادب دونوں کے مزاج کا اندازہ داں ہونا اور دونوں کو نباہنا بڑی بات ہے۔ ڈاکٹر غازی ہماری ادبی تاریخ کے اور خاص طور پر معاصر ادب کے پس منظر میں دینی شاعری کے لحاظ سے بھی ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔

توشہ آخرت میں شاعر کا پرواز تخیل خالق کائنات کی قدرت سے اٹھا ہے۔حب نبویؐ میں ڈوبا ہے۔قرآن سے زندگی تک ایک سفر کر کے پہنچا ہے۔ایسا خوب صورت اور پاکیزہ مجموعہ جس سے رب یاد آجائے ۔زبان حب نبویؐ سے سرشار ہوجائے ۔ دستور حیات قرآن کے افکارو خیالات کے جلوے نگاہوں میں سماجائیں۔اورحسن فطرت کے ساتھ وہ ماں جس کے قدموں میں جنت ہے سامنے آجائے ۔یہ ایسے امتیازات ہیں کہ جوتوشہ آخرت کی انفرادیت کے لئے کافی ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ ایک جلوہ ہوتو دل ودماغ پر قابو رہے، یہاں توحسن فطرت شکل بدل بدل کر رونما ہوتا ہے اور دل ودماغ میں ایک اضطراب پیدا کردیتا ہے۔اور غالبًا یہی کمال شاعری ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

۱۔حمد باری تعالی

اللہ مہربان ہے غفورالرحیم ہے
خلاق کل جہاں ہے نہایت کریم ہے
وہ رب کائنات سمیع وبصیر ہے
وہ چارہ ساز ہے وہ علیم وخبیر ہے

۲۔نعت

کسی کا وہ رتبہ ہواہے نہ ہوگا
کوئی آپ جیسا ہواہے نہ ہوگا
خلیق وحلیم ومحبت سراپا
حبیب خدا سا ہواہے نہ ہوگا

۳۔قرآن۔سورہ اخلاص

ایک ہے لاریب رب بے نیاز
کوئی اس کا باپ نہ اولاد نہ ہمسر کوئی

۴۔احادیث

صاحب اخلاق ہوں گے باغ جنت کے مکیں
اوربداخلاق انساں پائیں گے نار سقر
مومنوں میں سب سے افضل ہے وہ انساں مومنو
جوسراپا علم ہو اورصاحب اخلاق ہو

۵۔قطعات

جب پیو پانی تو رک رک کر پیو
در حقیقت یہ عمل سنت بھی ہے
یہ طریقہ ہے رسول پاک کا
اور اس میں کچھ نہ کچھ حکمت بھی ہے

۶۔ماں

وہ اک ماں ہے جسے رہتی ہے ہردم فکر بچے کی
کسی بھی عمر میں اس کی نگہبانی نہیں جاتی

ممتا کی گھنی چھاؤں میں بیتے ہوئے وہ پل
جیون کی کڑی دھوپ میں آتے ہیں بہت یاد

۷۔زندگی

حقیقت زندگی کی اور کیا ہے
بکھرجانا کلی کا پھول بن کر

چاردن کی ہے زندگی غازی

جس پہ انساں غرور کرتا ہے

۸۔لمحات

لمحہ لمحہ قیمتی ہے قدر کرنی چاہئے
وقت پھر آتا نہیں ناداں گذر جانے کے بعد

جن عنوانات کے تحت یہ چند اشعار نقل کئے گئے ہیں۔انہی عنوانات پر یہ پورا مجموعہ کلام ''توشہ آخرت''مشتمل ہے۔اس میں اور بھی منتخب اشعار ہر ذوق کے قارئین کے لئے مل جائیں گے۔شعروں کے اس انتخاب سے میں رسوا ہوسکتا ہوں،مگر غازی صاحب نہیں ہوسکتے۔کیونکہ خلاق ازل نے انہیں یہ وصف عطا کیا ہے کہ وہ جب چاہیں اپنے خیالات کو اشعار کا خوب صورت جامہ پہنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر یونس غازی فکر کی دولت کے ساتھ فن پر بھی کمال دسترس رکھتے ہیں۔انہوں نے مختلف بحور جس میں چھوٹی،بڑی،ہموار ناہموار ہر طرح کی بحریں شامل ہیں طبع آزمائی کی ہے۔لیکن ان کا اصل سرمایہ سخن ان کا فکری سرمایہ ہے۔جس میں وہ راسخ العقیدگی کی دولت سے سرفراز ہیں۔فن کی پختگی کے ساتھ اگر فکر بھی پختہ ہو تو شاعر کو فلسفہ حیات کے سربستہ راز عیاں کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوتی۔غازی صاحب اس لحاظ سے بھی غازی ہیں۔

قرآنی آیات وسور اور احادیث کے منظوم تراجم کوئی نئی بات نہیں ہے،لیکن شاعر ڈاکٹر یونس غازی کی اپنی انفرادیت اور جدت بہر حال قابل ذکر ہے۔میں نے بعض آیات واحادیث کے تراجم اصل سے ملا کر دیکھے تو یہ معلوم ہوا کہ غازی صاحب نے جذباتی نہیں تکنیکی شاعری کی ہے۔جس میں دلی جذبات کی شمولیت نے مزید حسن پیدا کر دیا ہے۔ان موضوعات میں دامن کے جلنے کا شدید خطرہ رہتا ہے۔میں غازی صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے اپنا دامن محفوظ رکھا اور بڑی خوب صورت ترجمانی کی ہے۔

زندگی ہم لوگوں کو روز ستاتی ہے۔ہر شخص اس سے دوچار ہوتا ہے۔زندگی پر غازی صاحب کے اشعار دل کے بہت قریب محسوس ہوتے ہیں۔متفرق اشعار میں بھی زندگی سے متعلق بہت سے قابل ذکر باتیں آگئی ہیں۔لیکن ماں سے متعلق ان کا سخن اور ان کے احساسات

رلا دیتے ہیں اور وفورِ جذبات میں کہیں دل و دماغ قابو میں نہیں رہتے۔ یہ اصلاً غازی صاحب کی فن کاری اور زبان و بیان پر ان کی کمال دسترس کا ثمرہ ہیں۔ میری طرح ہر شخص ماں کی گود میں سر رکھ کر جنت کی سیر کر لیتا ہے، مگر غازی صاحب نے جو اشعار کہے ہیں ان سے جذبات میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور بے ساختہ ماں کا کردار مختلف انداز میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ خاص طور پر جن کی مائیں خلد آشیاں ہو چکی ہیں وہ بے قرار ہو جائیں گے۔ ان اشعار کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے اثرات دیر پا ہیں۔ خود مجھ پر بھی یہ کیفیت دیر تک طاری رہی۔ ان اشعار سے صرف ماں اور ممتا کے جذبہ کی دلآویزی ہی تازہ نہیں ہوتی بلکہ مرتبہ ماں، احترام ماں اور قدر دانی ماں کے جذبات ایک خاص تصور پیدا کر دیتے ہیں۔

''توشۂ آخرت'' واقعی توشۂ آخرت ہے۔ اگر ہم میں احساس اور شعور کے جذبات سرد نہیں ہوئے ہیں تو توشۂ آخرت آپ کے جذبات و احساسات میں پاکیزگی، قوتِ عمل اور کچھ کر گذرنے کے جذبات برانگیختہ کر دے گا۔ مجھے یقین ہے کہ توشۂ آخرت ہمارے شعری سرمائے اور صالح ادب میں ایک قیمتی اضافہ قرار پائے گا۔ اس کی اشاعت پر ڈاکٹر یونس غازی کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

---

[۱۵]

دارالمصنّفین کی عربی خدمات

ڈاکٹر محمد عارف عمری

برادر مکرم ڈاکٹر محمد عارف عمری کی خوش بختیوں کا سلسلہ یہ ہے کہ وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور دارالسلام عمرآباد سے تحصیل علم کے بعد تکمیل کے لئے مدینہ منورہ پہنچے اور مدینۃ العلم کے فیوض و برکات سے مستفید ہوئے۔ پھر عالم اسلام کے مایہ ناز تصنیفی و تحقیقی ادارہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے وابستہ ہوکر اس سلسلہ زریں کا حصہ بنے، جس کی بنا ہندوستان کے مجدد اعظم علامہ شبلی نے ڈالی تھی۔ یہاں انھوں نے متعدد اہم علمی و تحقیقی مقالے لکھے جو ہندوستان کے مؤقر ترین رسالے ماہنامہ معارف میں شائع ہوئے۔ متعدد عربی مضامین کے ترجمے اور ایک گراں قدر کتاب ''تذکرہ مفسرین ہند'' قلم بند کی۔ مولانا داؤد اکبر اصلاحی کے قرآنی مقالات اور اسلام اور مستشرقین جلد ہشتم کی ترتیب و تدوین بھی ان کی اہم علمی کوششیں ہیں۔ ایک اہل قلم کی حیثیت سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ ان کا تصنیفی شعور پختہ اور علم و مطالعہ عمیق ہے۔ خصوصاً اسلامی علوم پر ان کی گہری نگاہ ہے۔ ان کی بعض تحریروں کی ڈاکٹر محمد حمیداللہ مرحوم جیسے مایہ ناز اسکالر نے تحسین و ستائش کی ہے۔

زیر نظر کتاب دراصل ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جس پر انھیں لکھنؤ یونیورسٹی نے پی، ایچ، ڈی [Ph.D.] کی ڈگری تفویض کی ہے۔ اس میں انھوں نے ''دارالمصنّفین کی عربی خدمات'' کا جائزہ پیش کیا ہے۔ تقریباً ایک صدی پر مشتمل دارالمصنّفین کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس نے سیرت و سوانح، تاریخ و تذکرہ اور شعر و ادب کے متنوع موضوعات پر دوسو سے زاید بلند پایہ تحقیقی کتابیں اپنے رفقاء و مصنّفین سے لکھوا کر شائع کی ہیں۔ خاص طور پر سیرۃ النبیؐ کی تالیف و

تدوین واشاعت اس ادارہ کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ دارالمصنّفین کی تصنیفی زبان اگر چہ اردو ہے اور اس نے اردو کے ذخیرہ میں بڑا اہم اور وقیع اضافہ کیا ہے، تاہم اس کے بعض مصنّفین کے قلم سے عربی زبان میں بھی تحریریں نکلیں۔ یہی نہیں انھوں نے متعدد اہم عربی کتابوں بلکہ مصادر کا اردو زبان میں ترجمہ کیا اور ان کی اشاعت کا بھی سامان کیا۔ تفسیر ابومسلم اصفہانی کی ترتیب و تدوین اور اشاعت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر عمری نے دارالمصنّفین کی اس طرح کی تمام کوششوں اور کاوشوں کا اپنے مقالہ میں بڑی عمدگی اور سلیقہ مندی سے احاطہ کیا ہے۔

دارالمصنّفین کی گراں قدر خدمات کے مطالعہ وجائزہ پر مشتمل متعدد مقالات اور کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں پروفیسر خورشید نعمانی کی کتاب دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات [دوجلدیں] خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ راقم نے بھی دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات [مطبوعہ خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ] کے نام سے مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہے۔ ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں میں بھی تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں تاہم ڈاکٹر محمد عارف عمری کا مقالہ ان میں انفرادیت کا حامل ہے۔ یہ مقالہ اگر چہ عربی خدمات کے عنوان سے لکھا گیا ہے لیکن دراصل یہ دارالمصنّفین کی قرآنی، تفسیری اور تاریخِ اسلام سے متعلق خدمات کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس میں دارالمصنّفین کے قیام کے اسباب ومحرکات کے ساتھ اس کی اجمالی تاریخ بھی آ گئی ہے۔ نیز علامہ شبلی اور مولانا حمیدالدین فراہی کے عربی رسائل وتفاسیر کا بھی تجزیہ شامل ہے۔

یہ وقیع مقالہ اس لحاظ سے بھی بڑا اہم ہے کہ اس میں علامہ شبلی کے علمی منصوبوں اور ان کے عزائم کی داستان بھی کسی قدر آ گئی ہے۔ دارالمصنّفین کے بعض ناتمام تصنیفی سلسلوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ یہ اصلاً فاضل مصنف کی علامہ شبلی اور دبستان شبلی سے گہری وابستگی کا اظہار ہے۔ یقین ہے کہ آئندہ جب ہم شبلی صدی کے منصوبے پر عمل پیرا ہوں گے یہ مقالہ کسی نہ کسی نوع سے ہماری ضرور رہنمائی کرے گا۔ اس کی اشاعت سے ہماری علمی تاریخ کے سرمائے میں ایک اہم کتاب کا اضافہ ہوگا۔ ہم اس کی اشاعت پر اپنے لائق فخر دوست ڈاکٹر محمد عارف عمری صاحب کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

[۱۶]

سرمایہ قلم

ڈاکٹر محمد عارف عمری

مولانا ڈاکٹر محمد عارف عمری بلند پایہ عالم دین اور مایہ ناز مصنف و محقق ہیں۔ مدینہ یونیورسٹی کے فاضل اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادارہ تحقیق و تصنیف دار المصنّفین اعظم گڑھ کے برسوں رفیق رہ چکے ہیں۔ ان کا علم و مطالعہ وسیع و عمیق ہے۔ ان کا قلم بڑا پختہ اور منجھا ہوا ہے۔ ان کے قلم سے مستقل تحقیقی کتابیں نکل کر مقبول ہو چکی ہیں۔ ان کی علمی و تحقیقی حیثیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی بعض تحقیقات کی داد و ستائش مایہ ناز محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم نے دی۔

ڈاکٹر محمد عارف عمری نے مستقل کتابوں کے علاوہ قرآن و حدیث، سیرت و سوانح اور زبان و ادب کے مختلف گوشوں پر مسلسل علمی و تحقیقی مقالات بھی لکھے جو ملک کے موقر رسائل و جرائد ماہنامہ معارف اور ماہنامہ الرشاد وغیرہ میں شائع ہوئے اور اہل علم کی نظر میں داد و تحسین کے مستحق ٹھہرے۔ زیر نظر کتاب ''سرمایہ قلم'' میں انہیں مقالات کو افادیت کے پیش نظر یکجا کیا گیا ہے۔ ان سے جہاں علم و ادب کے متنوع گوشوں کی وضاحت ہوتی ہے اور بعض نئی تحقیقات بھی سامنے آتی ہیں، وہیں فاضل مقالہ نگار کی قرآن و حدیث، سیرت و سوانح، اصلاح و اخلاق اور مستشرقین کے افکار پر گہری نظر کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ان مقالات کو فاضل مقالہ نگار نے اگرچہ طالب علمانہ قرار دیا ہے، تاہم واقعہ یہ ہے کہ یہ مقالات ان کے علم و تحقیق، گہرے مطالعہ و مشاہدہ اور عمیق فکر و نظر کے شاہد ہیں۔ یہ مجموعہ نہ صرف طلبہ بلکہ ہر طبقہ کے اہل علم کے لئے مفید اور معلومات افزا ہیں۔

ڈاکٹر محمد عارف عمری کا اسلوب نگارش بڑا شستہ و شگفتہ ہے۔ متین، سنجیدہ اور باوقار انداز تحریر نے ان کے مقالات میں اور بھی حسن پیدا کر دیا ہے۔ امید ہے اہل علم کے درمیان ان تحقیقی مقالات کی بھرپور پذیرائی ہوگی۔

[۱۷]

اعجاز نامے

مکاتیب: مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ
مرتبہ: مولوی عرفات اعجاز اعظمی

عارف باللہ حضرت مولانا اعجاز احمد اعظمیؒ [۱۹۵۱ء-۲۰۱۳ء] نور اللہ مرقدہ کی سیرت و شخصیت کے اتنے متنوع جلوے اور گونا گوں کارنامے نگاہوں میں ہیں کہ اُن کو بیان کرنے کے لیے ایک دفتر چاہیے۔ وہ ایک عالم باعمل اور عالم بے بدل تھے۔ وہ دین کے بے لوث خدمت گذار تھے۔ وہ واعظِ بےنظیر تھے۔ صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے۔ ان کے دروس قرونِ اولی کے مسلمانوں کے دروس کی یادیں تازہ کر دینے والے تھے۔ وہ دلِ دردمند لے کر آئے تھے۔ اخلاص وللّٰہیت کے پیکر تھے۔ ان کی مجلس علم وحکمت کے موتی لٹاتی تھی۔ ان کی کتابیں حکمت ومعرفت کے روشن چراغ ہیں، جن کو پڑھ کر دل ودماغ منور ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایسی پرکشش اور جاذبِ نظر شخصیت تھی کہ جو ایک بار ان سے ملتا، وہ انھیں کا ہو کے رہ جاتا۔ مجھے ان کی شخصیت کے دو پہلوؤں نے خاص طور پر ان کا والہ وشیدا بنایا۔ ایک یہ کہ ان کی مجلس میں بیٹھ کر تعلق مع اللہ میں اضافہ ہو جاتا۔ دوسرے ان کے تبحر علمی اور خزینہ علم وحکمت کے بے بہا نمونے نگاہوں کو خیرہ کر دیتے۔ خدا جانے ان کا دماغ کتنے علوم کا خزانہ تھا۔ وہ جس موضوع پر گفتگو کرتے علم ودانش کا دریا بہا دیتے۔ وہ جس موضوع پر خطاب کرتے، اس کا نہ صرف حق ادا کر دیتے، بلکہ اپنے سامعین کے ذوق ووجدان کو اس طرح متاثر کر دیتے کہ ذوقِ علم وعمل کا جذبہ پیدا ہو جاتا۔ ایسی پرکشش اور فعال شخصیت کم از کم میری نگاہوں نے نہیں دیکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی پرکشش شخصیت کا راز اُن کی للّٰہیت، اخلاص عمل اور فنا فی العلم میں مضمر تھا۔ جن نگاہوں نے انھیں قریب سے دیکھا ہے، وہ میرے اس خیال کی تائید وتصدیق کریں گے۔

حضرت مولانا مرحوم کے لائق تلامذہ کی ایک بڑی تعداد ہے، جن سے علوم دینیہ کی تدریس وتفہیم کا سلسلہ جاری ہے۔ اس صدقہ جاریہ کے لیے انھوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ وہ درس کا بہت اہتمام کرتے تھے۔ شوق سے طلبہ کی علمی تشنگی بجھاتے اور ان میں علم کی حقیقی طلب اور روح پیدا کر دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک بار جو ان سے ملتا وہ ان کا والہ وشیدا ہو جاتا۔ شیریں دیوانگی، مقدس سنجیدگی اور زحالِ مسکیں مکن تغافل والی بات میں نے انھیں کی شخصیت میں دیکھی اور محسوس کی۔

مولانا مرحوم کی دوسری بڑی یادگار ان کی کتابیں ہیں۔ ان کے مطالعہ کے دوران میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ وہ نگاہوں کے سامنے ہیں۔ علم وحکمت کے موتی لٹا رہے ہیں۔ معلومات کا دریا بہا رہے ہیں۔ اسلاف کے کارنامے بیان کر رہے ہیں اور صراطِ مستقیم کی نشان دہی کر رہے ہیں۔ اب وہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہیں، تاہم ان کی تحریریں اب بھی اسی طرح ان کی نیابت کر رہی ہیں۔ انھوں نے سوانح لکھی تو صاحبِ سوانح سے زیادہ ان کے تعلق باللہ کے جلوے دکھا کر ایسا ہالہ بنایا کہ ان سے اپنی سیرت کو بنانے، سنوارنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے اپنی حکایت بیان کی تو طالبانِ علومِ نبوت سے ایسا قرب پیدا کر دیا کہ زندگی سنوارنے اور کچھ کر گزرنے کے جذبات برانگیختہ کر دیے۔ تہجد گزار بندوں کے نقوش ابھارے تو پڑھنے والوں کے قلوب مسخر کر لیے اور آہِ سحر گاہی کے نالوں سے زندگی پرشور کر دی۔ حدیث دل بیان کی تو حدیث جاں کی جاں نوازی سے ایک نئے عالم سے ہم کنار کیا۔

یہ کہہ دینا کہ ان کا اسلوبِ نگارش دلوں کو مسخر کرتا ہے، معمولی بات ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، حق ادا کر دیا اور حسنِ معانی کے ساتھ حسنِ نظر بھی پیدا کر دیا۔ انھوں نے جس موضوع پر لکھا، ان کا ذوقِ نظر ان کے ساتھ رہا۔ کہیں ایجاز بیانی، کہیں طولانی، کہیں نالہ دلگیر، کہیں نالہ شب گیر۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسی قوت ان کے قلم میں آ گئی ہے جو انھیں شاہراہِ مقصود سے نظر پھیرنے اور ہٹانے نہیں دیتی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے تعلق مع اللہ نے انھیں کسی اور راہ کا مسافر بننے نہیں دیا۔ یہی حال ان کے عشقِ نبویؐ کا تھا۔ وہ رسول امی صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقِ زار تھے۔ ان کی ہر ادا پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کا ایک موضوعِ سخن یہی سخن دل

نواز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں دنیا کے سارے جلوے بے نور معلوم ہوتے رہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے جس منصب پر فائز کیا تھا، دنیا ان کے قدموں میں تھی، مگر انھوں نے اس کی طرف نظر بھر کے نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ جاہ و مال کی اتنی بھی فکر نہیں کی کہ ان کی لائق اولادیں آرام وسکون سے زندگی بسر کرسکیں۔ وہ دنیا سے گئے تو اپنی اولادوں کو اللہ کے حوالے کر کے گئے اور انھیں علوم دینیہ سے آراستہ کر کے دنیا کو آئینہ دکھا دیا کہ اللہ والے یوں دنیا چھوڑ کر جاتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی تحریریں میں پڑھتا رہا ہوں۔ ان کی اولادوں کو قریب سے دیکھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے مولانا مرحوم کے پیش نظر اسلام کی سربلندی، شریعت کی پاس داری اور علوم دینیہ کے فروغ و اشاعت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس کے لیے انھوں نے کتابیں لکھیں۔ وعظ ونصیحت کا دربار سجایا۔ طلبہ کے اندر دین کا حقیقی ذوق پیدا کیا اور خود اپنی اولادوں کو دین کی خدمت کے لیے اسی میدان کا راہی بنایا جس پر وہ خود مدۃ العمر گامزن رہے۔ آہ:

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے

مولانا مرحوم خطوط لکھنے اور خطوط کا جواب دینے کا اہتمام اسلاف کی طرح کرتے تھے۔ ان کے خطوط میں دین و دنیا کی ایک کہکشاں آباد ہے۔ ان کا ایک مجموعہ ''حدیث دوستاں'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اب ان کے عام خطوط کا مجموعہ ''اعجاز نامے'' ان کے فرزند عزیز مولوی محمد عرفات اعجاز اعظمی نے مرتب کیا ہے اور شائع کر رہے ہیں۔ ان خطوط میں بڑی گونا گونی اور شفقت ومروت اور ادب و احترام کے متعدد جلوے سمٹ آئے ہیں۔ کہیں ادب و احترام ہے۔ کہیں محبت وشفقت ہے۔ کہیں تنبیہ و ترغیب ہے۔ کہیں علم وحکمت کے خزانوں کا ذکر ہے۔ کہیں عروج وارتقاء کے مسائل ہیں۔ کہیں تصوف ہے۔ کہیں سلوک ومعرفت ہے۔ کہیں دین ہے اور کہیں دنیا ہے۔ غرض یہ خطوط اپنے اندر بڑی معنویت رکھتے ہیں۔ مولانا مرحوم کا مخصوص اندازِ نگارش جس میں سنجیدگی وشائستگی، سلاست وروانی حسنِ نظر اور ذوقِ علم وعمل کے بے پناہ جلوے آگئے ہیں۔ یہ حدیثِ دل بھی ہے اور حدیثِ دلبری بھی۔ جن نگاہوں کو اعجازِ خسروی کی طلب ہو، تفقہ فی الدین کی خواہش ہو، وہ یہاں سے بے نیل ومرام نہیں جاسکتے۔ میں نے ان کو بار بار پڑھا ہے۔ مجھے مولانا مرحوم کے سادہ، شگفتہ اور رعنا قلم کے جلوؤں نے اس طرح گھیرا کہ انھیں بار بار

پڑھا اور جذب وسلوک کے متعدد پہلوؤں نے دل و دماغ کو متاثر کیا۔ مجھے یقین ہے کہ یہی کیفیت ہر اس شخص کی ہوگی جو ان کا مطالعہ کرے گا۔

برادر عزیز مولوی محمد عرفات اعجاز اعظمی مولانا مرحوم کے لائق فرزند ہیں۔کم عمری اور نو جوانی کے باوجود ان میں سلیقہ مندی اور سلیم الطبعی کے جوہر نمایاں ہیں۔والد سے محبت تو فطری بات ہے، والد کے احباب و متعلقین سے بھی ان کو تعلق خاطر ہے۔انھوں نے کئی علمی کام بحسن و خوبی انجام دیے ہیں۔خاص طور سے ''باقیاتِ اعجاز'' کی ترتیب وتدوین اور اشاعت میں دل جمعی سے کام کیا ہے اور جنھیں اہل علم اور اہل نظر نے سراہا ہے۔ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا ذوقِ مطالعہ و کتب بینی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ وہ بڑے علمی وادبی کام انجام دیں گے۔ ناچیز ان کے روشن مستقبل کے لیے دعا گو ہے۔

[۱۸]

روحِ سخن

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی

اعظم گڑھ کا شعری افق جن شعراء کی بدولت مطلع انوار بنا ان میں ایک اہم نام جناب رحمت الٰہی برقؔ اعظمی کا ہے۔ ان کی حیثیت محض ایک پر گو، قادرالکلام اوراعلیٰ پایہ کے قصیدہ گواور بلندرتبہ غزل گو ہی کی نہیں بلکہ اصلاً ایک دبستان کی ہے۔ وہ جس موضوع اور جس صنف سخن میں جب چاہتے اشعار کی جھڑی لگا دیتے تھے۔

برقؔ صاحب کی شعری کائنات میں ایسے اشعار، قطعات اور نعتیں بھی ہیں جن میں کسی میں لب سے لب نہیں ملتے تو کسی میں وہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن میں محض نیچے یا اوپر نقوط ہیں۔ اسی طرح ان کی ایک ایسی تخلیق بھی ہے جس میں مصرعہ اول سے مصرعہ آخر، دائیں بائیں کہیں سے آخر کے حروف ملائے جائیں تو صلو علیہ وآلہ برآمد ہوتا ہے۔ یہ سخنوری نہیں اقلیم سخن پر کشور کشائی ہے اور یہی وہ وراثت ہے جو ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی کے حصے میں آئی ہے۔

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ گذشتہ ۳۵ر برسوں سے اس طرح دادِ سخن دے رہے ہیں گویا دنیا میں شاعری، سخنوری اور سخن آفرینی سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں۔ اسے ہم ڈاکٹر احمد علی برقیؔ کی فطری طبع کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ گویا وہ فطری شاعری ہیں۔ اپنے والد برقؔ اعظمی کی طرح یہ بھی بڑے زود گو بلکہ پر گو ہیں اور نت نئے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے وہ موضوعاتی شاعری کر رہے ہیں۔ اس میں ان کے دو طرح کے اشعار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک انہوں نے ادباء وشعراء اور ممتاز اہل قلم کی نگارشات کے تعارف وتحسین کو اپنے اشعار کا

عنوان قرار دیا ہے۔ دوسرے وہ جو اس سے بھی زیادہ اہم ہے وہ ہے ان کی شخصی شاعری۔ اردو ادب کے گذشتہ اور موجودہ ارباب کمال کی شخصیت اور شاعری پر انہوں نے جو نظمیں کہی ہیں یا انہیں جو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے گو اس سے پہلے بھی بعض شعراء نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے، مگر ان کی حیثیت کبھی کبھی اٹھنے والی موج دریا سے زیادہ نہیں تھی، لیکن ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی صاحب نے اس میدان میں ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے اور بلاشبہ سیکڑوں ادیب، شاعر، نقاد، مصنّفین اور محققین کی شخصیت کو اپنی شاعری کے سانچے میں ڈھال کر اردو ادب میں ایک خوب صورت باب کا اضافہ کیا ہے۔ اسے ہم تاریخ ادب اردو منظوم کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی موضوعاتی شاعری کو یکجا شائع کیا جائے تاکہ وہ انٹرنیٹ کی دنیا سے ہٹ کر ان اہل نظر تک پہنچے جن کی انٹرنٹ تک رسائی نہیں ہے۔

ڈاکٹر احمد علی برقی نئی نسل کے ان ممتاز شعراء میں ہیں جنہوں نے اردو و فارسی دونوں زبانوں میں اور مختلف اصناف میں داد سخن دی ہے۔ خاص طور سے ان کی اردو کی غزلیہ شاعری میں جدید انداز اور کلاسیکل فضا نے ایک نئی روح پیدا کی ہے اور اسے انہوں نے بجا طور پر ''روح سخن'' کا نام دیا ہے۔

''روح سخن''، ڈاکٹر احمد علی برقی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ غزلیں مختلف حالات اور مختلف زبانوں میں کہی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں عصری حسیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ غزل کے روایتی عناصر سے بنے غزل کے ہیولے میں عصری حسیت، قدیم شعراء کی بعض مشہور زمینوں میں ان کی غزلیں آسماں پر روشن ستارے کے مانند چمک و دمک بکھیر رہی ہیں۔ یقین ہے روح سخن روح کی بالیدگی میں معاون ہوں گی۔

روح سخن کی اشاعت پر ہم ڈاکٹر احمد علی کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ جلد از جلد ان کے دوسرے مجموعہائے نظم و غزل کی اشاعت کا سامان ہو جائے۔

[۱۹]

جو اکثر یاد آتے ہیں

ڈاکٹر محمد ارشد خاں

ڈاکٹر محمد ارشد خاں نئی نسل کے ایک ممتاز اہل قلم، ادیب، نقاد اور شاعر ہیں۔ گذشتہ پچیس برسوں سے انتہائی خاموشی سے صلہ وستائش کی پرواہ کئے بغیر شعر و ادب کی خدمت میں مسلسل مصروف ہیں۔ فوج میں ملازمت اور صوبیداری کے باوجود ان کا قلم رواں دواں ہے۔ مایہ ناز علمی ادارے شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ سے ممتاز نمبروں کے ساتھ اردو سے ایم اے کرنے کے بعد گورکھپور یونیورسٹی سے ڈاکٹر احمر لاری مرحوم کی زیرنگرانی ''نشور واحدی حیات وخدمات'' کے عنوان سے بڑا اہم مقالہ لکھا، جس پر گورکھپور یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی۔ یہ مقالہ شائع ہوکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے اور واقعۃً یہ مقالہ اس لائق ہے کہ اس کا ذکر اہتمام سے کیا جائے۔ اس میں نشور واحدی مرحوم کی شخصیت اور شاعری کے متنوع پہلوؤں کا بڑے محققانہ انداز میں جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ان کے حالات وسوانح اور نثری کارناموں کا بھی تجزیہ شامل ہے۔

ڈاکٹر محمد ارشد خاں پی ایچ ڈی کی سند لینے کے بعد خاموش نہیں بیٹھے بلکہ اسی زمانہ میں نشور واحدی کے ادبی مضامین کو رسائل وجرائد سے ڈھونڈ کر یکجا کیا اور گراں قدر مقدمہ کے ساتھ شائع کرایا۔ اس میں انہوں نے نشور واحدی کی نثر نگاری پر جس طرح قلم اٹھایا ہے اور جس طرح اس کا تجزیہ کیا ہے وہ ان کی تنقیدی صلاحیتوں کا پتہ دیتا ہے اور ان کے گہرے مطالعہ اور ادبی شعور کی بھی وضاحت کرتا ہے۔

ڈاکٹر محمد ارشد نثر نگاری کے ساتھ مسلسل داد سخن بھی دیتے رہے اور تقریباً ہر صنف سخن میں

طبع آزمائی کی اور کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے محض تفنن طبع کے لئے دادِ سخن نہیں دی ہے بلکہ ان کے یہاں مقصدی شاعری کے لوازمات پورے طور پر جلوہ گر ہیں اور ہیئت و اسلوب میں بھی انفرادیت ہے۔ کاش اس کی طرف وہ تھوڑی محنت و لگن اور ریاض سے توجہ دیتے تو وہ نئی نسل کے شعراء میں اب تک ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوتے، جس سے صرف نظر آسان بات نہ ہوتی، تاہم انہوں نے جو کچھ کہا ہے اس میں سلاست و روانی اور شگفتگی کے ساتھ فہم و شعور کے عناصر کی کمی نہیں، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ان کا کلام ایک سیل رواں ہے جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا ساحل سے ٹکراتا رہتا ہے اور اس کی لہریں دور تک دکھائی دیتی ہیں۔

ان کی جولانی طبع کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ انہیں نثر سے زیادہ دلچسپی ہے یا نظم سے۔ زیرِ نظر کتاب ''جو اکثر یاد آتے ہیں'' ان کے کچھ خاکے اور کچھ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں انہوں نے چند بزرگوں، چند معاصرین اور چند احباب کے نقوش ابھارے ہیں اور ان کے ذکر کو حروف قلم سے کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نقوش ایسے سیدھے اور سچے انداز میں ابھارے اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں کہ بس پڑھتے چلے جایئے۔ چند خاکے تو ایسے ہیں جن میں جان کم تھی مگر خاکہ نگار نے اپنے قلم سے ان میں روح پھونک دی ہے اور ایسی سچی تصویریں ابھاری ہیں کہ کوئی شخص داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مضامین میں بھی یہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ ثقیل اور بوجھل الفاظ سے ان کے مضاین میں کہیں تنفر کی شکایت کا موقع نظر نہیں آتا۔ اور نہ شعوری طور پر ڈاکٹر محمد ارشد نے ان میں علمیت کا رعب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ بالکل سیدھے سادے، فطری انداز میں اپنی باتیں لکھ دی ہیں اور وہ حقیقت اور واقعیت سے اس قدر قریب ہیں کہ دل کو چھوتی چلی جاتی ہیں۔ بہرحال یہ خاکے اور مضامین بےشبہ فطری انداز پر ہونے کی وجہ سے زیادہ شعور اور بالیدگی کی راہیں ہموار کرتے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ڈاکٹر محمد ارشد خاں نے جن لوگوں کے خاکے لکھے ہیں وہ مختلف طبقوں، نسلوں اور مختلف تہذیبوں کے نمائندہ ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ عالم و فاضل بھی ہیں اور عامی بھی۔ ادیب و انشاء پرداز بھی ہیں اور شاعر و سخن سنج بھی۔ باوجود اس کے خاکہ نگار نے ان کے خاکے اس خوبی سے کھینچے اور ان میں رنگ بھرے ہیں کہ ان میں واقعیت کا اصلی رنگ غالب ہو گیا

ہے۔اور خاکہ نگار کی یہی سب سے بڑی خوبی کہی جاسکتی ہے کہ وہ اصلیت اور واقعیت سے ہمیشہ قریب تر رہے۔

مجھے ڈاکٹر محمد ارشد خاں کے خاکوں نے بے حد متاثر کیا ہے اور توقع ہے کہ یہ دیگر قارئین کو بھی متاثر کرے گا۔اسی توقع کے ساتھ میں ڈاکٹر محمد ارشد خاں کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے اسے ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

---

[۲۰]

سازرنگ وبو

ڈاکٹر ارشد اعظمی

''سازرنگ وبو'' ڈاکٹر ارشد اعظمی کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ حالانکہ وہ دورطالب علمی سے دادسخن دے رہے ہیں۔ ان کی شاعرانہ زندگی ۲۵رسال سے زاید عرصہ پر محیط ہے اور انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ نعتیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی۔ نظمیں بھی کہی ہیں اور مراثی وقطعات بھی۔ اس طرح ان کی شاعری میں مختلف رنگ وآہنگ نمایاں ہیں اگر نعتوں سے حب نبویؐ عیاں ہے تو غزلوں سے حسن وعشق کی دلفریبیاں۔ نظموں میں مناظر قدرت کے ساتھ معاشرتی پہلوزیادہ واضح ہیں۔ مراثی کربلا کے واقعات پر مشتمل ہیں ان سے محبت اہل بیت خاص طور پر اجاگر ہوتی ہے۔

ارشد اعظمی نے اگر چہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر اصلاً وہ غزلوں کے شاعر ہیں۔ سازرنگ وبو میں بیشتر غزلیں ہی شامل ہیں۔ یہ غزلیں انھوں نے طویل بحروں میں بھی کہیں ہیں اور مختصر بحروں میں بھی۔ ان غزلوں میں روایتی حسن وعشق کے ساتھ اپنے عہد کے مسائل ومصائب بھی بیان کیے ہیں۔ وہ فوج میں ملازمت کرتے ہیں اس سے فطری طور پر فوجی زندگی کا اثر ان کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو ان کی غزلیں اپنے عہد کی نمائندہ ہیں اور یہی ان کی غزلوں کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

امید ہے ''سازرنگ وبو'' کی پذیرائی ہوگی۔

[۲۱]

میزان آگہی

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی شعر وادب، تحقیق وتنقید اور تعلیم کے میدان میں برسوں سے سرگرم کردار ادا کررہے ہیں اوران موضوعات پران کی گہری نظر ہے۔وہ کوئی کام سرسری اور سطحی کرنے کے روادار نہیں، بلکہ محنت وتحقیق اور دقت نظری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔خاص طور سے ان کے تجزیئے اور تعلیمی مسائل ومہمات پران کی تحریریں بہت مفید ہوتی ہیں۔اس میں جہاں معلومات کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے وہیں ان کے تجربے، مشاہدات، تحقیقات اور حسن استدلال ان کی تحریروں کو سند، وقعت اور وقار عطا کرتے ہیں۔ان کی کتاب ''تعلیمی تجزیئے'' اور ''تعلیمی جہات'' نہ صرف ان کے ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت ہیں بلکہ ان سے ان کا قومی وملی درد بھی نمایاں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی ادبی وتعلیمی تحریروں کے انبار میں ان کی شعر گوئی، سخن سنجی اور شاعرانہ حیثیت دب کر رہ گئی ہے۔حالانکہ وہ ایک پختہ مشق اور قادرالکلام شاعر ہیں۔وہ برسوں سے دادِ سخن دے رہے ہیں۔ان کا کلام خوب صورت اور دل نواز کیفیات کا مجموعہ ہے۔اس میں تنوع اور گوناگونی ہے۔ان کے اصل جذبات وخیالات کے نمونے نثری نگارشات کے مقابلہ میں شعری تخلیقات میں زیادہ واضح اور روشن ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان کے تنوعات وموضوعات میں ایک بنیادی موضوع تعلیم بھی ہے۔وہ مسلمانوں کی تعلیمی اور تہذیبی پس ماندگی سے مضمحل اور افسردہ ہیں۔اور بار بار متوجہ کرتے ہیں کہ مسلمان تعلیمی ترقی کے بغیر ترقی کی منزلیں طے نہیں کرسکتے۔وہ طرح طرح سے بھولا ہوا یہ سبق یاد دلاتے ہیں۔کمیوں اور کوتاہیوں کو واضح کرتے ہیں۔مجموعی طور سے جدید صالح اور قدیم نافع کے وہ علم بردار ہیں۔یہی وجہ کہ وہ قدیم تعلیم پر نیزہ

زن اور جدید تعلیم کے بے راہ رو اور غیر مفید پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ ہماری عزت، وقار اور اعتبار سب کچھ تعلیمی ترقی میں مضمر ہے۔

نئی نسل کے جن شعرا نے مقصدی شاعری کو ترقی دی ان میں تعلیم اور تعلیمی معاملات ومسائل کو شعری جامہ پہنانے کے لحاظ سے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی ایک منفرد شاعر ہیں۔اس تعلیمی اور اخلاقی شاعری کے لئے وہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ان کا یہ شعری مجموعہ ''میزان آگہی'' اس لحاظ سے یقیناً ہمارے شعری سرمایے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

امید ہے ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی نثری کاوشوں کی طرح ان کے شاعرانہ جذبات و احساسات کا بھی احترام کیا جائے گا۔

[۲۲]

دوستی کا نبویؐ سلیقہ

جناب تفسیر عباس

الحمدللّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم محمدن الامین وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین .

ہمارے سیرت نگاروں نے شہنشاہ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک ادا اور ایک ایک اسوہ وعمل کو محفوظ رکھا اور اس پر کتابیں لکھیں جو ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اردو میں اس سلسلے کا آغاز علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] سے ہوا۔ علامہ شبلی تو اس سلسلہ کو وسعت دے کر ایک سیرت اکیڈمی قائم کرنے کے آرزومند تھے۔ سیرت اکیڈمی اگر چہ وہ قائم نہ کر سکے، تاہم سیرۃ النبیؐ جیسی شاہکار کتاب لکھ کر میدان سیرت نگاری میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ ان کی سیرۃ النبیؐ کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ اردو و فارسی کیا خود عربی مبین میں بھی اس معیار کی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کے بعد اردو میں یہ مبارک سلسلہ دراز تر ہوتا گیا اور آج اس موضوع پر مختلف عناوین کے تحت سیکڑوں کتابیں معروض وجود میں آچکی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور یقین ہے کہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

زچشم آستیں بردار و گوہر را تماشا کن

ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر تفسیر عباس صاحب کا رہوار قلم میدان سیرت میں بڑا سبک خرام ہے۔ اس خوش قسمتی پر وہ جس قدر نازاں ہوں کم ہے۔ ہم انہیں مبارک باد پیش کرتے ہیں کہ اس مبارک سلسلہ میں جگہ پا جانا فخر وسعادت کی بات ہے۔ چہ جائے کہ وہ اس میدان میں

مستقل سرگرم عمل ہیں اور داد تحقیق دے رہے ہیں۔ اس سے قبل انہوں نے سیرت کے موضوع پر دو اہم ضخیم اور معرکۃ الآراء کتابیں ''درسگاہ صفہ کا نظام تعلیم و تربیت'' اور ''رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و استقامت'' سپرد قلم کیں اور انتہائی تحقیق و تدقیق کے ساتھ یہ کارنامے انجام دئے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے موضوع کے ساتھ انصاف کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہل علم نے ان کی تصنیفات کو سراہا اور قابل تحسین و ستائش قرار دیتے ہوئے سیرت ایوارڈ سے نوازا۔

''دوستی کا نبویؐ سلیقہ'' ڈاکٹر تفسیر عباس صاحب کی تازہ پیش کش ہے۔ یہ ایک منفرد اور اچھوتا موضوع ہے۔ سیرت کے اس گوشہ کو منور کرنے کی سعادت انہوں نے پائی ہے اور قرآن و حدیث اور تاریخ و سیر کے وسیع مطالعہ و تحقیق کے بعد انہوں نے یہ کتاب سپرد قلم کی ہے۔ اس قدر عمدہ اور معیاری کتاب لکھ کر انہوں نے اردو زبان میں ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس خدمت کو قبول فرمائے۔

پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں دوستی اور باہمی ربط و تعلقات کے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کے ابواب درج ذیل ہیں:

باب اول: دوستی کا مفہوم، اہمیت، حدود اور شرائط
باب دوم: دوستی کا تصور اسوۂ حسنہ کی روشنی میں
باب سوم: دوستی کے آداب اسوۂ حسنہ کی روشنی میں
باب چہارم: دوستی کے موانع اسوۂ حسنہ کی روشنی میں
باب پنجم: نیک و بد صحبت کے اثرات اسوۂ حسنہ کی روشنی میں

وقت کی یہ ایک بڑی اہم ضرورت تھی۔ مذکورہ ابواب کے ضمن میں دوستی کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس پر لائق اور فاضل مصنف نے توجہ نہ کی ہو اور یہ تمام مباحث اسوۂ حسنہ کی روشنی میں پیش کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مصنف سلمہ اللہ تعالیٰ کی سرشاری عشق نبویؐ میں اضافہ فرمائے اور سیرت نبویؐ کی مزید خدمت کی توفیق بخشے۔

فاضل مصنف کا انداز تحقیق و تصنیف بلند اور اسلوب نگارش شستہ و شگفتہ ہے۔ سیرت کونین کے ذکر نے رعنائی بیان میں حسن و جاذبیت پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اس منفرد موضوع پر

انہوں نے معیار و وقار کا بڑا خیال رکھا ہے اور مآخذ ومصادر اور حوالے کا خصوصی التزام کیا ہے اور کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جس کا حوالہ نہ دیا ہو۔ میں اس کے مطالعہ سے بے حد متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے اور دین و دنیا کی سعادت سے بہرہ ور کرے اور اس کتاب کو قبولیت عام عطا کرے۔ آمین۔

[۲۳]

سیدِ انسانیتؐ کی مزدور پالیسی

ڈاکٹر تفسیر عباس

''اسلام'' دین رحمت اور دین فطرت ہے۔ یہ ہمیشہ کے لئے ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ اب نہ کوئی دین آنے والا ہے اور نہ نبی۔ آقائے نامدار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور انہیں کی رسالت پر نبوت کا خاتمہ بالخیر ہو چکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور اسلامی تعلیمات بنی نوع انسانی کے لئے حرف آخر ہیں۔ یہ اسلام کا ایک معجزہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین حنیف میں زندگی کے تمام نقوش ثبت کر دئے ہیں، جو تمام مسائل و معاملات پر حاوی ہیں اور جو قیامت تک ہماری رہبری اور رہنمائی کرتے رہیں گے۔ بالکل اسی طرح اسلام نے قانون محنت و مزدوری بھی طے کر دئے ہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے مزدور، مزدوری یعنی محنت واجرت کے مسائل و معاملات کا مستقل نظام نہ تھا۔ اسلام نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے ساتھ عزت و تکریم کا معاملہ کیا اور اس کے مسائل و مہمات طے کر دئے۔ دراصل یہ بھی اسلام کی اولیات میں شامل ہے۔

روئے زمین پر عدل و انصاف اور امن و انسانیت کے لحاظ سے سب سے شاندار اور مثالی دور عہد نبویؐ ہے۔ اس کی مثال سارا زمانہ فراہم نہیں کر سکتا۔ عدل و انصاف کا ایسا نظارہ چشم فلک نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ شہنشاہ کونین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات نے عملی اور قانونی طور پر مزدوروں کے معاملات اور مسائل حل کر دئے ہیں اور اس سلسلہ میں اسوۂ حسنہ اور اسوۂ صحابہؓ کے متعدد واقعات، احادیث اور تاریخ و سیر میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہد نبویؐ اور خلافت راشدہ میں آجر اور مستاجر کے لئے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ اور اگر آج بھی ہو جو براہیم

سا ایماں پیدا، آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا۔

ہماری علمی و تصنیفی تاریخ میں مختلف موضوعات پر ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئیں اور تاریخ وسیر، تذکرہ وسوانح، علوم وفنون بلکہ زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ ہو جس پر تصنیفات کا انبار نہ ہو۔ مگر افسوس کہ اس موضوع پر مستقل طور پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی حالانکہ یہ موضوع نہ صرف ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی کا بہت اہم پہلو ہے بلکہ اصلاً یہ سیرت نبوی کا ایک اہم حصہ ہے۔ پون صدی قبل حضرۃ الاستاذ مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے ایک کتاب ''اسلامی قانون محنت و اجرت'' لکھی تھی جو پاک و ہند سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس وقت کے حالات کے پس منظر میں لکھی گئی تھی اور استاذ محترم کو بھی جیسا کہ انہوں نے دیباچہ میں لکھا ہے تشنگی کا احساس بہرحال باقی رہا۔ شاید قدرت نے اس موضوع کا کما حقہ حق ادا کرنے کے لئے جناب تفسیر عباس صاحب کا انتخاب کر رکھا تھا۔

ہمارے فاضل دوست اور مایہ ناز مصنف اور سیرت نگار جناب تفسیر عباس صاحب نے سیرت نبویؐ کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں پر کئی بلند پایہ کتابیں سپرد قلم کی ہیں اور ان کے قلم سے سرمایہ سیرت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ درس گاہ صفہ کا نظام تعلیم و تربیت، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر و استقامت اور ''دوستی کا نبویؐ سلیقہ'' اردو زبان میں ایسی تصنیفات ہیں جن پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ ان کا مطالعہ وسیع و عمیق ہے۔ فکر ونظر میں وسعت ہے۔ دینی حمیت وغیرت سے ان کا دل معمور ہے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ عشق رسولؐ سے سرشار ہیں۔ میں اپنے فاضل دوست کو اس تازہ علمی کاوش کے لئے دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے وہ حق ادا کیا جو برسوں سے امت پر قرض تھا۔

زیر نظر کتاب ''سید انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی مزدور پالیسی'' دس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں محنت اور محنت کشی کا مفہوم، دائرہ کار اور اسلامی فلسفہ کی تفصیلات قرآن وحدیث کی روشنی میں پیش کی گئی ہیں۔ اسوۂ حسنہ کی روشنی میں اس کی اہمیت اور فضائل بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ کو خاص طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ایک باب میں عہد نبویؐ میں محنت کشوں کے عمومی پیشوں کا ذکر بھی بڑے سلیقہ اور متانت سے کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ

صحابہ کرامؓ کا ذکر خیر ہے جو ستاروں کے مانند ہیں، جن کی اتباع صلاح وفلاح کی ضامن ہے۔عہد نبویؐ میں بہبودی مزدور کے لئے جو عملی اقدامات ہوئے فاضل مصنف نے اس کی بھی تفصیل پیش کی ہے۔اس میں مکی اور مدنی دونوں ادوار کا ذکر ہے۔حصول رزق کے آداب اور اس میں برکت کے اسباب کا بھی ذکر ہے۔غرض محنت و مزدوری کے سلسلہ کا شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر پہلو ہو جسے مصنف نے نہ پیش کیا ہو اور خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ تمام تفصیلات انہوں نے قرآن وحدیث اور مستند مآخذ سے پیش کی ہیں۔ان کا انداز تحریر وتصنیف بھی سلیس، شستہ اور شگفتہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر اولیت وانفرادیت کا درجہ حاصل کر گئی ہے اور واقعی اس کتاب سے مزدوروں کے سلسلہ میں اسلام کی جو پالیسی ہے وہ ارتقائی شکل میں سامنے آجاتی ہے اور محنت کشوں کے سماجی تحفظ کے زریں اصول وہدایات بھی واضح ہو جاتی ہیں۔

فاضل مصنف کے نتائج فکر پر اگر عملی اقدامات ہوں تو ہماری معاشی اور معاشرتی زندگی میں مساوات اور عدل وانصاف کا ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب کمیونزم کے حوالہ سے اسلام پر جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں ان کا بھی سد باب کر دے گی۔اللہ تعالیٰ فاضل مصنف کی اس کاوش کو شرف قبولیت بخشے اور اسے توشہ آخرت بنائے۔آمین

[۲۴]

سدرۃ المنتہیٰ

ابوالفیض عزم سہریاوی

سخنوران اعظم گڑھ کی ایک بڑی تعداد اعظم گڑھ کی خاک سے اٹھ کر ہندوستان کے دیگر شہروں میں آباد ہوئی اور ان شہروں کی شعری و ادبی فضا کا حصہ بنی اور اپنی جولانی طبع سے ان شہروں میں شاعری، سخنوری اور اپنی زمزمہ سنجیوں کی انفرادیت کا ایک نقش قائم کیا۔ ان شہروں میں دہلی، لکھنؤ اور لاہور و کراچی بھی شامل ہیں، جن کی دبستانی حیثیت کا سارا زمانہ معترف ہے۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دہلی و لکھنو کی دبستانی حیثیت کی تعیین اعظم گڑھ ہی کے ایک گوہر گراں مایہ ادیب شہیر اور نقاد مولانا عبدالسلام ندوی نے کی تھی۔

جناب ابوالفیض عزم سہریاوی صاحب کا شمار ایسے ہی منفرد اور ممتاز شعرا میں ہوتا ہے، جن کا وطن تو اعظم گڑھ ہے، مگر انہوں نے اپنی دنیا دہلی میں بسائی۔ وہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں موضع سہریا میں پیدا ہوئے۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ اسی گاؤں کے ممتاز عالم اور محقق و مصنف تھے، جن کی عظمت و شہرت دارالمصنفین کے ناظم، ماہنامہ معارف کے مدیر اور ایک ممتاز اہل قلم کی حیثیت سے پوری علمی و ادبی دنیا پر محیط ہے۔ ان کے بڑے بھائی مولانا قمرالدین قمر اعظمی ایک قادرالکلام اور جدید لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔ انہوں نے بھی ترک وطن کر کے کان پور میں سکونت اختیار کی اور اپنی زمزمہ سنجیوں سے کان پور کے ادبی افق کو تابناک کیا۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے۔

جناب عزم سہریاوی نے اسی موضع میں نشو ونما پائی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی تعلیم قصبہ نظام آباد میں حاصل کی۔ پھر دہلی کا رخ کیا اور بقیہ تعلیم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں مکمل کی۔

یہاں انہوں نے نفسیات سے ایم.اے. کیا۔ٹریننگ اسکول میں استاذ مقرر ہوئے اور پھر وہیں سے نیک نامی کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔ طالب علم اور استاذ دونوں حیثیتوں سے تقریباً ۴۰-۴۲ برس وہ جامعہ ملیہ سے وابستہ رہے۔ گویا جامعہ کی ایک تاریخ ان کے سینے میں پوشیدہ ہے۔ بالفاظ دیگر وہ جامعہ کی تاریخ کا ایک حصہ ہیں۔انہوں نے مجیب صاحب کا دور دیکھا ہےاور مشیر صاحب کے زمانہ میں ریٹائر ہوئے۔اس دوران جامعہ بڑے نشیب وفراز سے گذری،عزم صاحب اس نشیب وفراز کےایک گواہ اوراس کی ادبی روایتوں کےایک امین ہیں۔

عزم صاحب کی شاعری تقریباً ۴۰ر برسوں پر محیط ہے۔اس دوران انہوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔جس کے مظاہر''سحاب رحمت''،''طلوع سحر''اور''مشعل راہ'' کی شکل میں یکے بعد دیگرے سامنے آتے رہے۔

انہیں حمد ونعت سے بڑی مناسبت ہے۔چنانچہ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ حمد ونعت پر مشتمل ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ'' سحاب رحمت'' بھی حمد ونعت پر مشتمل تھا۔ اب یہ چوتھا مجموعہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' بھی حمد ونعت کا ایک حسین گلدستہ اورشہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کا نذرانہ ہے۔

عزم سہریاوی ایک راسخ العقیدہ مسلمان اورصوم وصلوٰۃ کے بڑے پابند ہیں۔ان کا مذہبی رویہ بھی بڑا صاف ستھرااور مصلحت آمیزیوں سے پاک ہے۔وہ مذہب کے دلدادہ اورمحبت کے خوگر ہیں۔انہیں جذبات نے ان میں حمد ونعت سے مسلسل شغف وانہماک پیدا کیااوروہ حب نبویؐ میں سرشار رہے۔ان کی حمدیہ شاعری میں اگر بے پناہ عجز ہےتو نعتیہ شاعری میں بے پناہ عقیدت و خلوص کی گرمی۔اوراسی اخلاص وعقیدت کی بدولت شاعرشہنشاہ کونینؐ کےحضورطرح طرح سے مدح سرا ہوا ہےاور سدرۃ المنتہیٰ کے اسلوب وانداز میں طرفگی اورجاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ نئے نئےعنوانات اور نئے نئے اسالیب میں عقیدت کیشی کے جذبات نمایاں ہوئے ہیں۔شاعر کے یہی جذبات ہیں جس نے ایک بالیدہ روح کی شکل اختیار کرلی ہے جو قاری کے دل ودماغ اور ذوق ووجدان میں بھی عقیدت اورسرشاری کے جذبات پیدا کردیتی ہے۔

نعت گوئی ایک مشکل اور پرخطر شاہراہ ہے۔ذراسی بے احتیاطی اورلغزش حمد ونعت کے

ڈانڈے ملادیتی ہے۔لیکن ''سدرۃ المنتہیٰ'' کے شاعر نے ان حدود پر پوری نظر احتیاط رکھی ہے اور کہیں بھی اس باریک فرق پر آنچ نہیں آنے دی ہے۔اسے ہم عزم سہریاوی کے کمال نعت گوئی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

عزم صاحب کی نعت گوئی کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن سے سیرت نگاروں نے سیرت نبویؐ کے مرقعے تیار کئے ہیں۔''سدرۃ المنتہیٰ'' سے جناب عزم سہریاوی کی نہ صرف فنکارانہ بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس سے ان کے حب نبویؐ میں سرشاری بھی ظاہر ہوتی ہے۔یقین ہے عزم سہریاوی کا یہ مجموعہ حمد ونعت اپنے پاکیزہ جذبات اور نکھرے ہوئے شعری شعور کی بنا پر ہر دل عزیزی حاصل کرے گا۔

[۲۵]

مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی مدیر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد ہونہار عالم ومصنف ،اہل قلم ہیں۔مشہور عالم ومصنف مولانا نجم الدین احیائیؒ مرحوم کے لائق صاحبزادے ہیں۔تصنیف و تالیف کا ذوق انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ وہ اپنے ورثے کی حفاظت کا ہنر جانتے ہیں۔ لائق باپ کے سپوت بیٹے اپنی شاہ راہ کی تعیین خود کرتے ہیں۔ ہلال اعظمی نے بھی نئی شاہ راہ کا مسافر بننا طے کیا ہے۔ان کے والد نے ایک سے ایک عمدہ تحقیقی اور مناظراتی کتابیں لکھیں ،لیکن وہ بہر حال ایک مناظر تھے اوران کی بیش تر کتابیں مناظراتی ہیں۔کم لوگوں کومعلوم ہوگا کہ علامہ شبلی بھی ابتداء میں ایک مناظر ہی تھے۔انہوں نے بھی اس موضوع پر کئی رسالے لکھے ہیں، چونکہ اردو میں اب تک مناظراتی ادب کا جائزہ نہیں لیا گیا اور مناظرین کی خدمات بالخصوص ادبی خدمات کی طرف توجہ نہیں دی گئی،اس لئے اس سلسلہ کی کوششیں اور ادبی کاوشیں اوران کی اہمیت واضح نہ ہوسکیں۔ حالانکہ مکتوباتی اور ملفوظاتی ادب کی طرح مناظراتی ادب بھی کم اہمیت کا حامل نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے آریوں اورعیسائیوں سے ایک عرصہ تک مناظرے ہوئے۔ایک دوسرے کے خلاف رسالے اور کتابیں لکھی گئیں۔خود مسلمانوں کے مختلف مذہبی فرقوں میں بڑے معرکہ کے مناظرے ہوئے اور سیکڑوں کتابیں اپنے اپنے موقف کی تائید وحمایت میں لکھی گئیں۔اردو میں اس طرح کا ایک بڑا ذخیرہ ہے اگر اس کوموضوع تحقیق بنایا جائے تو اردو ادب کا ایک نیا منظر نامہ سامنے آسکتا ہے۔

ضلع اعظم گڑھ کی تہذیبی ،تمدنی اورادبی وفکری جہات کے تنوع کا یہ ایک اہم اور قابل غور

پہلو ہے کہ یہاں مسلمانوں کے تقریباً تمام فرق اسلامی کے اہل علم وقلم، ان کی بستیاں اور ان کے مدارس ومراکز قائم ہیں۔ مناظراتی ادب کے جائزے کے بعد ہی ڈاکٹر ہلال اعظمی کے والد مولانا نجم الدین احیائیؒ اور ان کی خدمات کی اصل اہمیت اجاگر ہوگی۔ البتہ مولانا ہلال اعظمی نے اپنے والد کی متعین کردہ اس راہ سے انحراف کیا ہے۔ شاید انہیں احساس ہے کہ دلوں کو توڑنے کے بجائے جوڑنا ایک مستحسن بات ہے۔ وہ نفرت کے بجائے محبت کے پیام بر ہیں۔ غالباً ان کے اسی مزاج اور افتادِ طبع نے انہیں شعر وادب اور تحقیق وتنقید سے رشتہ استوار کرنے میں معاونت کی ہے، جس میں ان کے لائق اساتذہ کا بھی بڑا حصہ ہے۔

ہلال اعظمی اعظم گڑھ میں تحصیل علم کے بعد از ہر ہند دارالعلوم دیوبند گئے۔ امتیاز کے ساتھ فضیلت کی۔ پھر گردش ایام نے انہیں حیدرآباد پہنچادیا۔ وہاں انہوں نے چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھی۔ بی اے، ایم اے اور ایم فل کی اسناد حاصل کیں۔ زیر نظر مقالہ دراصل حیدرآباد یونیورسٹی میں ایم فل کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس کی اہل نظر نے پذیرائی کی۔ خود ان کے استاذ ڈاکٹر مظفر شہ میری جو خود ایک بڑے اہل قلم اور صاحب نظر ادیب ونقاد ہیں، اس مقالے کی داد دی۔ اسی حوصلہ افزائی نے لائق مصنف کے دل میں اسے طبع کرانے کا عزم پیدا کیا اور یہ مقالہ شائع ہوکر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

علامہ شبلی کی ہشت پہل شخصیت کا ایک اہم اور قابل ذکر پہلو ان کی اردو شاعری بھی ہے۔ ابتدا میں وہ اسی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ وہ پختہ مشق اور قادرالکلام شاعر تھے۔ ان کی اردو نظموں کے کئی مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہوئے۔ بعد میں ان کا کلیات بھی شائع کیا گیا۔ اردو ادب کی تاریخ میں انہیں ادیب وانشاپرداز اور نقاد تو تسلیم کیا گیا، مگر شاعر کی حیثیت سے عرصہ تک ان کو جگہ نہیں دی گئی۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے اس کے خلاف احتجاج کیا کہ یہ ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ بعض اور اہل قلم نے بھی اس رویہ کے خلاف آواز بلند کی۔ چنانچہ خود ڈاکٹر سلام سندیلوی نے شبلی کی اردو کی شاعری پر ایک طویل اور مفصل مقالہ لکھا اور پھر شبلی کی شاعری پر بڑے گراں قدر مقالات لکھے گئے۔ حتیٰ کہ بعض مبسوط اور ضخیم کتابیں بھی لکھی گئیں۔ زیر نظر مقالہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کوشش بلکہ بڑی اہم کوشش ہے۔

ہلال اعظمی نے علامہ شبلی کے اردو کلیات کے حوالہ سے ان کی اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔علامہ شبلی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔سوائے غزلوں کے ان کے تمام نمونے ''کلیات شبلی۔اردو'' میں موجود ہیں۔فاضل مقالہ نگار نے قدرے تفصیل سے ان اصناف کے ضمن میں ان کی شاعری کا جائزہ لیا ہے۔اس مقالہ سے شبلی کی اردو شاعری کے تقریباً تمام پہلو یکجا نگاہوں میں آجاتے ہیں۔اس کی اشاعت سے یقیناً شبلیات کے ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہوگا اور اس سے علامہ شبلی کے شعری وادبی رویوں کی تفہیم میں بھی سہولت ہوگی۔فاضل مقالہ نگار اس تنقیدی خدمت کے لئے اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

---

[۲۶]

نیرسخن

خالدہ خاتون

محترمہ خالدہ بیگم خالدہ [پ:۱۴رجنوری ۱۹۶۴ء] اعظم گڑھ کے ایک مردم خیز موضع کوئریاپار میں پیدا ہوئیں۔اردو کے مایہ ناز ادیب ونقاداورشاعر جناب شمس الرحمٰن فاروقی اسی بستی کے گوہرشب چراغ ہیں جواس وقت اردو کی آبرو بنے ہوئے ہیں۔

خالدہ بیگم خالدہ کے والد جناب شعیب احمد مرحوم داروغہ اقبال احمد مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے۔جن کے داماداردو کے ایک صاحب طرز ادیب ونقاد جناب ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ العالی ہیں۔

شعیب احمد مرحوم ایک زمیندار اورتاجر تھے۔خالدہ بیگم ان کی اکلوتی بیٹی ہیں۔وہ ۶ر سال کی عمر میں شفقت پدری سے محروم ہوگئیں۔ان کی پرورش وپرداخت ان کے نانا مولوی محمد اسلم جلال پوری کے ذریعہ ہوئی۔محترمہ خالدہ گھریلو تعلیم سے آگے تعلیم حاصل نہ کرسکیں،لیکن قدرت نے انھیں موزوں طبع اورخوش الحان پیدا کیا تھا۔بچپن ہی میں شعروشاعری سے شغف پیدا ہوگیا جواب تک باقی ہے۔مترنم لب ولہجہ کی وجہ سے گھریلو ماحول میں بھی ان کی بڑی پذیرائی اور حوصلہ افزائی ہوئی۔چنانچہ وہ مسلسل شعر کہتی رہیں۔وقت کے ساتھ اس میں شعریت پیدا ہوگئی۔ ان کی غزلیں اگرچہ سادہ ہیں لیکن ان میں دلکشی اورجاذبیت ہے۔بعض بعض اشعار بڑے عمدہ نکل آئے ہیں۔خاص طور پر چھوٹی بحروں میں انھوں نے جوغزلیں کہی ہیں،ان میں بڑی پرکاری اور سحرانگیزی ہے۔دیہات کی سادہ اوردلکش فضاان کی غزلوں میں رچی بسی ہوئی ہے۔چونکہ شاعری میں ان کا کوئی استاذنہیں اورانھوں نے کسی سے شرف تلمذبھی حاصل نہیں کیااس لیے بعض اشعار

میں فنی خوبیاں پیدا نہیں ہوسکی ہیں، تاہم ان کے اشعار میں کج مج بیانی نہیں، سادگی اور شائستگی ہے۔ روایتی حسن وعشق کو انھوں نے سلیقے اور اپنے طریقے سے نبھایا ہے۔ بعض اشعار کی تازگی لطف ولذت سے ہم کنار کرتی ہے۔ ان کی شاعری میں ماضی قریب کے مسلمان گھرانوں کی تہذیب کی ایک جھلک بھی آ گئی ہے اور یہ جھلک کافی متاثر کن ہے۔ یقین ہے ان کا کلام نئی تہذیب کے شعور کا آئینہ ہوگا۔

[۴۷]

مقالات اشرف سلیمانی

مولانا محمد طفیل کوہاٹی

جانشین سلیمان مولانا پروفیسر محمد اشرف سلیمانیؒ [۱۹۲۵-۱۹۹۵ء] ایک جامع الصفات شخص تھے۔ صاحب زہد وورع وتقوی تھے۔ داعی اسلام تھے۔ ممتاز اہل قلم تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایسے اہل علم وعمل اور ہمہ جہت اشخاص میں تھے جو صفحہ گیتی پر مدتوں میں جنم لیتے ہیں۔

مولانا مرحوم کی ہشت پہل شخصیت اوران کے فکر وعمل کا دائرہ متنوع اور گوناگوں ہے۔ ان کے نقوش زندگی بھی انمٹ اور لازوال ہیں، جس میں پندونصائح، سبق آموزی اور بصائر و عبر کی گوناگوں صفات وکیفیات ثبت ہیں۔ جن سے ہم اپنی زندگی کو بنا اور سنوار سکتے ہیں۔ بڑی بات یہ بھی ہے کہ وہ جہاں رہے، جس حال میں رہے اور جس عہدہ پر رہے، ہر دور میں ان کا تعلق مع اللہ نہ صرف مضبوط و مستحکم رہا بلکہ وہ بہمہ وجوہ حرارت ایمانی سے سرشار رہے۔

وہ ایک ایسے طالب علم رہے جن کی علمی تشنگی کبھی سرد نہیں ہوئی۔ بچپن میں علم ومطالعہ کا جو چسکا لگا یا جو جذبہ پیدا ہوا وہ کبھی معدوم نہیں ہوا۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں وہ مدۃ العمر سرگرداں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے علم میں گہرائی و گیرائی تھی۔ اعلی ظرفی تھی۔ تفقہ فی الدین کی مثالی بصیرت تھی۔ انہوں نے علوم دینیہ میں مہارت کے ساتھ عصری علوم میں بھی دستگاہ حاصل کی تھی۔ عالم سے پروفیسر تک کا سفر جدوجہد اور محنت وحوصلہ سے عبارت تھا۔ اس طرح ان کی ذات میں قدیم وجدید دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل گئے تھے۔ گویا وہ مجمع البحرین تھے۔ یہی وہ خوبی ہے جو انہیں اوروں سے مختلف اور دبستان شبلی سے قریب تر کر دیتی ہے۔ حالانکہ وہ ہمیشہ علمائے دیوبند کے قریب رہے اور انہیں سے فیض حاصل کرتے رہے۔

مولانا اشرف سلیمانیؒ نے جس عہد میں آنکھیں وا کیں وہ عہد غلامی یعنی انگریزوں کے ظلم وجبر کا دور تھا۔ دور شباب تک پہنچتے پہنچتے انہیں حالات کی سنگینی کا اندازہ اور گہرا مشاہدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہ ابتدائی زندگی ہی میں ذوق جہاد سے سرشار ہوگئے اور اس جہاد میں شعوری طور پر حصہ لیا جو برصغیر کو بالآخر غاصب انگریز حکمرانوں سے نجات دلانے میں کامیاب رہا۔ اس زمانہ میں ان کا یہ جذبہ اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ایک موقع پر انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ جان کی بازی لگا دی، تاہم اللہ تعالی نے انہیں سرخرو کیا۔ اس دور جہاد میں انہوں نے بڑی جدوجہد کی۔ حتیٰ کہ ظلم و جبر کے خلاف گرینیڈ تک اپنے ہاتھوں سے پھینکے۔ ان کی یہ سرفروشانہ جدوجہد مسلمانوں کے بقاو تحفظ اور اسلام کی سربلندی کے لئے تھی اور اسی کے لئے انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی، مگر صد افسوس جن مقاصد کے پیش نظر انہوں نے یہ خدمات انجام دی تھیں، ان میں انہیں کامیابی نہیں ملی اور اسلامی حکومت کا خیال محض خواب وخیال ثابت ہوا۔ دراصل جن اشخاص اور تنظیموں نے یہ نعرہ بلند کیا تھا وہ غالباً اسلام کے تئیں مخلص نہیں تھے یا وہ اسلام کے نظام حکومت کے قائل نہیں تھے۔ دراصل مسلم لیگ کی تگ ودو اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کے نام پر تھی مگر ان کا نقطہ نظر درست نہیں تھا، جس کا لازمی نتیجہ وہی برآمد ہونا تھا جو ہندوستان کی تقسیم اور آگ وخون کی شکل میں برآمد ہوا اور جس نے برصغیر کے مسلمانوں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ بہر حال مسلم لیگ پاکستان میں اسلامی احکام کے نفاذ میں قاصر رہی۔ چنانچہ مولانا اشرف سلیمانی نے ان سے خود کو علاحدہ کر لیا اور اپنی قوت وتوانائی دوسری سمت تبلیغ واشاعت اسلام میں لگا دی۔ جس میں وہ بڑی کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔ حالانکہ وہ مسلم لیگ کے صف اول کے لوگوں میں تھے۔ محمد علی جناح [قائد اعظم] کی پہلی سندھ آمد پر استقبالیہ انہیں نے پیش کیا۔

مولانا محمد اشرف ایک بڑے داعی تھے۔ عرصہ حیات تک وہ تبلیغی جماعت کے ذمہ دار رہے۔ انہیں یہ ذمہ داری ان کی بلند پایہ داعیانہ حیثیت اور ان کے زہد وورع کی بنا پر تفویض کی گئی تھی اور اسے انہوں نے بخوبی نبھایا۔ یہاں بھی ان کی ذات وصفات سے ملت کو گراں قدر اور وقیع فائدہ پہنچا۔ بے شمار افراد ان سے مستفید ہوئے اور اپنی زندگیاں سنواریں۔

وہ اگرچہ علم وعمل کے بلند مقام پر فائز تھے، تاہم ان میں وضع داری اور خاکساری کے

جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہل علم بالخصوص علماء کے درمیان رہنا پسند کرتے تھے۔ متعدد اہل علم اور ارباب کمال سے ان کے گہرے مراسم رہے۔ ان میں مولانا محمد یوسفؒ، مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا عبدالباری ندوی فلسفیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تو وہ دست گرفتہ ہی تھے۔ ان کے رابطے میں آئے تو پھر انہی کے ہوکر رہ گئے۔ تصوف وسلوک اور شاہراہ معرفت کے بلند درجات انہیں کے فیض سے حاصل کئے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں مولانا سید سلیمان ندویؒ سے ایسا والہانہ لگاؤ اور ایسی عقیدت تھی کہ اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ ان کی نسبت سلیمانی اسی عقیدت کا مظہر ہے۔ اپنے گھر کو سلیمان اکیڈمی کا نام دینا بھی اسی نسبت وتعلق کا حصہ ہے۔

ان کی کتاب ''سلوک سلیمانی یا شاہراہ معرفت'' سے جو تین حصوں میں شائع ہوئی ہے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کے تصوف وسلوک کے وہ نہ صرف سب سے بڑے متبع تھے بلکہ اس کے سب سے بڑے رمز آشنا اور واقف کار بھی تھے۔ ان سے انہیں ایسی عقیدت تھی کہ ان کے سامنے سارے جلوے ہیچ معلوم ہوتے تھے۔ وہ دو مرتبہ اپنے شیخ کی علمی یادگار دارالمصنّفین دیکھنے اعظم گڑھ آئے اور اس حال میں آئے کہ کہیں اور جانہیں سکتے تھے۔ پاؤں سے بالکل معذور بلکہ آدھا بدن مفلوج، باوجود اس کے انہوں دارالمصنّفین کا کونہ کونہ اسی عقیدت و احترام سے دیکھا جس احترام سے وہ حضرت سید صاحب کی زیارت کیا کرتے تھے۔ حضرت سید صاحب کے بارے میں ان کے کیا خیالات تھے، وہ سلوک سلیمانی کے مقدمہ سے واضح ہے۔ پورا مقدمہ والہانہ جذبات سے عبارت ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> محقق شہیر، فاضل کبیر، متکلم عصر، شیخ وقت، حضرت سید الملة علامہ سید سلیمان ندوی قدس سرہ ان نادرہ روزگار ہستیوں میں سے تھے جو قرنوں میں پیدا ہوتی ہیں اور ان کی آمد عالم کے لئے بہار تازہ کا پیغام لاتی ہے:
>
> سالہا درکعبہ وبت خانہ می نالد حیات
> تا بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

ان کا وجود اپنے گونا گوں فضائل وکمالات ، جامعیت وبرکات،علوم ومعارف ، خدمات دینی وملی کی بناپر اللہ تعالی کی نشانیوں میں سے ایک مستقل نشانی اورحضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجاز خاص تھا۔آپ کی جلالت شان،عظمت دینی،فضیلت علمی،نزہت اخلاقی ،رفعت عرفانی اورخدمت ملی سے کون ناواقف ہے۔عصر حاضر میں جامعیت علوم میں اپنی مثال آپ تھے۔

علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد،صرف خالص دینی علوم قرآن وتفسیر، حدیث وفقہ،تصوف وکلام اورسیرت میں امامت وسیادت کا مقام رکھتا تھا بلکہ اس کی ہمہ گیری قدیم معقولات کے دفتر اورجدید معاشرتی ونظری علوم کے معتد بہ حصہ کواپنے پہلو میں سمیٹے ہوئے تھی۔وہ تاریخ اسلامی وعلوم ملی کے دقیقہ رس، باریک بیں،رمزآشنااوروسیع النظر مورخ تھے۔علوم وفنون اسلامیہ کے گوشے گوشے پران کی گہری نگاہ تھی اوران کے ارتقائی منازل وتاریخی مدارج پرعمیق نظرتھی۔مختلف ادیان وملل کی تاریخ پران کی محرمانہ نگاہ تھی۔اسلامی تاریخ پر وہ حجت تھے۔قرآنی علوم پران کا مطالعہ انتہائی وسیع ، گہرا،متنوع اوراچھوتا تھا۔وہ ایک ناقدمفسراورمتبحرمحدث تھے۔'' (سلوک سلیمانی حصہ اول ص۴۹-۵۰)

سلوک سلیمانی یاشاہراہ معرفت حصہ اول کا پورادیباچہ خاص طور پرلائق مطالعہ ہے۔اس میں انہوں نے سیدصاحب کی جامعیت کے ایک ایک پہلو کی وضاحت کی ہے اورحق تو یہ ہے کہ عقیدت وسرشاری کاحق ادا کردیا ہے۔

پروفیسرمحمد اشرف سلیمانی مرحوم ایک بڑے اہل قلم،مصنف اورمقالہ نگاربھی تھے۔انہوں نے اردواورانگریزی دونوں زبانوں میں متعدد مضامین اورکتابیں لکھی ہیں۔ان کی پہلی تصنیف (Early Indo Arab relation) دراصل ایم اے عربی کے لئے لکھا گیا مقالہ ہے۔ان کی ایک اہم قلمی کاوش شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ کی تبلیغی نصاب کا فارسی ترجمہ بھی ہے۔یہ پوراترجمہ انہوں نے باوضوکیا۔مولانا انورشاہ کشمیریؒ اورمولانا یوسف بنوریؒ کے عربی قصائد کی شرح بھی انہوں نے کی ہے۔چہل حدیث کا ایک مجموعہ بھی انہوں نے طلبہ کے لئے تیارکیا تھا۔

ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر پچاسوں علمی، دینی اور تحقیقی مقالات سپرد قلم کئے ہیں جو ملک کے موقر رسائل وجرائد کی زینت بنے۔ بعض طویل مقالے کتابچے کی صورت میں شائع ہوئے، جنہیں بے حد پسند کیا گیا اور بلاشبہ ان کے مشمولات بہت وقیع ہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض مقالات کی افادیت میں ابتک کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ان کے مقالات کی عصری معنویت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ضرورت سلیقہ سے پیش کرنے کی ہے۔

پروفیسر محمد اشرف سلیمانیؒ کا اسلوب نگارش بڑا شاندار ہے۔ انتہائی صاف وشفاف زبان ہے، جس میں سلاست وروانی، برجستگی اور لطافت وشیرینی کے متنوع عناصر جمع ہو گئے ہیں۔ اس اسلوب بیان کی وجہ سے ان کی تحریروں کی افادیت میں بڑا اضافہ ہوا اور ان سے بے شمار افراد نے استفادہ کیا۔ ضرورت تھی کہ رسائل میں منتشر ان تحریروں کو یکجا شائع کیا جائے، تا کہ ان سے عام استفادہ کی صورت پیدا ہو جائے۔ اس اہمیت کے پیش نظر عالی جناب مولانا طفیل احمد کوہاٹی مدظلہ نے بڑی محنت وتحقیق سے ان مقالات کو چار جلدوں میں مرتب کیا ہے۔

مولانا اشرف سلیمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات کے موضوعات میں بہت تنوع ہے۔ اس میں اسلامی قوانین کا بھی ذکر ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاشی نظام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تہذیب حاضر کا بھی ذکر ہے اور قومی تعمیر کے طریقہ کار کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ ایک طرف اسلامی نظام تعلیم کا ذکر ہے تو دوسری طرف رومی کے پیغام کی بھی تشریح ہے۔ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف پہلوؤں کا بیان بھی ہے۔ اور اسوہ نبوی کو نہ صرف قابل عمل اور قابل تقلید نمونہ قرار دیا گیا ہے بلکہ انسانیت کے فلاح و بہبود اور کامرانی کے اصولوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ملک وملت کی متعدد ممتاز شخصیات اور سلف صالحین کے اقوال اور احوال وآثار جن سے زندگیاں سنواری جاسکتی ہیں بیان کئے گئے ہیں۔ بعض اسلام مخالف فرق اسلامی مثلاً قادیانیت اور بعض دوسرے عناصر مثلاً کمیونزم وغیرہ کی بیخ کنی بھی ان کے مقالات کا ایک موضوع ہے۔ غرض علم وعمل اور اخلاق وشریعت کے متعدد عنوانات پر مولانا اشرف سلیمانی نے قلم اٹھایا ہے۔ ان مقالات کی طبع واشاعت سے اب بھی یہ فوائد حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

مقالات ومضامین کی جمع وتدوین کے اس اہم، مفید اور وقیع کام کے لئے جناب مولانا

محمد طفیل کوہاٹی صاحب لائق ستائش اور قابل مبارک باد ہیں۔امید ہے اشاعت کا یہ سلسلہ ان شاء اللہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔اہل علم اور ارباب ذوق بالخصوص تصوف وسلوک کے دلدادگان کے لئے پروفیسر اشرف سلیمانی کے مقالات کی اشاعت کسی بڑی بشارت سے کم نہیں۔یقین ہے اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

دبستان شبلی کے گل سرسبد علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اس روشن چراغ کی ضیائے وجیہہ کو روشن رکھنا اور اس سے استفادہ کی عام صورت پیدا کرنا صدقہ جاریہ سے کم نہیں۔ میں جناب مولانا محمد طفل کوہاٹی صاحب مدظلہ کی استقامت اور سعی وکوشش کی مقبولیت کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔جزاک اللہ

[۴۸]

تاریخ اعظم گڑھ

حاجی افضال اللہ قادریؒ

اعظم گڑھ قدیم عہد سے علم وفن، شعر وادب اور دین و دانش کا گہوارہ رہا ہے۔ اس کی خاک سے بے شمار اہل علم اور ارباب کمال اٹھے اور اپنی علمی کاوشوں سے اس خطہ اعظم گڑھ کو رشک یونان وشیراز بنا دیا۔ گو شہر اعظم گڑھ کا قیام ۱۷۶۵ء میں راجہ اعظم خاں کے ہاتھوں اس وقت عمل میں آیا جب انہوں نے دریائے ٹونس کے کنارے اسے آباد کیا اور ضلع کی حیثیت تو اسے اور بعد میں ۱۸۳۲ء میں انگریزی عہد میں ملی، لیکن یہ خطہ اعظم گڑھ اور اس کے مردم خیز قصبات و مواضعات کی خاک اس سے بہت پہلے شیراز ہند جون پور کے عہد شباب میں لعل و گہر اگل رہی تھی۔ اس کے متعدد نامور فرزند شاہان شرقیہ کے علمی دست و بازو رہے۔ مغلوں کے دور حکومت میں بھی اس خطے کے علماء نے جوہر قابل ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ فتاوی عالم گیری کی تدوین میں اس خطے کے فقہائے عظام نے اپنی فقہی بصیرت کی جولانی دکھائی، لیکن یہ وہ علماء وفضلا اور ارباب کمال تھے جنہوں نے حکومت سے ربط وتعلق اور اس کی سرپرستی گوارا کی۔ ان کے علاوہ علماء کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو ان ظاہری مراتب کو درخور اعتنا نہ کر کے محض ذکر الٰہی، تزکیہ نفس اور بندگان خدا کی اصلاح وتربیت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا، اس خطہ اعظم گڑھ نے ایسے بے شمار اہل اللہ پیدا کئے جن کی خدمات اور جن کی کاوشیں اب تک مشعل راہ ہیں۔

جدید علوم کے ایجاد واختراع اور اس کی خدمات بھی اس خطہ کے حوصلہ مند علماء وفضلا اور دانشوروں کے حصے میں آئی، جن کا متعدد ارباب کمال نے اعتراف کیا۔

تصنیف وتالیف، تحقیق وتدقیق، درس وتدریس، سیاست، معاشرت، معیشت، غرض

علوم وفنون کے مختلف شعبوں میں ضلع کے مردم خیز قصبات ومواضعات سے ایسے اشخاص اٹھے جن کی تابانی سے آسمان علم وفن اب تک منور ہے۔

تصنیف وتالیف کے میدان میں جن مصنّفین اور اہل قلم نے داد تحقیق وتصنیف دی ہے اگر ان کا اوران کی تصنیفات کا شمار کیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ اسی طرح درس وتدریس میں ضلع اعظم گڑھ کے معلمین واساتذہ نے ہندوبیرونِ ہند جو خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر کیا جائے تو ضخیم مجلدات بھی کم پڑیں گی۔ شعراء کے دواوین اوران کی شعری تخلیقات کو جمع کرنا بلکہ محض ان کا تذکرہ لکھنا بھی کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ سیرت وسوانح، تعلیم وتدریس، شعروادب، تاریخ وتہذیب، حتیٰ کہ جدید علوم کے بھی متعدد باکمالوں نے مختلف زبانوں اور مختلف میدانوں میں جولانی طبع دکھلائی ہے اور جس کی بدولت متعدد ارباب کمال نے شہرت وناموری حاصل کی اور اپنا ایک علاحدہ منفرد مقام بنایا۔

ایک عرصہ سے اس خطے کے حوصلہ مند علماء وفضلاء نے مدارس ومکاتب کے قیام کی طرف توجہ دی۔ چنانچہ آج سیکڑوں مدارس ومکاتب قائم ہیں۔ ان کی دینی وتعلیمی خدمات اب ہماری تہذیبی وتمدنی تاریخ کا حصہ ہیں۔ دینی علوم کے مراکز کے علاوہ جدید علم ودانش کے کئی مراکز بھی گذشتہ صدی میں قائم ہوئے ان کی تاریخ اور خدمات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ علم وتعلیم کے علاوہ اس علاقہ کو قدیم عہد سے تہذیب وتمدن کے مراکز میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ ہندوتہذیب کے قدیم نقوش بھی اس علاقے میں ثبت ہیں۔ سلاطین کے عہد میں، مغلوں کے زمانہ میں اور اس کے بعد بھی یہ خطہ اعظم گڑھ اور اس کے قدیم قصبات ومواضعات تہذیبی وتمدنی لحاظ سے اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ غرض اس کی ایک طویل تاریخ ہے۔

یہاں اس افسوس کا اظہار ضروری ہے کہ اعظم گڑھ اور اس کے مردم خیز مواضعات کی تاریخ کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی اور مستقل طور پر اعظم گڑھ کی تاریخ لکھی ہی نہیں گئی۔ البتہ بعض اہلِ قلم نے اس کے بعض مواضعات کی مختصر تاریخ ضرور سپرد قلم کی ہے۔ علماء وفضلا کے چند تذکرے بھی لکھے گئے۔ اعظم گڑھ سے متعلق اب تک جو کاوشیں منظر عام پر آئی ہیں۔ ان کا یہاں اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ تذکرہ علمائے اعظم گڑھ: مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند نے اس کتاب میں علمائے اعظم گڑھ کے دستیاب حالات وسوانح اوران کی علمی و دینی اور تصنیفی خدمات کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے اور جہاں تک ممکن تھا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مآخذ سے علماء کی ایک ایک کاوش کی تفصیل سپرد قلم کردی ہے۔ اپنے موضوع پر یہ ایک عمدہ تصنیف ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اعظم گڑھ کس قدر باکمالوں کا مرکز تھااور یہاں کیسے کیسے علماء، فضلاء،اوراطباء پیدا ہوئے۔اس کتاب میں ضلع اعظم گڑھ کی مبسوط تاریخ کے متعدد نقوش موجود ہیں اوراس سے استفادہ کئے بغیر اعظم گڑھ کی مکمل تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔

۲۔ تذکرہ علمائے مبارک پور: مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری کی یہ بڑی اہم کاوش ہے۔اس میں ضلع اعظم گڑھ کے ایک قصبہ مبارک پور کی علمی وتہذیبی اور سیاسی تاریخ قلم بند کی گئی ہے اوراس قصبہ کی خاک سے اٹھنے والے نامور اہل علم اوراصحاب کمال کا تذکرہ نہایت تحقیق وتدقیق کے ساتھ قلم بند کیا گیا ہے۔

۳۔ مشاہیر کوپاگنج: علمائے مبارک پور کے انداز میں علمائے کوپاگنج کا یہ تذکرہ مولانا محمد عثمان معروفی نے قلم بند کیا ہے۔ یہ کوپاگنج اوراس کے اطراف کی تاریخ پر مشتمل ہے۔

۴۔ تاریخ بندول: علامہ شبلی کے وطن موضع بندول کی مکمل تاریخ ہے، جسے چودھری رضی احمد راوت نے قلم بند کیا ہے۔

۵۔ مشرقی اترپردیش میں روتارہ برادری کی تاریخ: یہ کتابچہ بھی چودھری رضی احمد راوت کے قلم سے ہے۔اس میں انھوں نے مشرقی اترپردیش کی ایک اہم مسلمان برادری روتارہ کی تاریخ بیان کی ہے۔ علامہ شبلی، علامہ حمیدالدین فراہی، مولانا عبدالسلام ندوی اور اقبال احمد خاں سہیل اسی برادری کے فرد تھے۔

۶۔ تاریخ جیراج پور: موضع بندول سے متصل موضع جیراج پور مولانا سلامت اللہ اور مولانا اسلم جیراج پوری کا وطن اور مردم خیز موضع ہے۔اس کتاب میں اسی موضع کی قدیم وجدید تاریخ جناب ضیاء الرحمٰن اعظمی [مرحوم] نے سپرد قلم کی ہے۔ جیراج پور کی خاک نے متعدد علماء، فضلاء، حکما اورارباب شعروادب کو جنم دیا۔ اختصار کے باوجوداس میں جیراج پور کی پوری تاریخ

آ گئی ہے۔

۷۔ اعظم گڑھ اتہاس کے پنوں میں: اس میں پورے ضلع اعظم گڑھ کی اجمالی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ اہل علم اور علماء کا ذکر تو نہیں ہے البتہ اس میں قدیم ہندو تہذیب کے نقوش کی بھرپور نشاندہی کی گئی ہے۔

۸۔ تذکرہ سخنوران مئو: مرحوم اثر انصاری نے اس کتاب میں مئو ناتھ بھنجن کے شعراء کے حالات وسوانح اور ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصبہ جسے جہاں آرا بیگم کی سرپرستی حاصل ہوئی، شعر وادب کا ایک اہم مرکز رہا ہے اور آج بھی اس کی مٹی بڑی مردم خیز ہے۔ محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی اسی کی خاک سیاہ سے اٹھے تھے۔

۹۔ دیار پورب میں علم اور علماء: مولانا قاضی اطہر مبارک پوری نے اس کتاب میں اس خطہ اعظم گڑھ کے ان ممتاز علماء، صوفیاء اور اہل علم کا تذکرہ لکھا ہے، جنہوں نے اپنی کاوشوں سے نہ صرف اس علاقے کو بلکہ پورے ہندوستان کو متاثر بلکہ منور کیا۔ اپنے موضوع پر یہ سب سے مستند کتاب تسلیم کی جاتی ہے۔

۱۰۔ سوتنترتا سنگرام میں اعظم گڑھ کا یوگ دان: دو حصوں پر مشتمل یہ کتاب مجاہد آزادی پھول بدن سنگھ کے قلم سے ہے۔ اس میں ان جیالوں کی قربانیوں کی تاریخ ہے، جنہوں نے آزادی ہند میں حصہ لیا اور وطن پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ اس موضوع پر اس سے عمدہ کتاب کسی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

۱۱۔ اعظم گڑھ کا سنچھپت اتہاس: یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اس میں اختصار سے اعظم گڑھ کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ اس کی ترتیب وتہذیب بہت عمدہ ہے۔ اس کو بنیاد بنا کر اعظم گڑھ کی مکمل تاریخ لکھی جا سکتی ہے۔ اسے جناب امر ناتھ تیواری نے قلم بند کیا ہے۔

۱۲۔ اعظم گڑھ گزیٹئر: اعظم گڑھ کے گزیٹئر میں اس خطۂ اعظم گڑھ کی تاریخ کے متعدد واقعات درج ہیں۔ ان سے استفادہ کئے بغیر اعظم گڑھ کی کوئی مکمل تاریخ لکھی ہی نہیں جا سکتی۔

۱۳۔ مشاہیر پورہ معروف: پورہ معروف اعظم گڑھ کے قصبات میں اس لحاظ ایک منفرد مقام ہے، جہاں سیکڑوں علماء وفضلا پیدا ہوئے۔ زیر نظر کتاب میں یہاں کے علماء وفضلا کے

حالات وسوانح قلم بند کئے گئے ہیں۔ یہ مولانا محمد عثمان قاسمی معروفی کے قلم سے ہے۔

مذکورہ کتابوں کے علاوہ متعدد وہ سوانح عمریاں ہیں جن میں اعظم گڑھ کے قصبات و مواضعات کے علماء وفضلاء، ادباء وشعراء اور نقادوں کے مفصل حالات قلم بند کئے گئے ہیں، جو تاریخ اعظم گڑھ کا ایک اہم مآخذ ہیں۔ان میں خاص طور سے ''حیات شبلی'' جو علامہ شبلی کی مفصل سوانح عمری ہے۔اس کا ایک باب جو اعظم گڑھ کے مردم خیز اور مشہور مواضعات کی تاریخ پر مشتمل ہے، خاص طور پر قابل ذکر ہے۔اس کے علاوہ ''حیات سلیمان'' از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی۔'' عبدالسلام ندوی شخصیت اور ادبی خدمات'' از ڈاکٹر شباب الدین۔مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری از مولانا عین الحق قاسمی۔محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی از ڈاکٹر محمد صہیب الہ آبادی۔علامہ حمید الدین فراہی حیات وافکار از ڈاکٹر عبیداللہ فراہی۔اثر انصاری حیات وخدمات از ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی۔اقبال سہیل حیات وخدمات از ڈاکٹر منور انجم۔خلیل الرحمٰن اعظمی از وجیہ القمر۔بزم شبلی کی آخری شمع امجد غزنوی از ڈاکٹر فخر عالم وغیرہ۔ان سوانح عمریوں میں کسی نہ کسی نوع سے اعظم گڑھ کا ذکر موجود ہے۔اس کے علاوہ ماہنامہ معارف کے شذرات بھی خاص طور پر ہماری تاریخ کا ایک اہم ماخذ ہیں۔جس میں مولانا سید سلیمان ندویؒ سے مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ تک تسلسل کے ساتھ اعظم گڑھ کی علمی وادبی سرگرمیوں کا ذکر کیا جاتا رہا ہے۔یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور اب یہ فریضہ پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب ادا کر رہے ہیں۔

تذکرہ علمائے ہند از رحمان علی اور اس طرح کے دیگر تذکرے جس میں اعظم گڑھ کے متعدد علماء وفضلا اور شعراء کے حالات وکمالات کا ذکر ہے، وہ بھی تاریخ اعظم گڑھ کا ایک مآخذ بن سکتے ہیں۔اسی سلسلے کی ایک اہم کاوش مرحوم حاجی شاہ افضال اللہ قادری چشتی کی زیرنظر کتاب ''تاریخ اعظم گڑھ'' بھی ہے۔

حاجی شاہ افضال اللہ قادری چشتی مرحوم شہر اعظم گڑھ کے محلّہ گروٹولہ کے رہنے والے تھے۔ ۶رفروری۱۹۰۱ء کو یہیں پیدا ہوئے۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد تعلیم نامکمل چھوڑ کر آزادی کی تحریک میں شامل ہوگئے اور اس قدر سرگرم ہوئے کہ اپنا سب کچھ اس کی نذر کر دیا، تحریک خلافت، ترک موالات، سول نافرمانی، ہندوستان چھوڑو تحریک وغیرہ کے تحت اعظم گڑھ

کے سیاسی عمائدین کے ساتھ شانہ بشانہ شریک رہے۔ گرفتار ہوئے، جیل گئے، پس دیوار زنداں زدوکوب کئے گئے، مگر یہ نشہ کم نہیں ہوا۔ ان کے والد محمد سلیم نے ملت پریس کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا۔ نشہ آزادی میں اس کی طرف بھی توجہ نہیں دی اور وہ برباد ہوگیا۔ ان کے پریس سے ان کے والد ایک اخبار ''سہیل'' نکالتے تھے۔ وہ بھی اسی نشہ کی نذر ہوگیا۔ ان کے صاحبزادگان اقبال احمد ادیبی، مشتاق احمد اور حاجی محمد اسلام نے اپنے طور پر اپنی زندگی کے مراحل طے کئے۔ ان کی اچھی تعلیم کی طرف بھی قادری صاحب خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ غرض آزادی کے وہ ایک ایسے مجاہد تھے جنہوں نے اپنے ملک پر اپنا سب کچھ قربان کردیا۔

۱۹۴۷ء تک وہ مسلسل سرگرم رہے اور آزادی کی تمام تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ دو بار گرفتار ہوئے۔ مقدمہ قائم ہوا اور سزا ہوئی۔ پہلا مقدمہ ۱۲/اگست ۱۹۳۰ء کو ایک پمفلٹ ''پولس تتھا فوجی بھائیوں کا کرتبیہ'' پولس لائن میں تقسیم کرنے کے سبب قائم ہوا۔ اس میں ان کے ساتھ ٹھاکر رام اگیاں سنگھ، اتراج شکل اور رام کمار برنوال بھی تھے۔ دفعہ ۴۴۷، آئی پی سی اور سکشن ۱۹۲۲/۳ء میں منی ترپاٹھی مجسٹریٹ اول نے تین ماہ قید سخت اور چار ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی۔ اس میں وہ ایک ماہ ۱۳/دن قید رہے اور پھر گاندھی ارون معاہدے کے تحت رہا ہوئے۔ ان کا قیدی نمبر ۱۴۱۳ تھا۔

۱۹۳۲ء میں دوبارہ مقدمہ قائم ہوا۔ انھوں نے اپنے ملت پریس سے لگان بند کرانے کے لئے پمفلٹ چھاپا اور تقسیم کرایا۔ اس پمفلٹ کا ایک بیکٹ بابو وشورام رائے املا بازار میں تقسیم کرتے ہوئے گرفتار ہوگئے اور پمفلٹ طبع کرنے کے جرم میں افضال اللہ صاحب کے خلاف سی، آئی، ڈی رادھا کرشن سنگھ نے مقدمہ قائم کیا جو خان بہادر عثمان علی خاں مجسٹریٹ اول اعظم گڑھ کی عدالت میں چلا۔ (مقدمہ نمبر ۳۵/۱۱-۱۹۳۳ء قیصر ہند مدعی بنام افضال اللہ ملزم) اس میں انھیں ۵۱ روپیہ کا جرمانہ اور عدم ادائیگی کی صورت میں چھ ماہ قید محض کی سزا ہوئی۔

ان سرگرمیوں اور مجاہدانہ کارروائیوں کی بنا پر ۱۹۳۷-۱۹۳۸ء میں شہر کانگریس کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے اور تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

آزادی سے پہلے تحریک خلافت اور کانگریس کے رہنما اعظم گڑھ کے حریت پسندوں کا

حوصلہ بڑھانے کے لئے جب جب اعظم گڑھ آئے افضال اللہ صاحب ان کے ساتھ رہے۔ اس سلسلے میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا حسین احمد مدنی کے پروگراموں میں وہ شریک ہوئے اوران سے ملاقاتیں کیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو ۱۹۲۹ء میں جب اعظم گڑھ آئے اور شبلی منزل میں قیام کیا۔ ان کے کھانے کا انتظام مولانا مسعود علی ندوی نے بڑے اہتمام سے کیا تھا۔ دسترخوان پر ضیافت کی نگرانی شاہ افضال اللہ مرحوم ہی کے ذمہ تھی۔ اسی طرح ۷رمئی ۱۹۳۸ء میں مئو کی سیاسی کانفرنس میں شرکت کے لئے پنڈت جی آئے تو ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں میں شاہ افضال اللہ مرحوم بھی تھے۔ اس زمانہ میں کسی حریت پسند رہنما کا استقبال آسان نہ تھا۔ انگریزی حکومت کڑی نظر رکھتی تھی اور فرضی مقدمات قائم کر کے سخت سزائیں دیتی تھی۔

۱۹۳۰ء میں جب کانگریس غیر قانونی جماعت قرار دی گئی تو اعظم گڑھ میں جن لوگوں نے اس کے خلاف سرگرمی دکھائی ان میں ایک شاہ افضال اللہ صاحب بھی تھے۔ ٹھاکر رام اگیاں سنگھ، بابوشیورام رائے، وشورام رائے،، پھول بدن سنگھ، اچھے برشاستری، سوامی سنتوشانند، اماشنکر مصر کے ساتھ ہیراپٹی کے ایک مندر میں چھپ کر کانگریس کی سرگرمیاں جاری رکھنے والوں میں شاہ افضال اللہ مرحوم بھی تھے۔ یہیں اسی مندر میں رفیع احمد قدوائی خفیہ طریقے سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے ملے تھے اور ڈھائی سو روپئے بھی فراہم کئے تھے اور بعد میں مزید رقم بھی بھیجی۔

اسی طرح ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی نے سابرمتی آشرم سے سول نافرمانی اور نمک قانون توڑنے کی تحریک چلائی تو اعظم گڑھ میں عبدالوحید خاں موضع خالص پور کی قیادت میں جن لوگوں نے ایلول باغ میں نمک بنا کر قانون شکنی کی تھی۔ اس میں بھی عبدالوحید خاں کے ساتھ شاہ افضال اللہ صاحب شریک رہے۔

غرض شاہ افضال اللہ صاحب ایک بڑے مجاہد آزادی تھے، مگر افسوس کہ آزادی کے بعد انھیں بڑی مشکل سے مجاہد آزادی کا سرٹیفکیٹ مل سکا۔ پنشن کے لئے انھوں نے بڑی کوششیں کیں مگر وہ آخر تک نہ مل سکی۔ نشۂ آزادی میں پہلے ہی وہ گھر بار اور کاروبار برباد کر چکے تھے۔ چنانچہ اخیر دور میں بڑے مصائب اور مشکلات کا سامنا کیا۔

آزادی کے بعد جب ان کے قویٰ کمزور وناتواں ہوگئے اور رزق کفاف بھی مشکل ہوگیا تو انہوں نے حکومت سے پنشن کے لئے درخواست کی۔ آزادی میں اپنے کردار کے ثبوت فراہم کئے۔مگر افسوس کہ وہ پنشن کی خواہش لئے اور تکالیف برداشت کرتے ہوئے ۱۹۹۱ء میں دنیا سے رخصت ہوگئے۔ آزادی کے لئے انہوں نے جو قربانیاں دیں، اس سے ملک وقوم کو یقیناً فائدہ ہوا، لیکن خود انہیں کچھ نہیں ملا۔ آخری دنوں میں جب انہوں نے محرری کا پیشہ اختیار کرلیا تھا، انہیں اعظم گڑھ کی تاریخ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ انہوں نے کمزور صحت اور طول عمر کے باوجود اس کام کو بڑی محنت اور لگن سے انجام دیا۔ کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ تاریخ اعظم گڑھ سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب ورسائل کا مطالعہ کیا۔ اعظم گڑھ شہر اور اس کے مواضعات کا دورہ کیا۔ تاریخی مقامات کا مشاہدہ کیا۔ اہل علم سے ملاقاتیں کیں اور جو سرمایہ انہیں ہاتھ آیا اسے بے کم وکاست تاریخ اعظم گڑھ کے نام سے مرتب کیا۔

حاجی صاحب مرحوم نے ۱۹۸۲ء میں یہ کام مکمل کرلیا تھا، مگر اس کے بعد اور بہت سی معلومات ہاتھ آئیں تو انہیں شامل کرکے ۱۹۸۴ء میں اشاعت کی غرض سے قدیم مسودہ میں حذف واضافہ کیا۔ مولوی محمد شعیب محشر صادقی صاحب نظام آباد سے تعارف وتبصرہ لکھوایا، مگر اس کی اشاعت کی کوئی صورت نہ بن سکی اور ایک سال سے زاید کا عرصہ گذر گیا اور اس دوران کتاب میں مزید اضافہ معلومات ہوگیا تو تیسری بار اس کو ہر طرح سے مکمل کیا، مگر اس کے بعد کہیں جاتے ہوئے گرے اور پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی اور پھر اسی معذوری میں ۱۹۹۱ء میں وہ اپنے مالک حقیقی کے حضور جا پہنچے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون .

شاہ افضال اللہ قادری مرحوم نے اگرچہ نشہ آزادی میں تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی تاہم ان کا ادبی مذاق بڑا پختہ تھا۔ معلوم نہیں وہ شعر کہتے تھے یا نہیں لیکن کم ازکم وہ اچھے شعر فہم ضرور تھے۔ نعت سے انھیں بڑی دلچسپی تھی۔ مختلف شعراء کے نعتیہ کلام پر مشتمل دو تین مختصر مجموعے خود انھوں نے شائع کئے۔ آخری دور میں ایک ضخیم مجموعہ نعت شائع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ معلوم نہیں وہ شائع ہوا یا نہیں۔ ایک مجموعہ ''گلزار رحمت'' حصہ دوم راقم کی نظر سے گذرا ہے۔ جس میں قدیم وجدید شعرا کی نعتیں جمع کی ہیں۔ ''گلزار رحمت'' کے پشت پر انھوں نے اپنی ایک اور کتاب ''تاریخ

الاصفیاء المعروف مشائخ کبار ضلع اعظم گڑھ'' کا اعلان شائع کیا ہے۔ اشتہار اس طرح ہے:

''یہ ضلع اعظم گڑھ کے تصوف وسلوک کے مشائخ کبار کا تذکرہ ہے۔ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، مجدیہ، آبادانیہ، حسینیہ، شطاریہ، قلندریہ، مداریہ، صابریہ، اشرفیہ، وغیرہ سلاسل سے جو بزرگان منسلک تھے، انھیں کا تذکرہ خاص طور سے قلم بند کیا گیا ہے۔ ضلع اعظم گڑھ میں کثرت سے بزرگان دین گذرے ہیں۔ لیکن کسی اہل قلم نے اب تک ان کے حالات، سوانح، تعلیمات، ملفوظات قلم بند کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔ اس میں حقیر فقیر نے بڑی کاوش وجانفشانی اور محنت سے ان بزرگان دین کا تذکرہ قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں حقیر کو کہاں تک کامیابی ہوئی، اس کا فیصلہ اہل نظر کر سکتے ہیں۔

اس اشتہار سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب شائع ہوگئی تھی مگر راقم کو دستیاب نہ ہوسکی۔

اپنی کتابوں کی اشاعت کے لئے انھوں نے ادارہ قادریہ قائم کیا تھا۔

وہ تصوف وسلوک کے بڑے دلدادہ تھے۔ قادری، چشتی، نقشبندی نسبتوں سے ان کے ذوق ومزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جدوجہد آزادی کے بعد ان کی زندگی کا سب سے اہم کام تاریخ اعظم گڑھ کی ترتیب وتصنیف ہے۔ یہ ان کے نام کو انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

تاریخ اعظم گڑھ کا مسودہ مصنف کے لائق فرزند حاجی اسلام صاحب مالک جبلی موبائل چوک اعظم گڑھ کی تحویل میں تھا۔ وہ اس کی اشاعت کے لئے فکر مند تھے۔ گذشتہ سال مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے حاجی اسلام صاحب سے ملاقات کی اور اس سے استفادہ کے لئے مسودہ ان سے لے آیا۔ انہوں نے مسودہ دیتے ہوئے کہا کہ کاش کوئی اسے شائع کرا دیتا تو میرے والد کی یہ یادگار ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوجاتی۔ چنانچہ راقم نے اپنی بے بضاعتی کے باوجود تہیہ کیا کہ یہ کتاب ضرور شائع ہوگی۔ اس کی اشاعت کے لئے راقم نے بڑی تگ ودو کی۔ اس دوران میرے ایک کرم فرما نے اس شرط پر کہ یہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ کی طرف سے شائع ہو تمام اخراجات اپنے ذمہ لے لئے۔ میں نے محترم حاجی اسلام صاحب کے گوش گذار کیا تو انہوں نے کہا کہ آپ جس طرح

چاہیں شائع کرا دیں۔ چنانچہ راقم نے مسودہ پر نظر ثانی کی اور بعض جزوی ترمیم و اضافہ کے علاوہ یہ مقدمہ لکھا اور اس کی فہرست جو اصل مسودہ میں نہیں تھی درج کر دی۔

اس میں اعظم گڑھ کی تاریخ کے اہم واقعات تسلسل کے ساتھ آ گئے ہیں۔ مرحوم مصنف نے ضلع اعظم گڑھ اور اس کی تمام تحصیلوں اور تمام اہم مقامات کی تاریخ قلم بند کر دی ہے۔ البتہ مشاہیر اعظم گڑھ کے محض نام پر اکتفا کیا ہے اور خاص خاص واقعات لکھے ہیں۔ ضلع کے اہم قصبات و مواضعات کا خود انہوں نے مشاہدہ کیا۔ طول و عرض کا جائزہ لیا اور وہاں کے بزرگوں سے حالات دریافت کئے۔ اس طرح کتب و رسائل کے علاوہ جدید معلومات و واقعات بھی اس میں آ گئے ہیں۔ ضلع میں سید سالار مسعود غازیؒ کے مجاہدین مختلف مقامات پر شہید ہوئے۔ ان کے اہم مقابر و مساجد خاص طور سے شہر کے مقابر و مساجد، گردوارے، دھرم شالے، تعلیمی ادارے، شاہراہ، کنویں، گھاٹ، تال، ندی نالے، وغیرہ ایک ایک چیز کی انہوں نے تفصیل قلم بند کی ہے۔ ہندی و اردو کے ادباء و شعراء کے اگرچہ محض نام پر اکتفا کیا ہے، تاہم اس سے آئندہ کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی۔ اردو ہندی کے اخبارات و رسائل، پریس کا بھی مرحوم مصنف نے ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ تاریخ اعظم گڑھ کے موضوع پر اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ کتاب زیادہ معلومات افزاء اور قابل قدر ہے۔

البتہ متعدد تاریخی واقعات کا ذکر اس کتاب میں نہیں آ سکا ہے۔ مثلاً اکبر کا نظام آباد آنا، قیام کرنا اور پھر سال گرہ پر جشن منعقد کرنا۔ اسی طرح ضلع میں ہمایوں کا آنا اور سگڑی کے قریب شیر شاہ سوری سے نبرد آزما ہونا وغیرہ۔ اسی طرح بعض مواضعات کا ذکر بھی تشنہ اور تفصیل طلب ہے۔ باوجود اس کے یہ ایک اہم کتاب ہے۔

یقین ہے اس کتاب کی اشاعت سے جہاں ایک بزرگ کی تحریر محفوظ ہو گی وہیں ہماری ضلعی تاریخ کی ایک بڑی کمی بھی پوری ہو گی۔ امید ہے اس سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

---

[۲۹]

تاریخ بندول

راوت محمد رضی چودھری

ضلع اعظم گڑھ کے قصبات و مواضعات میں بندول کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس کی خاک سے بے شمار اہل علم اور ارباب کمال اٹھے۔ جن کی ضیا پاشیوں سے یہ خطہ عرصہ تک منور رہا۔ یہی موضع یگانہ روزگار علامہ شبلی نعمانی علیہ الرحمہ [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کا مولد و منشا بھی ہے۔ بندول کی اہمیت ہی کے پیش نظر علامہ شبلی نے شاعرانہ تعلیٰ کی تھی کہ

فضل بندول گر تو نہ شناسی
آدمی نیستی تو نسناسی

واقعہ یہ ہے کہ موضع بندول ایک زمانہ میں حفاظ کرام کا بھی مرکز تھا۔ بعض علماء بھی پیدا ہوئے۔ پھر جدید تعلیم کا زمانہ آیا تو ضلع کا پہلا بیرسٹرایٹ لا محمد مہدی حسن [م: ۱۸۹۷ء] اسی کی خاک سے اٹھا۔ ان کے علاوہ متعدد جدید تعلیم یافتوں نے بڑے بڑے مناصب حاصل کئے اور ملک وملت میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہ سلسلہ کسی حد تک ابتک جاری ہے، تاہم اب پہلے جیسا ماحول نہیں رہا۔ تہذیبی انحطاط کے دور میں یہ موضع بھی انحطاط کا شکار ہے۔

اس موضع کا شاندار ماضی اس لائق تھا کہ اس کی مفصل تاریخ لکھی جاتی اور دکھلایا جاتا کہ اس کا ماضی کس قدر شاندار تھا اور کیسے کیسے اہل علم اور ارباب کمال اس کی خاک سے اٹھے اور ناموری حاصل کی۔

اسی ضرورت کے پیش نظر بندول ہی کہ ایک لائق فرزند چودھری رضی احمد راوت نے اس کی تاریخ کو اپنا موضوع بنایا اور بندول کی ایک مفصل تاریخ قلم بند کی۔ جس میں تاریخی پس منظر

کے ساتھ اس کے محل وقوع، رقبہ، آبادی، برادری وغیرہ ایک ایک چیز پر روشنی ڈالی۔ اس کی خاک سے جن ناموروں کو نسبت رہی ان کا اختصار سے تذکرہ کیا۔ ان کی زندگی کے اہم واقعات لکھے اور ایک مفصل شجرہ بھی تیار کیا۔ جس میں ان کے عہد تک کے افراد کا نام شامل ہے اور جس سے تاریخ بندول کے بعض گم شدہ اوراق سامنے آتے ہیں۔

چودھری رضی احمد راوت نے ''تاریخ بندول'' کے یکے بعد دیگرے تین ایڈیشن اضافات کے ساتھ شائع کئے۔ برادرم مآب عالم فلاحی نے ان تینوں کو سامنے رکھ کر ایک جدید ایڈیشن تیار کیا ہے جو اب پہلے سے زیادہ وقیع ہو گیا ہے۔ نوجوان مرتب کی یہ اگر چہ پہلی کوشش ہے تاہم جس سلیقہ مندی سے انہوں نے اسے مرتب کیا ہے، اس سے ان سے بڑی توقعات پیدا ہو گئی ہیں۔ امید ہے وہ آئندہ بھی علمی کاموں سے دلچسپی لیتے رہیں گے۔

چودھری رضی احمد راوت نے کئی اور کتابچے شائع کئے ہیں۔ انہیں بھی ایڈٹ کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ان کی طرف بھی توجہ دی جائے گی۔

موضع بندول کی تاریخ کے تعلق سے یہ کتاب ایک دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ امید ہے اس سے بھر پور دلچسپی لی جائے گی۔

---

[۳۰]

مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری

میں ادبی وتاریخی بصیرت

ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی

علامہ شبلی نعمانیؒ [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر اس وقت تک مکمل قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ اس میں حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا ذکر نہ ہو۔ان کا حیدرآباد سے بڑا گہرا رشتہ رہا ہے۔سرکار آصفیہ سے بھی اور وہاں کے اہل علم اور ارباب کمال سے بھی۔پہلی بار جب وہ سر سید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے ساتھ حیدرآباد پہنچے تو ان کی بڑی پذیرائی ہوئی۔متعدد مجالس میں انہوں نے تقریریں کیں اور قصائد پیش کئے۔نظام حیدرآباد نے ان کا وظیفہ مقرر کر کے گویا انہیں علمی کاموں کے لئے یکسو کر دیا۔ان کی کئی کتابیں سلسلہ آصفیہ میں شامل ہیں۔ان کی سب سے مشہور اور معرکۃ الآراء کتاب ''الفاروق'' بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے۔جس کے ابتک پچاس سے زاید ایڈیشن ملک و بیرون ملک سے شائع ہو چکے ہیں اور دس زبانوں میں اس کا ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے بعد علامہ شبلی نے پھر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا رخ کیا تھا اور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۴ء تک ناظم سررشتہ علوم وفنون کے عہدہ پر فائز رہے اور اس مرتبہ انہوں نے سلسلہ کلامیہ کا آغاز کیا اور الکلام،علم الکلام،الغزالی،سوانح مولانا روم جیسی بلند پایہ کتابیں قلم بند کیں۔وہ جب تک حیدرآباد میں رہے علمی وادبی محفلوں کی جان رہے۔ان کی تصنیفات میں متعدد قصائد وغزلیات حیدرآباد کی یادگار ہیں۔یہاں وہ ایک بڑے خطیب کی حیثیت سے بھی معروف رہے۔۱۹۰۵ء کے اوائل میں انہوں نے حیدرآباد کو خیرباد کہہ دیا،تاہم ان کا رشتہ آخر تک

حیدرآباد سے باقی رہا اور آصفی وظیفہ بھی دم واپسیں تک جاری رہا اور گاہے بگاہے وہ وہاں کا سفر بھی کرتے رہے۔ عماد الملک سید حسین بلگرامی اور ان کے برادر اصغر سید حسن بلگرامی، سید ہمایوں مرزا اور مولوی عزیز مرزا وغیرہ سے ان کے مراسم اخیر تک قائم رہے۔ ان کے تلامذہ میں مولانا ظفر علی خاں، مولوی مسعود علی محوی، مولوی عبدالحق اور بعض دیگر معاصرین کی وجہ سے برسوں حیدرآباد میں ان کا ذکر خیر رہا۔ آخری حکمراں میر عثمان علی خاں بھی ان سے واقف تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ ماہنامہ صبا حیدرآباد کے مدیر سلیمان اریب نے صبا کا گراں قدر ''شبلی نمبر'' شائع کیا۔ جس میں حیدرآباد کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریریں شامل ہیں۔ مشہور محقق ڈاکٹر محی الدین زور قادری نے بھی ان پر کئی تحریریں لکھیں۔ ۲۰۱۴ء میں شبلی صدی کے موقع پر آندھرا پردیش اردو اکیڈمی حیدرآباد کے مجلّہ ''قومی زبان'' نے شبلی نمبر شائع کر کے شبلی اور حیدرآباد کے تعلق کو تازہ کیا۔ جامعہ عثمانیہ کا نصاب اولاً علامہ شبلی ہی نے بنایا تھا۔ دارالعلوم حیدرآباد ابھی تک جامعہ عثمانیہ نہیں ہوا تھا، علامہ شبلی کے شاگرد اور ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی اس کے پرنسپل تھے۔

اگر جائزہ لیا جائے تو جامعہ عثمانیہ اور حیدرآباد کی دیگر یونیورسٹیوں میں علامہ شبلی پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ اگر یہ کہا جائے کہ علامہ شبلی کا حیدرآباد پر جو حق تھا وہ ادا نہیں ہوسکا تو بے جا نہ ہوگا۔ محض چند ہی مقالے ان کے فکر وفن پر لکھے گئے ہیں، ان میں ایک قابل ذکر مقالہ ''علامہ شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ'' ڈاکٹر محامد ہلال اعظمی کا ہے، جو شائع ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ زیر نظر مقالہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ جسے حافظ قاری نصیر الدین منشاوی صاحب نے لکھا ہے۔ ان کا عنوان ''مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی وتاریخی بصیرت'' ہے۔

مقالہ نگار نے سات ابواب پر مشتمل اس تحقیقی مقالے کو بڑی محنت، جانفشانی اور عرق ریزی سے تحریر کیا ہے۔ جس میں سوانح نگاری کے آغاز وارتقاء، سوانح شبلی، شبلی کی ادبی خدمات، حالی وشبلی کی تنقید کا تقابلی جائزہ، شبلی کی ادبی وتاریخی بصیرت، تصانیف شبلی کی تدوین وتلخیص جیسے عناوین پر اظہار خیال کیا ہے۔ حاصل مطالعہ میں اپنا حاصل پیش کیا ہے۔ اس مقالے کے ابواب اور مشمولات ہی سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ مقالہ نگار نے کس درجہ محنت کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مقالہ نگار حافظ قاری نصیر الدین منشاوی نے انصاف کرنے کی حتی الوسع کوشش کی

ہے اور علامہ شبلی کے ادب وانشاء کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض تجزیوں میں انفرادیت کے عناصر نمایاں ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ انہوں اپنی ساری توجہ موضوع پر رکھی ہے۔

پی ایچ ڈی کے مقالات میں طلبہ سے کمیاں رہ جاتی ہیں، اس میں بھی بعض راہ پا گئی ہیں۔ البتہ مقالہ نگار نے انہیں درست کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس حوصلہ مندی کے لئے مقالہ نگار حافظ قاری نصیرالدین منشاوی صاحب لائق مبارک باد ہیں۔ منشاوی صاحب ایک سنجیدہ اور باوقار شخص ہیں۔ جس طرح ان کی طبیعت میں شائستگی اور سلیقہ مندی ہے، اسی طرح ان کی تحریریں بھی شائستہ اور شستہ ہیں۔ انہوں نے کئی کتابیں لکھی ہیں۔ حج کے مسافر، نماز کا مسنون طریقہ، مصر میری نگاہوں میں، حیات منشاوی، سمندر کی گود میں۔ سفرنامہ ترکی وغیرہ طبع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔ امید ہے اس مقالہ کی اشاعت سے ان کی کتابوں میں ایک قیمتی اضافہ ہوگا اور اسے علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہ بھی امید ہے کہ منشاوی صاحب حیدرآباد کی طرف سے علامہ شبلی کا حق ادا کرتے رہیں گے۔ مقالے کی تکمیل پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش نے اس مقالے کی اشاعت کے لئے مالی امداد منظور کی ہے۔ دعا ہے کہ قاری صاحب کا علم و قلم مزید ترقی کرے اور اللہ تعالی یہ سلسلہ دراز کرے۔

---

(۳۱)

نقش آرزو

جناب وارث ریاضی صاحب

محترم وارث ریاضی صاحب کی شخصیت اور شاعری محتاج تعارف نہیں۔ وہ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ ایک عرصہ سے دادسخن دے رہے ہیں۔ ان کا کلام موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا ہے۔ ماہنامہ معارف کے تو وہ خاص شاعر ہیں۔ بالفاظ دیگران کا تعلق دبستان شبلی کے شعروادب سے ہے۔

وارث صاحب کو ابتدائی دور شاعری میں ماہر القادری اور نشور واحدی سے شرف تلمذ حاصل ہوا اور دادسخن بھی ملی۔ یہ دونوں شعراء بھی شبلی اور دبستان شبلی کے مداح تھے۔ ایک زمانہ میں شورنشور سے معارف کے صفحات پرشور تھے اور آج وارث صاحب کی طبع آزمائی، نکتہ سنجی اور دادسخن سے معمور ہیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ علامہ اقبال اپنا کلام معارف میں اشاعت کے لئے بھیجتے تھے۔ گویا وارث صاحب اس سلسلہ زریں کی ایک کڑی ہیں اور بلاشبہ ان کا کلام اس لائق ہے کہ انہیں دبستان شبلی کا شاعر قرار دیا جائے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ آج معارف کے صفحات ادبیات کی آبروان کے دم سے قائم ہے۔

وارث حسن ریاضی صاحب نے مختلف اصناف سخن میں دادسخن دی ہے۔ غزلیں، نظمیں، قطعات اور یادرفتگاں وغیرہ ان کے کلام میں موجود ہیں۔ خاص طور پرغزلیں کہنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ وہ ایک فطری شاعر ہیں اور شعر کہنے کا خداداد سلیقہ ہے۔ ادب کا جو ذخیرہ حرف آرزو سے نقش آرزو تک ان کی بدولت وجود میں آیا ہے وہ محض قابل ذکر نہیں بلکہ وہ ایک ایسا ادبی تحفہ ہے جسے ہماری ادبی تاریخ میں ہمیشہ یادرکھا جائے گا اور اس کی حیثیت شعری ادب میں گراں قدر

اضافہ کی ہے۔

وارث صاحب ہماری گذشتہ شعری روایتوں پر نہ صرف گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کو کسی قدر برتا بھی ہے اور عہد حاضر کی شعری بے راہ روی کے دور میں وہ ایک منارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے صالح قدروں کی حفاظت کی ہے اور شعر و ادب کو نئی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''حرف آرزو'' عرصہ ہوا شائع ہو کر اہل ذوق کی تشنگی بجھا چکا ہے، جس کی ارباب ذوق نے زبردست پذیرائی کی۔ زیر نظر مجموعہ ''نقش آرزو'' ان کی تازہ کاوش ہے۔ اس میں غزلوں کی سوغات کے ساتھ متعدد منظومات بھی شامل ہیں۔ یاد رفتگاں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نقش آرزو ان کے دلی جذبات و خیالات کا ایک صاف شفاف آئینہ ہے اور اس آئینہ کو انہوں نے فکر و فن کے ذریعہ وہ شعور و بانکپن عطا کیا ہے کہ زمانہ اس میں اپنی تصویر دیکھ سکتا ہے اور ہم اپنی ادبی تشنگی بجھا سکتے ہیں۔

وارث صاحب کا مطالعہ بے حد وسیع و عمیق ہے۔ شعر و ادب کی روایتیں ان کے سامنے ہیں۔ قدیم صالح روایتوں کی اس دور میں شاید وہ اکیلی آواز ہیں۔ دراصل ان کے کلام کا جوہر ان کی گہری اور باریک بیں نظر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام قدیم روایتوں کے دل دادگان کے ذوق کی تسکین کا باعث تو ہے ہی جدید ذہن کی بھی آسودگی کا ایک ذریعہ ہے۔ نقش آرزو کے لئے میں انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

وارث ریاضی صاحب محض ایک شاعر نہیں ادیب و انشا پرداز بھی ہیں۔ شعر و ادب کا انہوں نے بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ اس کے نشیب و فراز سے بھی وہ واقف ہیں۔ ایک عالم کی حیثیت سے علم و فن کے حسن و قبح پر بھی ان کی نظر ہے۔ عرصہ دراز کی مشق و ممارست نے ان میں مہارت، پختگی، عبور اور ان کے کمال دست رس نے فکر و فن کو ایسی جولانی عطا کی ہے کہ ان کا کلام اپنے قاری پر ایک سحر طاری کر دیتا ہے، خود میں متعدد مقامات پر اس سحر سے بچ نہ سکا۔ یقین ہے ''نقش آرزو'' ہمارے ادبی ذخیرہ میں بھی ایک نقش قائم کرے گا۔

چشم بینا ہے اگر گلزار رنگ و بو میں دیکھ
صبح دم پھولوں کو شبنم سے وضو کرتے ہوئے

....

پھر دل میں ہو رہی ہے خلش دردِ عشق کی
پھر یاد آرہا ہے وہ عہد وفا مجھے

....

ان کی نگاہ مہر نے جینا سکھا دیا
ہر شے سے ہے عزیز خدا کی رضا مجھے

....

زندگی دی ہے خدا نے کس قدر بہتر مجھے
لطف آتا ہے مسلسل ٹھوکریں کھا کر مجھے

....

اگر آشنا بھی ملیں بے دلی سے
تو پھر موت اچھی ہے اس زندگی سے

مختلف بحور و اوزان اور مختلف افکار و خیالات کے ان چند اشعار سے وارث صاحب کی شاعری اور اس کی عظمت کی ایک جھلک سامنے آتی ہے۔ نقش آرزو اسی انداز کے خوب صورت اشعار کا ایک گلدستہ ہے۔

کتابیات

کتابیات

کتب

۱۔ اجتہاداورتبدیلی احکام،مولانا مجیب اللہ ندوی،تاج کمپنی دہلی،۲۰۰۲ء

۲۔ ادبی نقوش،شاہ معین الدین احمد ندوی،ادارہ فروغ اردو لکھنو،۱۹۶۰ء

۳۔ اسفارمجیب،ڈاکٹرمحمدالیاس الاعظمی،مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

۴۔ اسلام کے بین الاقوامی اصول وتصورات،مولانا مجیب اللہ ندوی،مرکزتحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور،۱۹۹۰ء

۵۔ اسلامی قانون اجرت،مولانا مجیب اللہ ندوی،تاج کمپنی دہلی،۱۹۹۰ء

۶۔ اعجازنامے،محمدعرفات اعجازاعظمی،مکتبہ ضیاءالکتب خیرآباد،۲۰۱۹ء

۷۔ افکارمجیب،مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ،۲۰۱۴ء

۸۔ انجمن ترقی اردو کی کہانی،مولوی غلام ربانی،انجمن ترقی اردو ہند دہلی،۱۹۳۹ء

۹۔ انجمن ترقی اردو ہند تاریخ اورخدمات،ڈاکٹریونس غازی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی،۲۰۰۹ء

۱۰۔ ایک فکری فساد،حکیم محمدایوب،بلریاگنج اعظم گڑھ

۱۱۔ باقیات شبلی،مشتاق حسین،آزادکتاب گھر دہلی،۱۹۶۴ء

۱۲۔ برمی بول چال،سیدابوظفرندوی،محبوب المطابع دہلی،۱۹۲۴ء

۱۳۔ تابش سہیل،افتخاراعظمی،مرکزادب لکھنو،۱۹۵۸ء

۱۴۔ تاریخ اعظم گڑھ، حاجی افضال اللہ قادری، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء

۱۵۔ تاریخ بندول، راوت محمد رضی چودھری، شبلی لائبریری بندول، ۲۰۱۵ء

۱۶۔ تبع تابعین حصہ اول، مولانا مجیب اللہ ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۸۶ء

۱۷۔ تذکرہ حکیم محمد ایوب، صباح الدین اعظمی، حکیم محمد ایوب ایجوکیشنل فاؤنڈیشن اعظم گڑھ طبع دوم ۲۰۱۷ء

۱۸۔ جنبش لب، ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی، البلاغ پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۱۷ء

۱۹۔ جو اکثر یاد آتے ہیں، ڈاکٹر محمد ارشد خاں، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۲۰۔ حقیقت ایمان، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی، ندوۃ التالیف والترجمہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۲۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۲۲۔ چند ارباب کمال، ضیاء الدین اصلاحی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء

۲۳۔ چھان بین، اثر لکھنوی، سرفراز قومی پریس لکھنو، ۱۹۵۰ء

۲۴۔ دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات، پروفیسر خورشید نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

۲۵۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۲ء

۲۶۔ دارالمصنّفین کی عربی خدمات، ڈاکٹر محمد عارف عمری، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۲۷۔ دوستی کا نبوی سلیقہ، تفسیر عباس، زاویہ پبلشرز لاہور، ۲۰۱۷ء

۲۸۔ دین وشریعت، مولانا عبدالمجید اصلاحی، دانش بک ڈپو ٹانڈہ

۲۹۔ روح سخن، ڈاکٹر احمد علی برقی، تخلیق کار پبلشرز دہلی، ۲۰۱۳ء

۳۰۔ رہبر کامل، مولانا عبدالمجید اصلاحی، دانش بک ڈپو ٹانڈہ، ۱۹۹۹ء

۳۱۔ ساحلوں کے شہر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادب کدہ انور گنج، اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء

۳۲۔ ساز رنگ وبو، ارشد اعظمی، رہبر فاؤنڈیشن خالص پور اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۳۳۔ سدرۃ المنتہی، ابوالفیض عزم سہریاوی، حمیدیہ پریس دہلی، ۲۰۱۴ء

۳۴۔ سرِ رشک اخلاص، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۳۴ء

۳۵۔ سرمایہ قلم، ڈاکٹر محمد عارف عمری، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۳۶۔ سفر نامہ برہما، سید ابوظفر ندوی، محبوب المطابع دہلی، ۱۹۲۱ء

۳۷۔ شہرِ سخن، ملک زادہ منظور احمد، ملک زادہ پبلی کیشنز اعظم گڑھ، ۱۹۶۱ء

۳۸۔ ظہورِ قدسی، مولانا عبدالجبار رہبر، رہبر فاؤنڈیشن خالص پور اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۳۹۔ عشرہ مبشرہ، مولانا عبدالمجید اصلاحی، دانش بک ڈپو ٹانڈہ

۴۰۔ عظمت کے نشاں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۰۵ء

۴۱۔ عکس واثر، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء

۴۲۔ فتاوی عالمگیری اور اس کے مولفین، مولانا مجیب اللہ ندوی، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لاہور

۴۳۔ فلسفہ تعلیم، خواجہ غلام الحسنین، انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۳۹ء

۴۴۔ کاروانِ رفتگاں، مولانا مجیب اللہ ندوی، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ، ۲۰۰۸ء

۴۵۔ کلیات رہبر، مولانا عبدالجبار رہبر، رہبر فاؤنڈیشن خالص پور اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۴۶۔ کلیات نشور واحدی حصہ غزلیات، نیاز واحدی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء

۴۷۔ محبت نامے، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

۴۸۔ متاعِ رفتگاں، شاہ معین الدین احمد ندوی، مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء

۴۹۔ محسن انسانیت کی مزدور پالیسی، تفسیر عباس، زاویہ پبلشرز لاہور، ۲۰۱۷ء

۵۰۔ مسئلہ کفائت، مولانا مجیب اللہ ندوی، دارالتالیف والترجمہ اعظم گڑھ، ۱۹۸۹ء

۵۱۔ مطالعات ومشاہدات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

۵۲۔ مقالاتِ احسان، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء

۵۳۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۵۴۔ مولانا شبلی کی اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ، محمد محامد ہلال اعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۴ء
۵۵۔ مولانا شبلی نعمانی کی سوانح نگاری میں ادبی و تاریخی بصیرت، ڈاکٹر محمد نصیر الدین منشاوی حیدرآباد، ۲۰۱۸ء
۵۶۔ میزان آگہی، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز مئو، ۲۰۱۱ء
۵۷۔ میں اور میری ادبی صلاحیت، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء
۵۸۔ نقوش زندگی، مولانا مجیب اللہ ندوی، مولانا مجیب اللہ ندوی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۵۹۔ نوائے مشتاق، مشتاق احمد مشتاق، مرتبہ سہیل اصلاحی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۶۰۔ یادرفتگاں، سید سلیمان ندوی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء
۶۱۔ یاد سہیل، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ
۶۲۔ یادوں کا چمن، ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

رسائل

۶۳۔ اخبار سائنٹی فک سوسائٹی، علی گڑھ، ۲۱ اگست ۱۸۷۴ء
۶۴۔ اردو ادب۔ علی گڑھ، شمارہ ۱، ۱۹۷۰ء
۶۵۔ تہذیب الاخلاق مشاہیر علی گڑھ حصہ چہارم
۶۶۔ کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، اکتوبر ۲۰۱۱ء
۶۷۔ معارف اعظم گڑھ، فروری ۱۹۸۸ء، فروری ۲۰۰۸ء،

شبلی خودنوشتوں میں

سوسال سے زیادہ کی مدت میں اردو کے چمن میں ہر طرف بکھرنے والی داستانوں میں ایک علامہ شبلی کی داستان بھی ہے جس کے لیے شبلیات کا ایک خانہ ہی خاص ہوگیا۔ اس تمام سرمایہ تک رسائی بھی بس خاص خاص ہی کو تھی، اس کو جمع کر کے عام کرنے کی ہمت اس کتاب کے مؤلف نے خدا جانے کس قبولیت کی ساعت میں کی کہ اب علامہ شبلی کا جہاں ذکر ہوتا ہے بات الیاس الاعظمی تک پہنچ ہی جاتی ہے، بلکہ اب تو عالم یہ ہے کہ ان ہی کو سب پکار اٹھیں، گزر جائیں جدھر ہو کر، الیاس صاحب کو یہ نعمت واقعی جلوہ ہائے شبلی کو جذب کرنے کی بدولت ملی، مطالعہ شبلی ان کی آنکھوں کا ایسا سرمہ ہے کہ جہان شبلی کا ہر گوشہ ان کے لیے روشن ہوگیا، زیر نظر کتاب اسی حقیقت کی شاہد ہے، قریب پندرہ بیس شبلیاتی کتابوں کے بعد ہل من مزید کی گویا گنجائش نہیں تھی لیکن اس کتاب نے بتایا کہ مقامات سیر گلستاں اور بھی ہیں، خودنوشتوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کی کمی نہیں، اشخاص واماکن کی بازیافت کا یہ سب سے بڑا ذریعہ ہیں، ساتھ ہی واقعات و انقلابات کا مقیاس الحرارت بھی ہیں، ایسے میں شبلی کا ذکر معاصرین و متعلقین ومتاثرین کی تحریروں میں امر ناگزیر کے مانند ہے، فاضل مؤلف نے نحل ونمل کی طرح شہد وشکر کو جمع کیا، قریب چوبیس آپ بیتیوں کی سیر کی اور زیر نظر کتاب کی شکل میں بجائے خود ایک دستۂ گل سجا دیا، تذکرہ نگاروں کی صرف تحریریں ہوتیں تو وہی دلچسپی کے لیے کافی تھیں مگر مؤلف نے تذکرہ نگاروں کا بھی جامع تذکرہ کر کے افادیت میں اضافہ کر دیا، دیباچہ حسب معمول تفصیل لیے ہوئے ہے جس میں لائق مرتب نے خود ہی اس کتاب کو شبلی شناسی کی ایک نئی جہت قرار دیا ہے، حق یہ ہے کہ دوسرے مشاہیر پر کام کرنے والوں کے لیے انہوں نے ایک نئی راہ دکھادی، یہ بھی صحیح ہے کہ ایسی تحریروں سے بعض پہلو جو عموماً مخفی رہتے ہیں مگر ہوتے اہم ہیں، سامنے آجاتے ہیں، کتاب کی وقعت و قیمت کے لیے شبلی کا انتساب ہی کافی ہے اور یہی بات خود مرتب کے لیے کہی جاسکتی ہے۔

حافظ عمیر الصدیق ندوی

ADABI DAIRA, AZAMGARH

email : azami408@gmail.com
Website : www.drmiazmi.webs.com
Mob.: 9838573645